معارف مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے
علمی، فقہی، تبلیغی اور اصلاحی مواعظ و مقالات اور نادر ملفوظات و ارشادات پر
مشتمل افادات کا حسین مجموعہ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کا نایاب و انمول خزانہ

افادات

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

مرتب

سید محمد اکبر شاہ بخاری

زمزم پبلشرز

مَعارفِ مُفتیِ اَعظم رحمۃ اللہ علیہ

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرتِ اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے
علمی، فقہی، تبلیغی اور اصلاحی مواعظ و مقالات اور نادر ملفوظات وارشادات پر مشتمل
افادات کا حسین مجموعہ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کا نایاب و انمول خزانہ

افادات

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

مُرتّب

سید محمد اکبر شاہ بخاری

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

کتاب کا نام ——— معارفِ مفتی اعظم رحمہ اللہ

تاریخ اشاعت ——— فروری ۲۰۰۹ء

باہتمام ——— احبابِ زمزم پبلشرز

سرورق ——— احبابِ زمزم پبلشرز

مطبع ——— احبابِ زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374 - 021-2725673

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- مکتبہ بیت العلم نیو ٹاؤن کراچی۔ فون: 4916690 2018342
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ سرکی روڈ
- مکتبہ علمیہ، علوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

- **Darul Uloom Zakaria**
  P.O. Box 10786, Lenasia
  1820 Gauteng
  South Africa
- **Azhar Academy Ltd.**
  54-68 Little Ilford Lane
  Manor Park London E12 5QA
  Phone: 020-8911-9797
- **ISLAMIC BOOK CENTRE**
  119-121 Halliwell Road, Bolton Bl1 3NE
  U.S.A
  Tel/Fax : 01204-389080

فہرست معارف مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

مرتب ذا العلماء
(از حضرت مولانا عبدالحق صاحب فاضل دیوبند)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

زیرِ نظر کتاب معارف افاداتِ مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ حضرتِ اقدس قبلہ، مفتیِ اعظم پاکستان الشیخ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے علمی، دینی، فقہی، تبلیغی و اصلاحی مضامین ومواعظ اور ملفوظات وارشادات کا نادر مجموعہ ہے جسے محترم ومکرم جناب سید قاری محمد اکبر شاہ بخاری نے مرتب کیا ہے۔ محترم موصوف نے حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہٗ کی کئی تصانیف مرتب کی ہیں جو نہایت مفید نافع اور حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کے علوم ومعارف کا خزانہ ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں بھی حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے نادر ونایاب مضامین اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض مواعظِ حسنہ اور ملفوظات کو یکجا کر دیا گیا ہے، یہ مضامین پہلی مرتبہ جمع وترتیب دیئے گئے ہیں، جو انشاء اللہ تعالیٰ نہایت مفید و معلومات افزاء قیمتی مضامین کا مجموعہ ثابت ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہٗ اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر مرتب وناشر کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے اور اسکی جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔

محمد عبدالحق عفی عنہ
۱۵ ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ

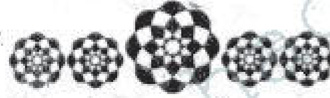
بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مدظلہ العالی
مہتمم دار العلوم کبیر والا خانیوال

مفتیِ اعظم پاکستان حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، آپ کی دینی، علمی، فقہی، تدریسی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی و عملی خدماتِ جمیلہ سے پوری دنیا متعارف اور زمانہ آشنا ہے، قحط الرجال کے اس زمانہ میں ایسے عظیم المرتبت جلیل القدر علماء و صلحاء اور اولیاء کے حالات و خدمات کو روشناس کرانا ایک عظیم خدمت ہے، ہمارے محترم جناب سید محمد اکبر شاہ صاحب بخاری زید مجدہم نے اکابرین دیوبند کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے مواعظ و خطبات، مقالات و مضامین اور ملفوظات و ارشادات کی اشاعت کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے، زیرِ نظر کتاب ''معارفِ مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ'' میں بھی اُنہوں نے حضرتِ اقدس قبلہ مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے چند اہم خطبات و مقالات اور ملفوظات و ارشادات کو یکجا جمع کیا ہے جن کے پڑھنے سے قلب میں نورانیت اور عملِ صالح کا جذبہ زندہ ہوتا ہے، درحقیقت بزرگوں اور اکابر کے علوم و معارف، مواعظ حسنہ، اور مقالات و مضامین ان کی محبت کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اس حوادثِ زمانہ نے ایمانی چنگاری کو زائل کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے اس لئے اکابر کے یہ مواعظ و خطبات اور مقالات و ملفوظات بزرگانِ دین کی محبت و

معیت کا بہترین بدل بھی ہیں اور حفاظتِ دین و ایمان کا ذریعہ بھی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت شاہ صاحب بخاری کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ جنہوں نے بہت سے اکابر علماء دیوبند کے خطبات و مقالاتِ حسنہ اور ملفوظات وارشادات اور حالات وواقعات کو متعدد کتابی صورتوں میں شائع کرایا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے علم و عمل میں مزید برکت عطا فرمائیں اور ان کی خدمات کو قبول و منظور فرمائیں۔ آمین۔



عرضِ مرتب

سیدی ومرشدی حضرت اقدس قبلہ مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ مجھ جیسے تہی دامن آدمی کے ذریعے حق تعالیٰ شانہٗ نے میرے اپنے اکابرو اسلاف کے حالات وخدمات اوران کی تعلیمات کوعام کرنے کی سعی وکاوش کواپنی بارگاہ اوران کی تعلیمات کوعام کرنے کی سعی وکاوش کواپنی بارگاہ میں قبول فرمایا ہے کہ متعدد تصانیف احقر کی مرتب کردہ ملک کے بڑے دینی اداروں کے ذریعے طبع ہوئی ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ جزائے خیر عطافرمائیں زمزم پبلشرز کراچی کوجنہوں نے احقر کی درخواست پرحضرت مفتیِ اعظم قدس سرہٗ کے علوم ومعارف کا یہ نادرمجموعہ شائع کیا ہے۔ جزاھم اللّٰہ احسن الجزاء.

بقول استاذِ قوم'' یہ کتاب حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہٗ کے نادر مضامین و مقالات اور چنداہم تقاریر وملفوظات کا مجموعہ ہے اوراس کتاب کے یہ علمی فقہی اور اصلاحی خطبات ومقالات حضرت مفتیِ اعظم قدس سرہٗ کےعلوم ومعارف کا خزانہ ہیں جوانشاءاللہ تعالیٰ نہایت مفیدنافع اورمعلومات افزاءثابت ہوں گے۔''

آخرمیں ایک بارپھرزمزم پبلشرز کراچی کادل کی گہرائیوں سے شکرگزارہوں، حق تعالیٰ شانہٗ انہیں اجرِعظیم عطافرمائیں۔آمین۔

احقرمحمداکبرشاہ بخاری غفرعنا
مدرسہ رشدفیہ اختشام العلوم
جامع مسجدعثمانیہ مام پور
ضلع راجن پور(پنجاب)

مختصر حالات وخدمات

مفتئ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ

از محمد اکبر شاہ بخاری

تلخیص ''حیات مفتئ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ'' مؤلفہ مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ

مفتئ اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور یو، پی کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ سادات میں سے تھیں اور آباؤ اجداد جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں اور دیوبند کے ممتاز اہل علم تھے ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے اور اہل قصبہ ان کے معتقد رہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک جید عالم دین اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ حضرت مفتئ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ۲۰، ۲۱ شعبان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء کی درمیانی شب میں قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور ایک دینی ماحول میں آنکھ کھولی، بچپن ہی سے جلیل القدر علماء کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ پانچ سال کی عمر میں حافظ عبدالعلیم صاحب کے پاس دارالعلوم دیوبند میں قرآنِ کریم کی تعلیم شروع کی۔ فارسی کی تمام مروجہ کتابیں اپنے والد محترم سے دارالعلوم میں پڑھیں۔ حساب وفنون وریاضی کی تعلیم اپنے چچا مولانا منظور احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں داخل ہوئے، اور ۱۳۳۵ھ میں

فارغ التحصیل ہوئے۔ جن عظیم المرتبت علماءِ امت سے آپ نے شرفِ تلمذ حاصل کیا ان میں امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ، مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، سید العلماء حضرت مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی دیوبندی رَحِمَہُمُ اللہُ تعالیٰ اور حضرت مولانا رسول خان ہزاروی جیسے اکابرین شامل ہیں۔

علمی وتدریسی کارنامے

حضرت مفتیٔ اعظم رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے تعلیم وتدریس کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی کتابوں سے شروع فرمایا پھر سالہا سال اوپر کے سب درجات میں تمام علوم وفنون اپنے باکمال اساتذہ کے زیر سایہ پڑھائے۔

حضرت مفتی اعظم فرمایا کرتے تھے کہ:

''دارالعلوم دیوبند کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹے کی پابندی تھی مگر میں روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا''۔

بالآخر بزرگوں کی خواہش وایماء پر آپ کو درجۂ علیا (دورۂ حدیث) کے اساتذہ میں شامل کرلیا گیا۔ جس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ جب سلہٹ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں حدیث پڑھانے کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی جس کے لئے حضرت مدنی رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ خط دعوت دی، آپ نے عذر کیا کہ:

''اس وقت تک دارالعلوم میں مجھے کبھی حدیث پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا میرا مشغلہ زیادہ تر ادب اور دوسرے فنون رہے۔''

اس پر تقاضے کا خط آیا کہ ایسا کیوں؟ حدیث کی تعلیم کو ضروری سمجھو۔ پھر دیوبند

تشریف آوری کے وقت دوبارہ تقاضا فرمایا۔ آپ نے عرض کیا:

”جہاں استاذِ محترم حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ درسِ حدیث دیتے ہوں وہاں ایسا احمق کون ہوگا جو مجھ سے حدیث پڑھنے کو گوارا کرلے۔“

فرمایا نہیں کوئی نہ کوئی کتاب حدیث کی ضرور پڑھایا کرو۔

بار بار تقاضا فرمایا۔ بالآخر دارالعلوم کی طرف سے سب سے پہلے مؤطا امام مالک کا درس آپ کے سپرد ہوا۔ اور اس کے بعد دورۂ حدیث کی دوسری کئی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔ سنن ابوداؤد آپ کے استاذ مہربان بزرگ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پڑھاتے تھے۔ ۱۳۵۴ھ میں اُنہیں دورانِ سال سفر پیش آیا تو ابوداؤد کا درس آپ کے سپرد فرما کر تشریف لے گئے، پھر استاذ موصوف کی خواہش پر مستقل طور سے یہ درس آپ کی طرف منتقل ہوگیا۔ اور سالہا سال جاری رہا۔ یوں تو ہر علم وفن میں آپ کا درس بہت مقبول رہا، علوم عقلیہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی انتہائی کتابوں میں آپ کا درس بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا لیکن آپ کے دو درس خصوصیت سے بہت مشہور ہوئے۔ ایک دورۂ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد شریف کا اور دوسرا عربی ادب کی مشہور کتاب مقاماتِ حریری کا۔ ان کتابوں کے درس میں شرکت کو مختلف ممالک کے نہ صرف طلباء بلکہ علماء کرام بھی اپنی سعادت شمار کرتے تھے۔

جب شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں درس بخاری دیتے تھے، سخت علیل ہوکر دیوبند تشریف لے آئے تو غالباً تعلیمی سال کے اختتام میں تین ماہ باقی تھے اس وقت جامعہ کے مہتمم صاحب ان کی جگہ حضرت مفتی صاحب کو لینے کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ ان کے اصرار اور شیخ الاسلام علامہ عثمانی کے ارشاد پر آپ

نے تین ماہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بخاری شریف کا درس دیا اور اس سے قبل ۲۶ سال تک دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔ پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں کوئی دینی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں یہ سلسلہ جاری کیا جاسکتا مگر کچھ منتہی طلباء یہاں بھی آ گئے۔ ان کو آپ نے اور حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جامع مسجد جیکب لائن میں بعض اسباق پڑھائے۔ پھر شوال ۱۳۷۰ھ میں آپ نے دارالعلوم کراچی کی تاسیس فرمائی تو اس میں بھی کئی سال بخاری شریف کے درس سے طلباء کو مشرف فرمایا۔ جب قویٰ میں انحطاط اور ملّی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو کئی سال بخاری شریف کا درس اس طرح جاری رکھا کہ بخاری کتاب الوضوء تک آپ پڑھاتے اور باقی کتاب دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ پڑھاتے تھے۔ زندگی کے آخری چار سال جن میں آپ صاحبِ فراش رہے ان میں یہ سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا مگر طلباء و اساتذۂ دارالعلوم کے اصرار پر ہر سال بخاری شریف کا پہلا اور آخری درس آپ ہی دیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کراچی میں بخاری شریف کے علاوہ مؤطا امام مالک اور شمائل ترمذی کا درس بھی کئی سال جاری رہا۔

بہرحال برصغیر پاک و ہند کے تمام صوبوں اور ریاستوں کے علاوہ چین، انڈونیشیا، ملایا، برما، سیلون، افغانستان، ایران، ترکستان، بخارا، سمرقند اور افریقہ وغیرہ کے بھی ہزارہا طلباء نے آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔ جن میں محدثین و مفسرین بھی ہیں۔ فقہاء و متکلمین بھی، سیاسی زعماء بھی ہیں اور مدرّسین و مصنفین بھی، غرض دین کے ہر شعبہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے جلیل القدر علماء دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں ان کی دینی خدمات مختلف شعبوں میں جاری ہیں چند مشہور تلامذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

محدث العصر حضرت علامہ سیّد محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا مسیح اللہ خان

صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب، حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، حضرت مولانا قاری فتح محمد پانی پتی، حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی، مولانا انوار الحسن شیر کوٹی، مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلی، مولانا سید نورالحسن بخاری، مولانا سید بادشاہ گل صاحب، مولانا عرض محمد صاحب، مولانا سحبان محمود صاحب، مولانا قاضی عبدالکریم کلاچی، مولانا قاری عبدالعزیز شوقی مرحوم، مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی، مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی، مولانا صدیق احمد صاحب چاٹگامی، مولانا مفتی محی الدین صاحب ڈھاکہ مولانا آفتاب احمد مدنی اور عبدالقدوس صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ۔ (البلاغ مفتیِ اعظم نمبر)

بحیثیتِ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

جب حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز فرمایا۔ اس وقت دارالعلوم کے صدر مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی تھے جو جامع الکمالات ہی نہیں بلکہ مفتیانِ ہند کے استاذ و مربی تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان سے مشکوٰۃ، جلالین اور موطا وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں۔ آپ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں آئے ہوئے سوالات گاہے گاہے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو عنایت فرمادیتے۔ آپ جواب لکھ کر پیش کرتے جو اصلاح و تصدیق کے بعد دارالافتاء سے جاری کر دیئے جاتے۔

۱۳۴۴ھ میں مفتیِ اعظم ہند حضرت اقدس مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے۔ تو اس منصب کے لئے موزوں شخصیت کا انتخاب کا مشکل مرحلہ ذمہ دارانِ دارالعلوم کے سامنے آیا۔ ضرورت ایسی جامع شخصیت کی تھی جو اس خلاء کو دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ تحقیقی معیار کے مطابق پُر کر سکے۔ چند سال تک دارالافتاء کا

کام مختلف صورتوں سے جاری رہا۔ بالآخر اساتذہ و بزرگوں اور ذمہ دارانِ دار العلوم کی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پر آ کر رُکی۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ ہر علم وفن کے اسباق متواتر پندرہ سال پڑھا چکے تھے علمی تجربہ سب کے نزدیک مسلّم، مگر تواضع کی یہ شان اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی تھی کہ خود کو کسی طرح بھی اس منصب کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ دار العلوم کی طرف سے اس کی پیش کش ہوئی تو قبول کرنے میں آپ کو بہت پس وپیش ہوئی۔ بالآخر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ جو حضرت مفتیٔ اعظم کے مرشد ومربی تو تھے ہی اس وقت دار العلوم دیوبند کے بھی باضابطہ سرپرست تھے ان کی خدمت میں مشورہ کے لئے یہ خط لکھا کہ:

''ایک ضروری عرض اس وقت یہ ہے کہ مدرسہ (دار العلوم دیوبند) میں موجودہ مفتی صاحب کے متعلق اربابِ حل وعقد کو عام شکایت ہے اس لئے وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں پہلے بھی اس سلسلے میں ایک مرتبہ میرا نام لیا گیا تھا مگر نامکمل بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مرتبہ پھر یہ سلسلہ اٹھا ہے اور یہاں اکثر حضرات مجھے اس کام کے لئے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ کام فی نفسہ سخت ہے اور پھر مجھ جیسے ناکارہ، نااہل کے لئے جس کو اس کام کی اب تک کچھ زیادہ نوبت بھی نہیں آئی۔ مگر یہ تجویز ہوئی ہے کہ مولانا سیّد اصغر حسین صاحب یا مولانا اعزاز علی صاحب کے ملاحظہ کے بعد فتاویٰ روانہ کئے جائیں گے تاہم ابتدائی کام تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ البتہ یہ نفع بھی اس میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کام قابو میں آ گیا تو دینی نفع بھی بہت بڑا ہے اور درس وتدریس میں جو دماغی تکلیف میری وسعت سے زائد ہو رہی تھی اس میں تخفیف ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا حل حضرت ہی کی زبان فیض ترجمان سے چاہتا ہوں۔''

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"قبول کرلینا چاہئے، حدیث اِنْ اکرِھت عَلَیھا اُعِنت عَلَیھا میں وعدہ ہے۔ مختصر یہ کہ ۲۸؍ربیع الاول ۱۳۵۰ھ میں آپ کو دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ نے افتاء پر بحیثیت صدر مفتی فائز کردیا۔

آپ حسبِ عادت پوری جانفشانی کے ساتھ اس مشکل ترین علمی کام میں منہمک ہوگئے۔ درس کا سلسلہ بھی جزوی طور پر جاری رہا۔ اس وقت آپ کا مشاہرہ پینتالیس روپے مقرر کیا گیا۔ آپ کے فتاویٰ پر نظر کرنے کے لئے آپ ہی کی خواہش پر آپ کے استاذ محترم مولانا سیّد اصغر حسین صاحب کو مامور کردیا گیا تھا۔ اہم اور مشکل فتاویٰ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشوروں کا سلسلہ زبانی اور بذریعہ خط و کتابت جاری رہتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب کو ہر کام نہایت مستعدی، احساسِ ذمہ داری، احتیاط اور پھرتی سے نمٹانے کی عادت تھی۔ دارالعلوم دیو بند کے دارالافتاء سے جو فتاویٰ جاری ہوئے تھے آپ کے دارالافتاء میں منتقل ہوتے ہی ان کی تعداد اور کیفیت وضخامت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ جس کا اندازہ اعداد وشمار سے ہوتا ہے جو ۲۵؍شوال ۱۳۵۸ھ میں دفتر اہتمام کی ہدایت پر تیار کئے گئے تھے۔ ان اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سال فتاویٰ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور فتاویٰ زیادہ محققانہ اور مفصل بھی ہونے لگے۔

۱۳۴۸ھ میں (یعنی یکم شوال ۱۳۴۸ھ سے ۳۰؍رمضان ۱۳۴۹ھ تک ایک سال میں) دارالعلوم دیو بند کے دارالافتاء سے کل ۲۸۷۵ فتاویٰ جاری کئے گئے جو نقل فتویٰ کے رجسٹر میں ۴۰۴ صفحات پر مشتمل تھے۔ لیکن اگلے سال کے وسط میں جب فتویٰ کا کام حضرت مفتیِ اعظم کے سپرد کیا گیا تو اس سال صرف چھ ماہ میں فتاویٰ کی تعداد میں ۶۶۱ کا اور رجسٹر کے صفحات میں نوے کا اضافہ ہوا۔ پھر یہ اضافہ روز افزوں ہوتا گیا۔ ۱۳۵۲ھ میں فتاویٰ کی تعداد چار ہزار چھ سو پانچ اور

صفحات رجسٹر کی تعداد ۷۶۸ ہوگئی جو ۴۸ء کے مقابلے میں تقریباً دو چند ہے۔

اعداد وشمار سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے صرف چار سال کے عرصہ میں بارہ ہزار سے زیادہ فتاویٰ تحریر فرمائے جن میں سے صرف ایک ہزار ''امداد المفتین'' کے نام سے شائع ہوئے۔ باقی دار العلوم دیوبند کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے تقریباً اڑتیس فتاویٰ اتنے مفصل اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ کہ وہ مستقل رسالے بن کر کچھ ''امداد المفتین'' میں کچھ ''جواھر الفقه'' میں اور کچھ الگ مستقل کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ دار الافتاء میں دنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خصوصاً جن پیچیدہ مسائل میں علماء کا باہمی اختلاف رائے ہوتا وہ بھی فیصلہ کے لئے یہیں آتے تھے۔ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فریقین کے آراء اور دلائل وتحقیقات کا تنقیدی جائزہ لے کر اپنی تحقیق اور فیصلہ تحریر فرماتے۔ فتاویٰ کی مذکورہ بالا تعداد میں ایسے فتاویٰ بھی بکثرت ہیں۔ آپ کے فتاویٰ اور فقہی تحقیقات کو اس زمانہ کے فقہاء ارباب تقویٰ اور آپ کے بزرگوں نے جس انداز میں سراہا اور دل کھول کر دعائیں دیں۔ اس کی تفصیلات بہت ہیں جن کا یہ موقع نہیں ہے۔

الغرض حضرت مفتی اعظم دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی کے عظیم منصب کا حق پوری طرح ادا کرتے رہے اور قیام پاکستان تک اس عظیم منصب پر فائز رہے۔

(ماہنامہ البلاغ کراچی مفتی اعظم پاکستان نمبر)

تحریک پاکستان اور مفتیٔ اعظم

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ طبعاً ہنگاموں، سیاسی جلسوں اور جلوسوں سے الگ رہنا پسند فرماتے تھے لیکن جب بھی اسلامی اور مسلمانوں کی کسی اہم دینی ضرورت نے سیاست میں عملی حصہ لینے کا تقاضا کیا۔ آپ اس میں بھی سرگرمی سے

بقدرِ ضرورت شریک ہوئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے اواخر میں جب مجاہدین بلقان ہر طرف سے نرغہ میں تھے۔اس کی نزاکت اکابر علماء دیوبند نے پوری شدت سے محسوس کی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تلامذہ اور مریدین کے ذریعہ مجاہدین بلقان کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی یہ وقت حضرت مفتی صاحب کی نوعمری اور طالب علمی کا تھا آپنے اس پرخلوص مہم میں نہایت سرگرمی سے رضا کارانہ حصہ لیا۔سخت بارش کے زمانہ میں پیدل گاؤں گاؤں پھر کر چندہ جمع فرمایا۔

جس زمانہ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی اور تدریس کے منصب جلیل پر فائز تھے اسی زمانہ میں مسلم لیگ نے کانگریس کے علی الرغم مسلمانان برصغیر کے لئے ایک آزاد وخودمختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا اس موقعہ پر اکابر علماء دیوبند اپنی دیانت دارانہ رائے کی بناء پر دو مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئے۔ایک گروہ جمعیت علماء ہند کے سرکردہ زعماء کا تھا جو کانگریس کے ہم آواز ہوکر متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف اور مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کے لئے مضر سمجھتا تھا۔

دوسرا گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہم پر مشتمل تھا جو حکیم الامت تھانوی کی رائے کے مطابق مسلمانانِ ہند کو کافروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا اور جس طرح کا اشتراک بعض مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ کرنے لگی تھیں اسے درست نہ سمجھتا تھا۔

شروع میں یہ اختلاف آپ کے تبادلۂ خیالات علمی مباحثوں اور دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود رہا۔ لیکن پاکستان کے لئے ہونے والا الیکشن جوں جوں قریب آرہا تھا مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ زور پکڑتا جارہا تھا کہ:

''مسلم لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے اسے علماء کی تائید حاصل نہیں''۔

ادھر ارباب لیگ بھی محسوس کررہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء کرام بھرپور تعاون نہ فرمائیں پاکستان کا قیام ممکن نہیں ہے۔

تحریک پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفاء

اب وقت آگیا تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو کھول کر عوام کے سامنے لایا جائے اور پاکستان کا مطالبہ سیاسی وشرعی حیثیت سے جیسا کہ حق بجانب، بروقت اور ضروری ہے۔ اس کا صرف اظہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی آواز پوری قوت سے پہنچائی جائے، دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے اس اختلاف کا مسلسل اظہار نظم دارالعلوم کے لئے مناسب نہ تھا اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ کے مشورہ سے دارالعلوم سے علیحدگی کا فیصلہ فرمالیا۔ یہ فیصلہ ان حضرات کے لئے جتنا صبر آزما تھا اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہوسکتا۔ ان حضرات نے اپنے بچپن، جوانی اور کہولت کے شب وروز اسی کی چہار دیواری میں گزارے تھے۔ زندگی کی ولولہ انگیز توانائیاں اسی کی تعمیر میں صرف کی تھیں۔ ان حضرات کے لئے یہ صرف ایک درسگاہ نہیں بلکہ دنیا وآخرت کی امیدوں کا مرکز تھا۔ دارالعلوم ان کا وطن بھی تھا، آغوش مادر بھی، لیکن ملک وملّت کی خاطر اب اس آغوش مادر سے ضابطہ کا تعلق باقی رکھنا ممکن نہ تھا، بالآخر ۱۶/ربیع الاوّل ۱۳۶۲ھ کا وہ دن آپہنچا جب شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ کی معیت میں حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ اور آپ کے برادرِ عم زاد حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ، جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ، اور دیگر علماء کرام، دارالعلوم دیوبند کی خدمات سے مستعفی ہوگئے۔ استعفاء کے بعد آپ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ تو حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ نے دیکھتے ہی دیوانِ حماسہ کا ایک مصرعہ کچھ تغیّر کرکے اس طرح پڑھا ؎

اَضَاعُوكَ وَاَیَّ فَتیً اَضَاعُوا

افسوس! لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھودیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے۔

۱۳۲۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تدریس وافتاء کی ۲۷ سالہ خدمات کے بعد جب مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو مشاہرہ ۲۵ روپے تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک جو دوقومی نظریہ پر مبنی تھی حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی حمایت ۱۳۵۶ھ ہی سے اپنی تحریروں کے ذریعے فرمارہے تھے۔ تحریک پاکستان میں حضرت مفتئ اعظم کا حصہ بھی شروع میں محض علمی خدمات تک محدود رہا۔ دارالعلوم سے استعفاء کے بعد تو قیام پاکستان کی جدوجہد ہی شب وروز کا مشغلہ بن گئی تھی۔

قیامِ پاکستان کے لئے سرگرم جدوجہد

اس مسئلہ میں عام فتاویٰ اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ھ میں ایک مستقل شرعی فیصلہ "تصنیف فرمایا جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کونہایت تفصیل سے واضح فرمایا۔ اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی جس میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام بے انتہا خوبی اور تفصیل سے جمع کئے گئے۔ دلائل میں حضرت مفتئ اعظم نے اپنی عادت کے مطابق قرآن وسنّت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کئے اور عقل وسیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ موالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی۔ اور اس میں حصہ لینا قرآن وسنّت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔ یہ رسالہ اُسی وقت بڑی تعداد میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی

رحمہ اللہ تعالیٰ کے دس رسائل، متفرق مضامین اور ملفوظات ومکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے کتابی شکل میں ''افاداتِ اشرفیہ ورسائل سیاسیہ'' کے نام سے شائع فرمایا یہ مجموعہ بھی اس موضوع پر بہت مؤثر ثابت ہوا۔

بروقت ایک اہم فتویٰ

۲۲ر نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات تحریک پاکستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے، سہارنپور اور مظفرنگر وغیرہ کے حلقۂ انتخاب سے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ سے قائدِ ملّت لیاقت علی خان مرحوم کھڑے ہوئے جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم بنے۔ یہاں مسلم لیگ کی کامیابی سب ہی کو مشکل نظر آرہی تھی مگر حضرت مفتی صاحب کے ایک فتویٰ نے فضاء یکسر بدل دی۔ یہ فتویٰ پوسٹروں کی شکل میں پورے حلقۂ انتخاب میں چسپاں کیا گیا جس کا بڑا عنوان یہ تھا۔

''کانگریس کی حمایت کفر کی حمایت ہے''

جناب خواجہ آشکار حسین صاحب نے جو مسلم لیگ کی ہائی کمان کی جانب سے اس حلقہ کا جائزہ لینے پر مامور تھے ماہنامہ نقاد میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

''سب سے سخت مقابلہ خود لیاقت علی خان کے حلقۂ انتخاب میں تھا۔''

آگے فرماتے ہیں کہ:

''ہم سہارنپور پہنچے وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مفتی محمد شفیع صاحب کے فتوے کے بغیر کام نہ چلے گا۔ میں نے دیوبند جا کر مفتی صاحب موصوف کا فتویٰ بھی حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ر نومبر کو پولنگ ہونے والی تھی۔ ۲۴ر نومبر کو لیاقت علی خان سہارنپور پہنچے۔ میں فوراً ڈاک بنگلہ پہنچا۔ لیاقت صاحب بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے اور فتوے کی کامیابی پر مبارک

باددی۔ میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کیا دیکھ کر اچھل پڑے پھر حالات کے متعلق استفسار کرنے لگے۔" (ماہنامہ نقاد کراچی اکتوبر ۱۹۵۲ء)

خطبۂ صدارت جمعیت علماء اسلام حیدرآباد کانفرنس

دارالعلوم دیوبند سے الگ ہو جانے کے بعد نومبر ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں جمعیت علماء اسلام کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس کے مقاصد میں سرفہرست یہ تھا کہ مطالبۂ پاکستان کے لئے مؤثر جدوجہد کی جائے۔ اور جو مسلمان مطالبۂ پاکستان سے منحرف یا تردّد کی حالت میں کھڑے ہیں انہیں قیام پاکستان کی مجاہدانہ جدوجہد میں شریک کیا جائے۔ اس جمعیت کے سب سے پہلے صدر علامہ شبیر احمد عثانی چنے گئے۔ حضرت مفتی صاحب جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ اور باقاعدہ آپ تحریک پاکستان کے لئے جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

جمعیت علماء اسلام کی ہر شہر کانفرنسیں ہوتی رہیں اور آپ ان میں شرکت فرماتے اور حصولِ پاکستان کے لئے خدمات انجام دیتے رہے۔

۲۴ رے ۱۹۴ء میں جمعیت علماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس حیدرآباد سندھ میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو کرنا تھی مگر بروقت ان کو شدید علالت پیش آ گئی۔ تو حضرت مفتی صاحب کو اس کانفرنس کی صدارت کے لئے سندھ روانہ کیا۔ یہاں کے علماء اور عوام کے عظیم الشان تاریخی اجتماع میں آپ نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، سیاست کے اسلامی اصولوں کا بے نظیر مرقع ہے۔ اس میں آپ نے سیاسی قیادت کے شرعی اصول اور غیر صالح امیر کی اطاعت کے شرعی حدود پر سیر حاصل بحث فرمانے کے بعد معترضین کے جوابات اور علماء عوام کے فرائض دلنشین انداز میں بیان فرمائے۔ یہ خطبہ صدارت اس زمانہ میں ہزارہا کی تعداد میں طبع ہوا۔ لیکن پاکستان بن

جانے کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔

کانگریسی خیال رکھنے والے مسلمان جو گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت کو شرعاً جائز قرار دے رہے تھے ان کا ایک بڑا اعتراض مسلم لیگ پر یہ تھا کہ اس کے لیڈر علم دین سے بے بہرہ اور اسلامی شعائر سے بے پرواہ ہیں اس لئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی بجائے کانگریس کی حمایت کرنا چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس اعتراض کا جواب قرآن وسنّت کی روشنی میں نہایت بسط کے ساتھ دیا ہے جو قائداعظم کی قیادت پر ایک اعتراض اور اس کا جواب'' کے عنوان سے علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا تھا اب اس کی ذرا تفصیل ماہنامہ البلاغ کے مفتیِ اعظم نمبر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ''دنیا کے تمام مسلمان ایک ملّت ہیں اور کافر بالکل دوسری ملّت ہیں۔ یہ دو متضاد ملّتیں بھائی بھائی نہیں ہو سکتیں وطن کی بنیاد پر انہیں ایک قوم یا ایک برادری نہیں کہا جا سکتا۔'' مسلمان دینی اعتبار سے کتنا بھی گیا گزرا ہو مگر کافر و مشرک سے بہر حال بہتر ہے'' ہندو اکثریت کی حکومت کو اپنے اوپر اور اپنے اختیار سے مسلط کرنا مسلمانوں کے لئے کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے''

مسلمانوں کو ایک مغالطہ یہ دیا جاتا تھا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی تو ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا تھا اگر وہ جائز تھا تو اب کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کیوں جائز نہیں؟ حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ ''مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ'' میں اس کا نہایت مفصل جواب دیا۔ کہ حضرت شیخ الہند نے ہندوؤں کے اشتراکِ عمل کو اس لئے گوارا کیا تھا کہ اس وقت قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو اس قیادت کے پیچھے چل رہے تھے چنانچہ اگر ہندوستان اس وقت آزاد ہوا ہوتا تو حکومت مسلمانوں کو ملتی۔ ظاہر ہے کہ

اسلامی حکومت کے قیام میں کافروں سے جزوی طور پر مدد لینا فی نفسہ کوئی ناجائز کام نہیں اوراب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کہ کانگریس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر پورے ہندوستان کا مرکزی اقتدار کانگریس کو ملا تو پورے ملک پر ہندو اکثریت قائم ہو جائے گی اور اپنے اختیار سے کسی کافر حکومت کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی اسلام کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ حضرت شیخ الہند نے بھی اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا۔"

غرض شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں ان حضرات علماء دیوبند نے انتھک جدوجہد اور مجاہدانہ سرگرمی سے کام لے کر قرآن وسنّت کے مدلل قانون سے مسلمانوں پر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قیام پاکستان کا مطالبہ درحقیقت قرآن وسنّت کے اصولوں پر مبنی ہے اور کانگریس کا پھیلایا ہوا کافرانہ جال مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکال کر ہندوؤں کی بدترین غلامی میں پھانسنے کے لئے بنایا گیا ہے تو وہ جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

سلہٹ اور صوبۂ سرحد کا ریفرنڈم:

حضرت مفتیٔ اعظم اور دوسرے اکابر علماء کی سرگرم جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ جو ۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے لئے ہوتے تھے ان میں تمام مسلم نشستیں مسلم لیگ کو ملیں، یہ سو فیصد کامیابی قیام پاکستان کے لئے سنگِ میل ثابت ہوئی کیونکہ اسی اسمبلی کو ہندوستان کا آئین بنانا تھا اور ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ بھی بڑی حد تک اسی کو کرنا تھا اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کا لوہا منوالیا۔ اور ثابت کر دیا کہ مسلمان ہندوؤں کی غلامی کے لئے تیار نہیں، بالآخر انگریز، ہندو اور سکھ تینوں قوموں کو مطالبۂ پاکستان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ اور تقسیم ہند کے لئے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ طے ہوگئی، قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس پر غور کرنے کے بعد ۹ رجون ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا اگرچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتیِ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اسمبلی کے رکن نہ تھے مگر خصوصی دعوت پر دونوں حضرات بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اجلاس نے متفقہ طور پر قیام پاکستان کا مجوزہ نقشہ منظور کرلیا مگر ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے قیام پاکستان کے فیصلہ میں ایک شق یہ بڑھادی تھی کہ سلہٹ اور صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوں یا بھارت میں، اس کا فیصلہ وہاں کے عوام سے بذریعہ ریفرنڈم کرایا جائے گا حالانکہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں یہاں کے مسلمان بھی اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دے چکے تھے مگر یہ شق پنڈت نہرو نے اس وجہ سے رکھوائی تھی کہ صوبہ سرحد میں اس وقت کانگریسی وزارت قائم تھی جو خان برادران چلا رہے تھے۔ اس کانگریسی وزارت نے بھی گاندھی اور نہرو کے عزائم کے لئے فضا خوب بنائی تھی۔ اور پاکستان کے حامی سینکڑوں علماء کرام کو جیلوں میں بند کردیا گیا تھا۔ اسی لئے مسلمانوں کو سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کی بڑی فکر تھی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے مسلم ارکان کی یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس سے فارغ ہوکر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ۱۱ رجون ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم سے دہلی میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات فرمائی۔ قائد اعظم نے کھڑے ہوکر پر جوش خیر مقدم کیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے قائد اعظم کو حصولِ پاکستان پر مبارک باد پیش کی۔ تو انہوں نے کہا:

''مولانا! اس مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں اور آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔''

اس کے بعد قائد اعظم نے کہا کہ:

''اس وقت سب سے اہم مسئلہ سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا ہے اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو بہت بڑا نقصان ہوگا''

ان حضرات نے فرمایا کہ:

''انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہوگا بشرطیکہ آپ اعلان کریں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہوگا'' اس پر قائد اعظم نے کہا کہ:

''میں پاکستان کے مقدمہ میں مسلمانوں کا وکیل تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اس مقدمہ میں کامیاب کیا۔ پاکستان ان کو مل گیا میرا کام ختم ہوا اب مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہیں نظام قائم کریں اور چونکہ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست قائم ہو۔''

اسی ملاقات میں یہ طے ہوا کہ سلہٹ کا دورہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی فرمائیں گے اور سرحد کا دورہ علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مفتی اعظم فرمائیں گے۔

پختونستان کی سازش:

جب تک قیام پاکستان کا فیصلہ نہ ہوا تھا، کانگریس کی طرف سے ایک ہی رٹ لگائی جا رہی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی قومیں ہندو، مسلم اور سکھ وغیرہ خواہ وہ کسی صوبے کے باشندے ہوں، سب مل کر ایک قوم ہیں۔ ان کا وطن بھی ایک ہونا چاہئے لہٰذا مسلمانوں کی الگ حکومت پاکستان میں قائم کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس پورے عرصہ میں کسی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ حالانکہ ہندوستان جو چودہ پندرہ صوبوں کا ملک تھا اس میں صوبہ سرحد کی حیثیت ایک چھوٹے سے صوبے کی ہوتی اور متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں اقتدار ہمیشہ ہندوؤں کے

ہاتھ میں ہوتا۔ سرحدی گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے۔ مرکز میں ہندوؤں کا اقتدار ہو اور صوبہ سرحد کے غیور مسلمان ہندوؤں کے زیرِ نگین ہوں لیکن جب انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا تو پاکستان کا ہر صوبہ انہیں الگ قوم نظر آئے گا۔ اور صوبائی قومیت کی بنیاد پر انہوں نے شیخ اسلام علامہ عثمانی اور مفتیٔ اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دورۂ سرحد سے پہلے ہی یہاں پختونستان کا نعرہ بلند کرادیا۔ چنانچہ:

''سرحد کی کانگریس پارٹی، خدائی خدمت گار اور کرزئی پختون کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی جس میں ریزولیشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے گا۔ یہ جلسہ سوکڑی ضلع بنوں میں منعقد ہوا تھا۔''

درحقیقت یہ پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے کانگریس کی ایک چال تھی۔ جس نے ریفرنڈم کی شرط تو رکھوادی تھی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ کر پریشان تھی کہ قیام پاکستان کے لئے سرحد کے غیور مسلمانوں کا جوش وخروش دوسرے صوبوں سے کم نہیں اور اس کی امید بہت کم تھی کہ کوئی بھی غیرت مند مسلمان صوبہ سرحد کا الحاق پاکستان کے بجائے بھارت کافرانہ حکومت کے ساتھ پسند کرے گا اس لئے کانگریس نے مسلمانوں میں صوبہ وارانہ تعصب کی آگ بھڑکا کر یہ چاہا تھا کہ اگر صوبہ سرحد بھارت کو نہ مل سکے تو یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ وہ پاکستان سے بھی الگ ایک مستقل ریاست بنے جس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ پاکستان کمزور ہوگا دوسرا یہ کہ پختونستان بھارت کے لئے ایسا نوالۂ تر ہوگا۔ کہ اُسے ہڑپ کر جانا اس کے لئے ہر وقت ممکن ہوگا۔ اسی مستقل ریاست کا نام پختونستان رکھا گیا تھا اور یہ نعرہ چونکہ صوبائی تعصب پر مبنی تھا اس لئے اس کے چل جانے کی امید تھی، جن کے لئے کانگریس کے پورے وسائل حرکت میں آچکے تھے۔ سرحد کے دیندار اور غیور مسلمان پختونستان کی شدت سے مخالفت

کرر ہے تھے جن میں وہاں کے اس وقت کے مشہور مشائخ پیر مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ مگر یہ سب حضرات اس کی ضرورت شدت سے محسوس کرر ہے تھے کہ دیو بند کے اکابر یہاں آ کر عوام کو صحیح دینی صورت حال سے آگاہ فرمائیں۔ یہاں کے عوام دینی امور میں علماء دیو بند کے علاوہ کسی کی بات پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔

یہ تھے وہ نازک حالات جن میں حضرت شیخ الاسلام کی معیت میں صوبہ سرحد کا دورہ حضرت مفتیِ اعظم نے کیا۔ اور بظاہر حالات اسی کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے بچایا۔

ریفرنڈم کے موقع پر صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ:

یوں تو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے پورے ہندوستان کے طول وعرض کے دورے کئے اور جگہ جگہ عام وخاص جلسوں سے خطاب فرمایا، آپ کا مدراس اور دکن کا دورہ بھی بہت کامیاب دورہ تھا۔ لیکن ریفرنڈم کے نازک موقع پر صوبہ سرحد کا یہ دورہ تاریخی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کانگریس نے ''پختونستان'' کے پردے میں سرحد کے غیور مسلمانوں کو غلام بنانے اور پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے جو خطرناک جال پھیلایا تھا وہ اسی دورے سے تار تار ہوا۔ پیر صاحب مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف نے اس دورے کا انتظام کیا تھا۔ وہ خود بھی ان حضرات کے ساتھ مجاہدانہ سرگرمی سے شریک رہے۔ یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا مگر یہ حضرات صوبہ بھر میں شہر شہر، گاؤں گاؤں پھر کر کلمہ حق پہنچاتے رہے۔



فتح مبین:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کوایسا شرفِ قبول عطافرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پاکستان کے حق میں جوش وخروش سے بھرگئی۔اور جب ریفرنڈم ہوا تواس میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے اپنا فیصلہ دے دیا کہ صوبہ سرحداور پاکستان ایک ہیں اورایک رہیں گے۔

سیاسی مبصرین کی یہ قطعی رائے ہے کہ اگراس نازک وقت میں شیخ الاسلام علامہ شبیراحمد عثمانی اور مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرحد کادورہ نہ فرماتے اور پیر مانکی وپیر زکوڑی شریف کے اپنے اثرات پوری طرح کام نہ کرتے توریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی ممکن نہ تھی۔ریفرنڈم کا جونتیجہ صوبہ سرحد میں سامنے آیا۔سلہٹ کانتیجہ بھی اس سے مختلف نہ تھااس محاذ کوحضرت مولانا ظفراحمد عثمانی اور مولانا اطہر علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سرکیا تھا۔مضبوط پاکستان کے قیام میں یہی ریفرنڈم کا مرحلہ باقی تھا جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان بوریہ نشین علماءحق کے ذریعہ تمام مسلمانوں کوسرخروئی عطافرمائی۔

پہلے جشنِ آزادی پر پاکستان میں پرچم کشائی:

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کی شب کوگویا نزول قرآن کی سالگرہ کے وقت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا اقتدار اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا۔اور پاکستان سب سے بڑی اسلامی مملکت بن کر دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ اس روز پاکستان میں جوسب سے پہلا جشن آزادی منایا جانے والا تھا اس میں شرکت کے لئے دیوبند سے شیخ الاسلام علامہ شبیراحمد عثمانی اور حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی مدعو کیا گیا لیکن حضرت مفتیِ اعظم شدید علالت کے

باعث سفر نہ فرما سکے۔ حضرت شیخ الاسلام کراچی تشریف لائے اور قائداعظم کی خواہش پر اس تقریب میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم آپ ہی نے اپنے دستِ مبارک سے بلند فرمایا۔ اُدھر مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں پرچم کشائی کی رسم حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نے انجام دی۔

تاریخی کارنامہ قراردادِ مقاصد:

قیام پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تھا۔ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں خصوصی نصرت وحمایت سے نوازا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ یہاں اسلامی نظام حیات قائم کرنے کا تھا چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اسلامی دستور کی جدوجہد کا آغاز فرما دیا اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی دستور کا ایک اجمالی خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ حکومت کے سامنے مطالبہ قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ یہ خاکہ مرتب کرنے کیلئے حضرت شیخ الاسلام نے جن اکابر علماء کرام کو خصوصی دعوت دی، ان میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ، مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دکنی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے اسلامی دستور مرتب کرنے کے لئے شب وروز محنت کی اور ایک اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کر کے حکومت کو پیش کردیا۔ اس کے بعد شیخ اسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک تاریخی کارنامہ ''قراردادِ مقاصد'' کے نام سے منظور کرا کے سرانجام دیا۔ قرادادِ مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بہ طور دیباچہ شامل چلی آرہی ہے اور ۱۹۷۳ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے۔

یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکتِ خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی

جدوجہد عمل کی سمت، قرآن وسنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے اوران بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پائے تھے۔ اور جن کی پابندی دستور ساز اسمبلی کو اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا، اب تک پاکستان کے دستور وقانون میں جو جو اسلامی دفعات شامل ہوئیں یا آئندہ شامل ہوں گی وہ سب اس وقت کے وزیراعظم شہیدِ ملت خان لیاقت علی خان مرحوم نے پیش کی تھیں۔ مگر اس کا مسودہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مفتی اعظم نے طویل غور وخوض کے بعد مرتب فرمایا تھا اس کی تیاری اور اس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں حضرت شیخ الاسلام اور حضرت مفتی اعظم کو طویل علمی اور سیاسی جدوجہد کرنی پڑی۔ برسر اقتدار طبقہ کا ایک گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کررہا تھا۔ قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم نے اس گروہ کے علی الرغم شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء علماء حق کی حمایت کی اور اسمبلی میں ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد خود پیش کرکے اسے منظور کرایا۔ یہ سب شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ الغرض حضرت شیخ الاسلام کی دینی، علمی اور سیاسی جدوجہد میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ برابر شریک رہے۔

بورڈ آف تعلیماتِ اسلام کی رکنیت:

پھر جب ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کیا تو قائد ملت لیاقت علی خان نے ایک ''اسلامی مشاورتی بورڈ'' بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرکے پیش کرے اور اس کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل چھ حضرات پر مشتمل تھا۔

☆ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ، صدر۔
☆ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، رکن۔
☆ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سابق استاذ جامعہ عثمانیہ دکن، رکن۔
☆ جناب پروفیسر عبدالخالق صاحب، رکن۔
☆ جناب ظفر احمد صاحب انصاری، سیکریٹری۔
☆ جناب جعفر حسین مجتہد شیعہ۔

مگر علامہ سید سلیمان ندوی اس وقت تک ہندوستان میں تھے پھر پاکستان تشریف لانے کے بعد کافی عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں آپ نے عہدۂ صدارت سنبھالا۔ اس وقت تک یہ بورڈ صدر کے بغیر ہی اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ یہ بورڈ ۹؍اگست ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک تقریباً چار سال قائم رہا۔ اور حضرت مفتی اعظم شروع سے آخر تک اس کے ممتاز رکن رہے۔ اس بورڈ نے نہایت عرق ریزی کے بعد دستور پاکستان کے لئے جو سفارشات پیش کی تھیں اگرچہ ۱۹۵۶ء و ۱۹۷۳ء کے دستوروں میں ان کی جھلک موجود تھی لیکن افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گئیں نہ انہیں ارباب حل وعقد نے شائع کیا۔ بورڈ آف تعلیمات اسلام کا تعلق تو صرف دستور کی حد تک تھا پاکستان کے موجودہ قوانین سے اس کا تعلق نہ تھا موجودہ قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی نے حکومت پر زور دیا تو ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک لاء کمیشن بنایا گیا جس میں علماء کرام کی جانب سے ابتداء میں صرف علامہ سید سلیمان ندوی کو ممبر بنایا گیا۔ جسٹس رشید اور جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کئے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ شیخ الاسلام علامہ عثمانی کی وفات کئی ماہ قبل ہوچکی تھی جو حضرت مفتی اعظم کے استاد بھی تھے اور پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی نے محسوس فرمایا کہ اسلامی قانون کے ماہر کی حیثیت

سے لاء کمیشن میں حضرت مفتی صاحب کی شرکت ناگزیر ہے۔ چنانچہ لاء کمیشن میں اپنی شرکت کا رکن بنایا جائے، بالآخر آپ کو اس کی بھی رکنیت قبول کرنی پڑی۔ یہ کمیشن دو سال تک قائم رہا لیکن وزارتوں کے تغیر اور برسراقتدار میں کئی ایسے افراد کی طرف سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار نہ تھے اس کمیشن کی مساعی کوئی نتیجہ پیدا نہ کرسکیں۔

ایک موقع پر اس کمیشن کی ایک میٹنگ میں حضرت مفتی صاحب نے کمیشن کے چیئرمین کو جو ایک جسٹس تھے مخاطب کر کے فرمایا:

''کہ قانون سازی کے کام کو اسلام کے رخ پر آپ چلنے نہیں دیتے اور غلط پر میں نہیں چلنے دوں گا نتیجہ یہ ہوگا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔''

چنانچہ یہی ہوا، گاڑی کھڑی رہی۔

مرکزی جمعیت علماء اسلام کی قیادت:

۱۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ مرکزی جمعیت علماء اسلام کے صدر منتخب ہوئے لیکن ۲۲ رنومبر ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحب کی وفات کے بعد جہاں دستوری مساعی کی دوسری ذمہ داریاں حضرت مفتی صاحب کے کاندھوں پر آپڑیں۔ اسی کے ساتھ جمعیت علماء اسلام کی صدارت بھی آپ کو سونپ دی گئی۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب مغربی پاکستان میں ایک اور جمعیت اسی نام سے قائم ہوچکی تھی۔ جس کا مرکزی جمعیت سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے اسلامی دستور کی جدوجہد کے ساتھ ہی شب و روز کی مساعی سے ان منتشر جماعتوں کو مرکز سے مربوط کیا اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ خاص حضرت اقدس مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور نے اس شرط پر صدارت قبول

فرمائی کہ جمعیت کی ذمہ داری کا تمام کام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ انجام دیں اور اس قصد کے لئے حضرت مفتی صاحب کو جمعیت کا قائم مقام صدر بنادیا گیا۔ جتنے سرکاری اداروں میں آپ بحیثیت ممبر شریک ہوئے ان سب میں آپ نے اپنی شرکت کی، یہ شرط ارباب حل وعقد سے ہمیشہ منوائی کہ ہم پر عوامی تقریر وتحریر پر وہ پابندیاں عائد نہیں ہوں گی جو سرکاری ملازمین پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ صدارت جمعیت علماء اسلام سے پہلے اور بعد میں آپ نے جمعیت کی جانب سے تحریک دستور اسلامی کے لئے مشرقی ومغربی پاکستان کے طول وعرض کے بار بار دورے کئے اور ضلع ضلع میں پہنچ کر اسلامی دستور کے لئے عوامی شعور کو بیدار کیا۔

مغربی پاکستان کا ایک دورہ جو ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء سے ۳ر ۱۹۵۶ء تک جاری رہا اس میں حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کو بھی شرف ہمرکابی حاصل ہوا۔ قائم مقام صدر جمعیت علماء اسلام کی حیثیت سے آپ نے تقریباً ۳ سال تک جمعیت کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی مساعی جاری تھیں کہ ملک میں انقلاب آیا اور جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے مارشل لگا کر تمام جماعتوں کو کالعدم قرار دیدیا، دورانِ مارشل لاء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر جمعیت علماء اسلام بھی رحلت فرماگئے۔ پھر جب مارشل لاء ہٹا اور جماعتیں دوبارہ منتظم ہوئیں تو جمعیت علماء اسلام کے نام سے بعض علماء کرام نے ایک نئی تنظیم قائم فرمائی۔ اس لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اصل جمعیت علماء اسلام کی تنظیم جدید کرنے سے باز رہے تاکہ علماء کرام کے مابین تفرقہ پیدا نہ ہو اور پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے انفرادی طور پر علمی وعملی میدانوں میں کوشش فرماتے رہے جس کی تفصیل بہت زیادہ ہے اس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کچھ پہلے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور

سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی ہوگئے۔ اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لئے پروپیگنڈہ اور جلسے جلوس عام ہوگئے تو اس مسئلہ کی نزاکت نے پھر حضرت مفتیِ اعظم کو مرکزی جمعیت علماءِ اسلام کے احیاء پر مجبور کردیا کیونکہ ضابطہ میں قائم مقام صدر آپ ہی تھے۔ چنانچہ مغربی ومشرقی پاکستان کے تمام ارکان جمعیت کا اجلاس بلاکر جمعیت کی صدارت تو حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی طرف منتقل فرمادی اور خود کسی عہدے کے بغیر مرکزی جمعیت علماءِ اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو بنیادی خلیج حائل ہے، اسے تحریر وتقریر کے ذریعہ واضح فرمایا۔ آپ نے ایک رسالہ ''اسلام کا نظام تقسیم دولت'' اور دوسرا رسالہ ''اسلامی نظام میں معاشی اصطلاحات کیا ہوں گی؟'' اسی دور میں تصنیف فرمائے۔ جو کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔ تقریباً ایک سال اس جدوجہد میں صرف ہوا۔ جس سے مسئلہ کی وضاحت تو بحمداللہ پوری طرح ہوگئی مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور وزر کام کرتے ہیں۔ انتخابات کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا آگیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر)

تاسیسِ دارالعلوم کراچی:

ہجرت پاکستان کے بعد حضرت مفتیِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو کاموں کو اپنا مقصد زندگی بنالیا تھا۔ ایک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد، دوسرے کراچی میں یہاں کے شایانِ شان دارالعلوم کا قیام، ابتدائی دو سال تو قراردادِ مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد جو انتہائی بے سروسامانی میں ہورہی تھی اسی کی مشغولیت اتنی رہی کہ دارالعلوم کے قیام میں کامیابی نہ ہوسکی۔ فتاویٰ کا مشغلہ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد بھی آپ کا جزوِ زندگی بنا رہا مگر اس عرصہ

میں جو فتاویٰ لکھے گئے وہ کسی رجسٹر میں نقل کئے بغیر روانہ کر دیئے جاتے تھے۔ نقل کا کوئی انتظام نہ تھا البتہ نہایت اہم اور منتخب فتاویٰ آپ خود ہی ایک رجسٹر میں نقل فرمالیا کرتے تھے۔

جیکب لائن سے آپ کی رہائش آرام باغ کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہوئی تو مسجد باب السلام کے احاطہ میں دروازہ کے اوپر آپ نے ایک کمرہ دارالافتاء کا تعمیر کرایا تاکہ فتویٰ حاصل کرنے والوں کو سہولت ہو۔ نقل فتویٰ اور دارالافتاء کے انتظام کے لئے ایک صاحب کو تنخواہ پر رکھ لیا اور فارسی، وعربی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لئے مولانا فضل محمد صاحب سواتی اور مولانا امیر الزماں صاحب کشمیری کو مقرر فرمایا۔ یہ دونوں حضرات حضرت مفتی صاحب کے شاگرد ہیں۔ اسی سال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ محلہ نانک واڑہ میں سکھوں کے زمانے کے ایک اسکول کی خالی عمارت دارالعلوم کے لئے عطا فرمادی، حضرت مفتی صاحب نے اپنے داماد جناب مولانا نوراحمد صاحب کو ساتھ لے کر چندے کی اپیل یا ساز وسامان کے بغیر نہایت سادگی سے اس عمارت میں مدرسہ قائم فرمادیا۔ ایک استاذ اور چند طلبہ سے اس مدرسہ کا محض اللہ کے بھروسہ پر آغاز ہوا۔ اس وقت تک کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے سوا کوئی مدرسہ نہ تھا، پورے پاکستان میں گنے چنے ہی مدارس تھے علوم دینیہ کے طلبہ پریشان تھے یہ مدرسہ کھلا تو ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ آنے شروع ہو گئے اور چند مہینے کے اندر اندر یہی مدرسہ ''دارالعلوم کراچی'' بن گیا اب دارالافتاء بھی یہیں منتقل ہو گیا۔

حضرت مفتی صاحب کا جو وقت دستوری جدوجہد سے بچتا تھا وہ درس وفتویٰ اور دارالعلوم کی انتظامی نگرانی میں یہیں صرف فرمانے لگے۔ حضرت مفتی صاحب دارالعلوم کے صدر تھے۔ اور آخر تک صدر رہے۔ جناب مولانا نوراحمد صاحب دارالعلوم کے سب سے پہلے ناظم تھے جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی

ہیں وہ نہایت ہی جانفشانی سے دار العلوم کا انتظام کئی سال تک چلاتے رہے۔

دار العلوم کے ہر شعبہ میں کام جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا اس کے سامنے موجودہ عمارت بہت تنگ محسوس ہونے لگی۔ ادھر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد حضرت مفتی صاحب کی دلی تمنا تھی کہ ان کی یادگار کے طور پر ان کے شایانِ شان دار العلوم قائم ہو۔ اس کے لئے وہ احاطہ زمین جس میں حضرت شیخ الاسلام کا مزار ہے، شب و روز کی جدوجہد سے باضابطہ حاصل فرمایا اور دار العلوم کو وہیں منتقل کرنے کے خیال سے نقشہ منظور کرا کے تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ مگر بعض لوگوں کی مزاحمت کے باعث کھودی ہوئی بنیادیں اس حال میں محض جھگڑا ختم کرنے کیلئے چھوڑ کر نانک واڑہ تشریف لے آئے۔ حکومت اور رفقاء کار نے بہت زور دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے۔ مگر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"دار العلوم بنانا فرض کفایہ اور مسلمانوں کو جھگڑے سے بچانا فرض عین ہے فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ میں لگنا دین کی صحیح خدمت نہیں میں جھگڑا مول لے کر یہاں ہرگز دار العلوم نہ بناؤں گا۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے کورنگی میں حضرت مفتی صاحب کو چھپن ایکڑ زمین دار العلوم کے لئے عطا فرما دی۔ تو جدید تعمیرات بقدرِ ضرورت مکمل ہو جانے کے بعد دار العلوم یہاں منتقل فرما دیا۔ اور نانک واڑوی عمارت میں دار العلوم کے چند شعبے رہ گئے۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رُکنیت سے فارغ ہو جانے کے بعد آپ کی مصروفیات دار العلوم میں بڑھتی چلی گئیں۔ پھر جب جنرل محمد ایوب خان کی حکومت آئی اور عوامی سطح پر اسلامی دستور و قانون کے لئے جدوجہد کے راستے مسدود ہو گئے تو آپ کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دار العلوم بن گیا اور لسبیلہ چوک کے پاس اپنا ذاتی کشادہ مکان جو نہایت شوق و محنت سے کتنی ہی تکلیفیں جھیل کر اپنی ضروریات

کے مطابق تعمیر کیا تھا اسے چھوڑ کر مستقل رہائش دارالعلوم کے احاطہ کورنگی ہی میں اختیار فرمائی اور یہاں کئی سال تک کھپریل کی چھت کے صرف دو کمروں میں بسر ہوئے۔ زندگی کے آخری لمحات تک درس وفتویٰ، اصلاح وارشاد اور انتظام دارالعلوم میں مشغولیت رہی۔ احاطۂ دارالعلوم کے اسی مکان میں ۱۰ رشوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۶ را کتوبر ۱۹۷۶ء میں رحلت فرمائی اور احاطۂ دارالعلوم ہی کے قبرستان میں اب محو آرام ہیں، ناریل کے اُن درختوں کے سایہ تلے جو پندرہ سال قبل خود کھڑے ہو کر لگائے تھے۔ بہر حال مفتی اعظم قدس سرہ کے خلوص وللّٰہیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دارالعلوم کو دنیا کے عظیم دینی مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا اور پاکستان کے عظیم ترین دینی اداروں میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے دارالعلوم اور دین کے مختلف شعبوں میں اس کی عظیم الشان خدمات حضرت مفتی اعظم کا ایسا صدقہ جاریہ ہے جو انشاءاللہ صدیوں باقی رہیگا۔

دارالعلوم کی مفصل تاریخ اسکی خدمات کا جائزہ اور اس کے مختلف شعبوں کا تعارف اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اس کی کچھ تفصیلات ماہنامہ البلاغ کراچی مفتی اعظم نمبر میں ملاحظہ فرمائیے۔

تصانیف وتالیفات:

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی جہاں دوسری دینی وعملی خدمات مسلّم ہیں۔ وہاں تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی آپ کا ایک مستقل محبوب مشغلہ تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت کی تصانیف اکثر اردو میں اور کئی عربی زبان میں ہیں۔ تصانیف کی کل تعداد ایک سو باسٹھ ہے۔ صرف فقہی موضاعات پر آپ کی پچانوے تصانیف ہیں یہاں صرف ان کی چند ممتاز تصانیف کا ذکر پیش خدمت ہے۔

تفسیر وحدیث: ۔ تفسیری خدمات میں ''تفسیر معارف القرآن'' ۸ جلدوں میں

ایک مشہورِ زمانہ تفسیر ہے۔ جس کی اس دور میں نظیر نہیں ہے۔ ''احکام القرآن'' عربی دوجلدوں میں فقہی دلائل کا خزانہ ہے۔ حدیثی خدمات میں تقریر ترمذی، اکابر علماء دیوبند کا سلسلۂ اسنادِ حدیث، مختصر چہل حدیث، اسلامی معاشیات پر چہل حدیث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فقہ۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، امداد المفتیین، اسلام کا نظامِ اراضی، آلاتِ جدیدہ، مسئلہ سود، آداب المساجد، تصویر کے شرعی احکام، بیمۂ زندگی اور ''جواہر الفقہ'' وغیرہ فقہی کتب ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے رسائل فقہی مسائل پر شائع ہوئے ہیں۔

عقائد وکلام:۔ ایمان وکفر قرآن کی روشنی میں، ''مقام صحابہ''، ''ختم نبوت کامل، نزول المسیح عربی، ہدیۃ المھدیین فی آیات خاتم النبین عربی، ممالک اسلامیہ سے قادیانیوں کی غداری، مشرق اور اسلام، سنّت وبدعت وغیرہ۔

معیشت وسیاست:۔ اسلام کا نظام تقسیم دولت، اسلامی نظام میں معاشی اصطلاحات، دستور قرآنی، اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق، ووٹ کی شرعی حیثیت، سرمایہ داری، سوشلزم اور اسلام، خطبۂ صدارت کل ہند جمعیت علماء اسلام حیدرآباد کانفرنس، افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ، جہاد پاکستان، اور وحدتِ امت وغیرہ وغیرہ۔

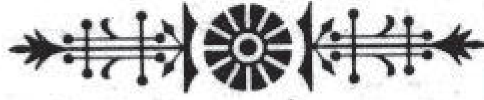
سیرت وتاریخ:۔ سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شہادت کائنات شہید کربلا، ذوالنون مصری، فتوح الہند، دوشہید اور درسِ عبرت وغیرہ۔

اصلاح وارشاد:۔ گناہ بے لذت، گناہوں کا کفارہ، بسم اللہ کے فضائل، روحِ تصوف، مصیبت کے بعد راحت، ذکراللہ اور درود وسلام کے فضائل، آداب الشیخ والمرید، خلاصہ وتسہیل قصد السبیل، دل کی دنیا، ملفوظات امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، مقدمہ حیوۃ المسلمین۔

تعلیم وتبلیغ :۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ،قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ،طلبہ کے نام دو اہم پیغام اور وصیت نامہ وغیرہ۔

زبان وادب۔ کشکول اردو و فارسی ،کلام نظم ونثر ،کلیاتِ عربی نظم ونثر کا مجموعہ ،تحفۃ الوطن ،مکاتیب حکیم الامت ،دار العلوم دیو بند اور اس کا مزاج ومذاق ،تاریخی قربانی ، مقدمہ امداد الفتاویٰ ،مقدمہ فتاویٰ دار العلوم وغیرہ وغیرہ۔

(تفصیلی خدمات کے لئے البلاغ مفتی اعظم نمبر ملاحظہ فرمایئے)



از شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب

دارالعلوم کبیر والا

مفتیٔ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف وکمالات

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

حق تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جب ہوش سنبھالا تو اہل حق سے اپنا تعلق پایا علماء دیوبند سے محبت بچپن سے رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا۔ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اہل زیغ وضلال کی صحبت اور عقیدت سے حق تعالیٰ نے ابتداء ہی سے محفوظ ومصؤن فرمایا۔ ان اکابر سے خصوصاً والہانہ تعلق رہا جو مخزن علم ہونے کے ساتھ عمل صالح اور تقوی کے میدان میں آگے تھے اور علم نبوت کے ساتھ ساتھ ان کو نور نبوت بھی حاصل تھا انہیں، میں سے ایک حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شخصیت بھی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں ان کی بعض کتابوں سے منتفع ہوا۔ البلاغ کو اپنے نام جاری کرا کے اس کے مندرجات میں سے بالخصوص حضرت مفتی صاحب کی تحریروں سے دل ودماغ متاثر ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں میرے ساتھ ایک طالب علم رہتے تھے۔ جو سمجھدار تھے۔ مگر بعض سیاسی اُمور کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے۔ بلکہ حضرت سے ایک گونہ انکو اعراض اور عدم عقیدت سی ہوگئی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کوئی کتاب پڑھی اور کہنے لگے کہ مفتی صاحب کی تحریر میں اثر بہت ہے۔ میرا دل اُن کی فلاں کتاب پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ میں نے کہا باوجود بے تعلق ہونے کے آپ کی یہ گرویدگی مصنف کے اخلاص اور للّٰہیت کی دلیل ہے۔

ازدل خیز، بردل ریزد والی بات ہے۔ یہ تو وہم وگمان نہ تھا کہ مجھے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ میں پڑھانے کی سعادت نصیب ہوگی اور کافی عرصہ حضرت کی صحبت اور انفاسِ طیبہ سے مستفید ہونے کا موقع میسر آئے گا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس کے اسباب اس طرح مہیا فرمائے کہ شوال ۱۳۸۹ھ میں جب میں دارالعلوم کبیر والہ سے فارغ ہوا تو میرے مربی واستاذ مولانا محمد سرور صاحب مدظلہم کے واسطے سے میرا تقرر حضرت مفتی صاحب کے مدرسہ دارالعلوم میں ہوگیا۔

فتویٰ میں احتیاط اور مفتیوں کو نصیحت

میں تدریس کے دوران تھوڑا بہت فتوے نویسی کا کام بھی کرتا تھا۔ جب کسی فتوے میں کوئی بات قابلِ اصلاح ہوتی تو بندہ کو کسی طالب علم کے ذریعہ سے پیغام بھیجتے کہ اسباق سے فراغت کے بعد مجھ سے مل لیں۔ میں فارغ ہوکر حاضر ہوتا تو تفہیم فرمادیتے۔ ایک دفعہ نصیحت فرمائی کہ مفتی کو ہمیشہ اس امر کا خصوصی طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کے فتوی سے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہوجائے۔ نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا چاہئے، کتب کے طرف مراجعت کے ساتھ ساتھ موقع اور محل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل**۔

ایک دفعہ فرمایا کہ مفتی کو فتویٰ دیتے وقت عوام الناس کی سہولت کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور تاحدِّ امکان ان کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کرنی چاہئے۔ لیکن اپنے ذاتی عمل میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اس پر یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں یہ مسئلہ نکلا کہ ولایت سے جو کپڑا آتا ہے اس میں چمک پیدا کرنے کے لئے چربی استعمال کی جاتی ہے اور وہ چربی یقیناً مردار کی ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں سے درآمد ہونے والے کپڑے ناپاک اور ان کے بغیر دھوئے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی اس بارہ میں استفسار کیا گیا تو

چونکہ یہ امر ناجائز نہ تھا اس لئے آپ نے عوام الناس کی سہولت کے پیش نظر یہ فتویٰ دیا کہ کپڑے پاک ہیں۔ اور بغیر دھوئے ان میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ مگر اپنے عمل میں احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ جب غیر ملکی کپڑے خریدنے اور پہننے کا اتفاق ہوا تو پہلے اس کو دھلوالیا اور پھر پہنا۔

ایک دفعہ یہ بھی نصیحت فرمائی کہ مفتی کو چاہئے کہ جن مسائل کا تعلق اپنی ذات سے ہو ان مسائل میں دوسرے علماء سے استفسار کرے اپنے نفس پر اعتماد نہ کرے کیوں کہ نفس کے کیدِ خفی کا اندیشہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ نے فقہ میں غیر معمولی مہارت عطا فرمائی تھی۔ مگر اس کے باوجود اپنے ذاتی مسائل کے بارے میں فتوے دوسری جگہ دیوبند، سہارنپور سے منگواتے تھے۔ کئی دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذاتی مسائل میں مجھ سے استفتاء کیا میں نے جواب لکھا۔ حضرت نے جواب پر خوشی اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔

اوقات کی قدر

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اوقات کی پابندی کا بہت اہتمام تھا۔ وقت کی بڑی قدر کرتے۔ یہ چیز آپ کو اپنے شیخ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوئی تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اکابر خصوصاً حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے جو دین کا اس قدر کام لیا تو اس کا حقیقی سبب تو فضل خداوندی ہے۔ مگر ظاہر میں سبب یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اوقات کی بہت قدر کرتے ایک منٹ بھی ضائع نہیں فرماتے تھے۔ بسا اوقات گھڑی کو ہاتھ میں پکڑے رہتے اور اس پر نظر رہتی، ایک ایک منٹ کا حساب لگاتے اور اس کو ضائع ہونے سے بچاتے۔ ہر کام کے لئے وقت مقرر تھا۔ اور ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتے تھے۔

عیدالاضحیٰ کا دن تھا جس کو عام لوگ حتی کہ اہل علم بھی چھٹی اور آرام کا دن سمجھتے ہیں اور اپنے کام کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ شام کے وقت چند نوجوان اہلِ علم دارالعلوم کے اساتذہ حضرت کے پاس جمع تھے۔ حضرت نے ہر ایک سے استفسار فرمایا کہ آج تم نے کیا کیا علمی کام سرانجام دیا ہے؟

تقریباً سب کا جواب یہی تھا کہ آج تو کام کرنے کا موقع نہیں ملا، گہما گہمی میں ہی وقت گزر گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نوجوانوں کے لئے کہتا ہوں کہ میں بوڑھے نے آج بھی معارف القرآن کے دس ورق (فیما اظن) لکھے ہیں۔

مدرسہ کے اساتذہ کے حقوق کا خیال

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے مدرسہ کے اساتذہ کرام کا بڑا احترام تھا ان کی راحت رسانی کی بہت فکر کرتے۔ چنانچہ جب میں دارالعلوم کراچی میں تھا تو ایک خطیر رقم خرچ کر کے مدرسین کے لئے سوئی گیس کا انتظام کیا۔ حضرت کو اس بات کا اہتمام رہتا تھا کہ مدرسہ کے اساتذہ اپنے اکابر کے طرز پر ہوں، مخلص ہوں، دین کی نشر واشاعت ان کا مقصود ہو۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میری زیادہ تر یہ خواہش رہتی ہے کہ مدرسہ میں چند اللہ والے جمع ہو جائیں اگرچہ وہ زیادہ محقق نہ ہوں۔ جس مدرس کا مقصود تنخواہ لینا ہو اس کو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی اصطلاح میں پیشہ ور مولوی فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ماہِ رمضان المبارک میں زیارت کے لئے میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ ہم نے مدرسین کا مشاہرہ کافی بڑھا دیا ہے اگر آپ بھی یہاں ہوتے تو آپ کا مشاہرہ بھی کافی بڑھ جاتا۔ میں نے عرض کیا کہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یہاں نہیں رہ سکا۔

پھر فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ مدرسین کا مشاہرہ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ ہو تا کہ وہ اپنی معاش سے مطمئن ہو کر کام کریں۔ اگر مشاہرہ کم ہو تو مدرسین کہیں

امامت خطابت، ٹیوشن وغیرہ تلاش کرتے ہیں۔ پھر ایک معروف مدرسہ کے متعلق افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں باوجود وسعت کے مدرسین کی تنخواہیں کم ہیں اور مدرسین پریشان رہتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مفتی صاحب رحمہُ اللہُ تعالیٰ کے ایک صاحبِ ثروت دوست نے افریقہ سے ایک بڑی رقم دارالعلوم کے اساتذہ کے لئے بطور ہدیہ بھیجی۔ حضرت مفتی صاحب رحمہُ اللہُ تعالیٰ نے ہر مدرس کو علیحدہ علیحدہ بلا کر اس کے منصب اور اس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے رقم عطا فرمائی۔ مجھے اور دارالعلوم کے ایک مدرس کو اکھٹے بلایا اور ہم میں سے ہر ایک کو دوصد روپیہ عنایت کیا۔ اور یہ وضاحت بھی فرمائی کہ یہ رقم افریقہ سے آپ لوگوں کے لئے آئی ہے۔ اور معطی نے یہ تاکید کی ہے یہ رقم دارالعلوم کے اساتذہ کو ہدیۃً دی جائے کسی اور مد میں اس کو خرچ نہ کیا جائے۔

مدرسین کو نصیحت اور مدرسہ کے حقوق کا خیال

حضرت مفتی صاحب رحمہُ اللہُ تعالیٰ دورانِ سال میں بعض اوقات تمام مدرسین کو جمع کرتے، بالخصوص اسباق شروع ہونے سے پہلے ان کو نصیحت فرماتے۔ فرضِ منصبی کا احساس دلاتے۔ اخلاص کی تلقین کرتے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ بعض مدرسین مدرسہ سے تنخواہ تو پوری وصول کر لیتے ہیں مگر مدرسہ کی طرف سے جو کام ان کے ذمہ ہوتا ہے اس کو پورا نہیں کرتے۔ کبھی سبق میں دیر سے پہنچتے ہیں۔ کبھی بلا وجہ سبق کا ناغہ کر دیتے ہیں۔ کبھی سبق میں بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں کرتے ہیں۔ جس سے سبق کی کمیت اور کیفیت کا نقصان ہو جاتا ہے یہ سب باتیں امانت و دیانت کے خلاف ہیں۔ خیانت اور تطفیف میں داخل ہیں۔

ایک دفعہ جب کہ بعض مدرسین نے کتابوں کو مقامِ درس تک نہ پہنچایا تو حضرت رحمہُ اللہُ تعالیٰ کو بہت افسوس ہوا اور ناراضگی کا اظہار کرتے رہے اور اس

کے سدِ باب کے لئے مقامِ درس متعین کر کے کتاب کی سالم مقدار کو سال کے مہینوں پر تقسیم کرادیا۔ اور ہر ماہ کی مقدار متعین کرادی۔ اور مدرسین پر ایک بڑے استاذ کو نگران مقرر کردیا۔ جن کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ وہ ہر ماہ کے بعد جانچ کریں کہ مدرسین نے مقدار کو پورا کیا یا نہیں؟

مدرسین کو جب جمع فرماتے تو نصیحتوں کے ساتھ ساتھ چائے سے بھی مدرسین کی تواضع کرتے۔ اسی قسم کی ایک مجلس میں مدرسین کو امانت و دیانت کی تلقین فرمائی اور خیانت سے ڈرایا۔ اور اس مناسبت سے سیّدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ سُنایا، کہ آپ نے سیدنا حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کا امیر مقرر فرمایا، ایک دفعہ آپ شام تشریف لے گئے اور دل میں خیال پیدا ہوا کہ ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں کے امیر ہیں۔ شاید آپ نے مال ومنال اور زیب وزینت کا سامان جمع کر رکھا ہو تو اس امر کی تحقیق کے لئے آپ نے یہ تجویز اختیار فرمائی۔ کہ آپ نے سیّدنا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر چلوں اور وہاں کچھ دیر آرام کروں۔ تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا خوشی سے تشریف لے چلیں۔

چنانچہ آپ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ اور گھر میں داخل ہونے کے بعد گھر میں مجتسسانہ نگاہ ڈالی مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ اتنے بڑے حاکم اور امیر کے گھر کسی قسم کا سامان موجود نہیں۔ صرف زمین پر بچھا ہوا معمولی سا بچھونا ہے۔ جس پر وہ آرام کرتے تھے۔ ایک پیالہ جس میں وہ کھانا کھاتے تھے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رقت طاری ہوئی۔ کہ ان کے گھر میں زیب وزینت کا سامان تو بجائے خود رہا، ضرورت کا سامان بھی نہیں ہے۔ پھر آپ نے سید حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان حرف بحرف صحیح نکلا کہ ''امین ھٰذہ الامۃ ابو

عبیدہ بن الجراح"۔ جب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ سنایا تو حضرت اور مدرسین پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ اور بعض آبدیدہ ہو گئے۔

ایک دفعہ آپ نے مدرسین کے لئے اس ضابطہ کا اعلان کیا کہ اگر کوئی مدرس کسی مجبوری کی وجہ سے دیر سے پہنچے۔ تو زیادہ دس منٹ کی تاخیر معاف ہے اس سے زیادہ تاخیر چھٹی میں محسوب ہوگی۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ جبکہ میں حضرت کے پاس اکیلا تھا اپنا واقعہ سُنایا کہ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری سالوں میں بعض عوارض کیوجہ سے امور مفوضہ کے ادا کرنے کے لیے پورا وقت نہ دے سکتا تھا، کچھ کوتاہی ہو جاتی تھی اور تنخواہ بھی مجھے پوری مل جاتی تھی۔ مگر مجھے اس کا شدت سے احساس تھا۔ جب میں دارالعلوم سے علیحدہ ہوا تو مجھے بڑی فکر ہوئی کہ مدرسہ کا حق میرے ذمہ ہے اس کے ادا کرنے کی کیا صورت ہو اس وقت میرے پاس زائد سرمایہ بھی نہ تھا جو مدرسہ میں داخل کر دیتا۔ ہاں ایک ذاتی کتب خانہ کافی مالیت کا تھا۔ وہ میں نے مدرسہ میں داخل کر دیا اور مدرسہ کے حق سے سبکدوش ہوا اور اس کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ انتہی کلامہ۔

اہل اللہ چونکہ اپنے نفس سے بدگمان رہتے ہیں اس لیے آپ نے اپنی معمولی کوتاہی کو بڑی کوتاہی سمجھا اور بالآخر اس کا تدارک کر کے چھوڑا۔ اہل درس وتدریس کو اس وقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

مفتی صاحب کی اصلاحی مجلس

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جہاں علم وفقہ کے میدان میں سباق الغایات تھے وہاں طریقت اور تصوف میں بھی حق تعالیٰ نے ان کو اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ تب ہی تو مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اور خلق خدا کی اصلاح کے لئے آپ کو بیعت وتلقین کی اجازت دی بلکہ مامور

فرمایا۔ چنانچہ آپ اسی اصلاحِ خلق کے جذبہ سے اتوار کے دن ایک مجلس منعقد فرماتے تھے۔ اس زمانہ میں حکومت کی طرف سے اتوار کی چھٹی ہوا کرتی تھی اور اتوار کا دن بھی اسی مصلحت سے تجویز کیا گیا تاکہ سرکاری ملازمین بھی اس مجلس میں حاضر ہوسکیں۔ کبھی کبھی مختصر طور پر جمعہ کے دن بھی یہ مجلس ہوجاتی تھی۔ اتوار کی مجلس میں مختلف مقامات سے لوگ حاضر ہوکر روحانی پیاس بجھاتے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نصائح اور ملفوظات سے بہرہ ور ہوتے۔ اس مجلس میں زیادہ تر ارشادات اصلاحِ باطن کے متعلق ہوتے۔ خوف خدا اور فکر آخرت کا بیان ہوتا، اتباعِ سنت کی تلقین ہوتی، حقوق العباد کے ادا کرنے کی تاکید ہوتی۔

حاضرینِ مجلس حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات سے متاثر ہوتے۔ عزم وہمت میں قوت پیدا ہوجاتی۔ خصوصاً خوفِ خدا اور فکر آخرت کے متعلق بیان کرتے تو مجلس پر خوف کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ اور بعض کی چیخیں تک نکل جاتیں۔ یہ مجلس بہت پرکیف اور پرانوار ہوتی۔ افسوس کہ اب ہم اس مجلس سے محروم ہیں۔ اور اب تو ایسی مجالس بہت کم رہ گئیں، جو شاذ ونادر رہ گئیں وہ غنیمت کبریٰ ہیں ان کی قدر پہنچاننی چاہئے، اپنی اس مجلس کے متعلق ایک دفعہ فرمایا کہ بغیر سخت مجبوری کے میں اس کا ناغہ نہیں کرتا۔ حاضرین کو تو خدا جانے نفع ہوتا ہے یا نہیں مگر میں اپنے اندر تو فائدہ محسوس کرتا ہوں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو لوگ آتے ہیں ان کا مقصود دین کا نفع حاصل کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ مخلص ہوتے ہیں۔ اور چند مخلصین کے مل بیٹھنے کی برکت سے حق تعالیٰ مجھ کو بھی نفع پہنچاتے ہیں۔ اور انشاء اللہ العزیز مجھے توقع ہے کہ آنے والوں کو بھی نفع ہوتا ہوگا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ باقاعدہ اس مجلس میں آتے، ان کی حالت روز بروز بدلتی چلتی۔ ایسے بہت سے افراد دیکھے گئے جن کی دینی حالت اچھی نہیں تھی۔ انگریزی وضع قطع، انگریزی لباس میں ملبوس تھے شکل وصورت بھی اسلام کے خلاف تھی۔ مگر جب باقاعدہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس

میں آنے لگے تو بغیر اس کے کہ حضرت ان کے افعال پر نکیر کرتے یا خصوصی خطاب سے تنبیہ کرتے خود بخود ان کی حالت درست ہوتی چلی گئی۔ وضع قطع شکل وصورت درست ہوگئی، لباس ومعاشرت شریعت کے مطابق ہوگئی۔ جو حضرات باقاعدہ اس مجلس میں آتے رہے اور اپنی اصلاح کا اہتمام رکھا۔ اور اپنے اخلاق واعمال کو درست کیا۔ ان میں سے جن کو حضرت نے اصلاح خلق کا اہل سمجھا ان کو بیعت وتلقین کی اجازت دی۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میں اپنی علمی مصروفیتوں کی وجہ سے توسیع سلسلہ کی طرف توجہ نہیں کرسکا جو کچھ تھوڑا بہت ہورہا ہے حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے شیخ کی طرح بیعت کرنے میں تعجیل نہیں فرماتے تھے۔ آپ کی نظر صورت بیعت سے زیادہ اعتقاد وانقیاد شیخ ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت اپنی مجلس میں تشریف رکھتے تھے ایک شخص حاضر ہوئے اور کہنے لگے حضرت! مجھے بیعت فرمالیں۔ حضرت نے کچھ انکار کیا تو کہنے لگے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ نے مجھے فرمایا کہ مفتی محمد شفیع سے بیعت ہوجاؤ۔ آپ نے فرمایا بیعت صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے کا نام نہیں، آپ میری مجلس میں آتے رہیں، اور میری باتیں سنتے رہیں۔ اگر آپ کو فائدہ محسوس ہونے لگا اور باہمی مناسبت ہوگئی تو مجھے بیعت کرنے سے انکار نہ ہوگا۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مصروف ترین علمی شخصیت تھے ان کو خطابت وتقریر سے زیادہ شغف اور لگاؤ نہ تھا مگر اس کے باوجود آپ ایک اچھے خطیب اور مقرر بھی تھے۔ مگر آپ کی تقریر ظاہری شوکت سے زیادہ معنویت کی حامل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ خود فرمایا کہ جادو بیان مقرر نہیں ہوں مگر بالکل گونگا بھی نہیں ہوں۔ جب آپ کی صحت وقوت اچھی تھی تو ہفتہ کے دوران میں مغرب کے بعد

ایک دفعہ مدرسہ کے طالب علموں کے سامنے بیان فرماتے۔ عموماً سوموار کی شب مغرب کے بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیان کا اعلان کر دیا جاتا۔ نماز کے بعد طلبہ مسجد میں بیٹھ جاتے۔ اور بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ مجھے بھی ان بیانات کے سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ تقریریں بڑی عالمانہ اور محققانہ ہوتی تھیں۔ اور حضرت نہایت دل سوزی اور خیر خواہی کے جذبہ سے بیان فرماتے۔ طالب علموں کو دینی و علمی ذوق عطا کرنے کی کوشش فرماتے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی بڑی لگن تھی کہ نوجوان طلباء و علماء میں اکابر جیسا دینی و علمی ذوق پیدا ہو۔ کئی دفعہ فرمایا کہ حرف شناس عالم تو پیدا ہو رہے ہیں مگر اکابر جیسا دینی ذوق اور علمی مزاج رکھنے والے اور ان کے طرز فکر کے امین بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ جب کسی تقریر یا مجلس میں اپنے اکابر کے علمی و عملی کمالات بیان فرماتے تو مردہ دلوں میں جان آجاتی۔ اور کاہل اور سُست آدمی بھی مستعد اور مستیقظ ہونے لگتا اور اکابر کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسی اپنی ذوق کے بارے میں ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نقل فرمایا کہ۔ بعض لوگ میرے پاس ملفوظات سننے آتے ہیں حالانکہ وہ طبع ہو چکے ہیں دورہ کر پڑھے جاسکتے ہیں۔ اور تحقیقات سننے آتے ہیں۔ تو وہ کتابوں میں موجود ہیں۔ میں اپنے متعلق تو نہیں کہتا۔ البتہ بزرگوں کے متعلق کہتا ہوں کہ ان سے حاصل کرنے کی چیز دینی ذوق ہے۔ یہ ذوق بہت بڑی چیز ہے۔ آج کل اسکی بہت کمی ہے۔ اسی ذوق کے متعلق فرمایا کہ ہم ایک دفعہ الحیلۃ الناجزہ کی تصنیف کے لئے مجنون کی بیوی کا حکم تلاش کر رہے تھے۔ اس کے متعلق ایک خاص جزیہ کی تلاش تھی حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو دکھایا حضرت بھی بہت متعجب ہوئے کہ صاف صاف مل گیا مگر بات دل کو لگتی نہیں۔ دوسرا نسخہ دیکھو۔ دوسرا نسخہ دیکھا گیا تو بجائے مجنون کے محبوب کا لفظ تھا۔ اس موقع میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے علمی ذوق نے کام دیا۔ اور ایک زبردست لغزش سے حفاظت ہوگئی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا استغناء

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ جہاں خوش اخلاق، متواضع اور نرم خو تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو استغناء کی صفت سے بھی نوازا تھا جو ایک فقیہہ کے لئے ازروئے حدیث ضروری صفت ہے:

نعم الرجل الفقيه ان احتيج اليه نفع وان
استغنى عنه اغنى نفسه . (الحديث).

خود فرماتے تھے کہ امراء اور دولت مندوں سے مستغنی رہتا ہوں۔ اگر وہ مدرسہ کی امداد کرتے ہیں تو اس میں مجھ پر ان کا کوئی احسان نہیں خود اپنی ذات پر احسان کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی بڑے سے بڑا دولت منداور امیر ہو میں اس کی خوشامد نہیں کرتا۔

فرمایا ایک دفعہ نہایت متمول شخص نے مجھ سے کہا کہ میرے پاس سولہ ہزار روپیہ زکوٰۃ کا ہے کس کارخیر میں لگاؤں؟ میں نے اس کو زکوٰۃ کے مصارف بتادیئے مگر ایک خفیف سا اشارہ بھی اس طرف نہ کیا کہ ہمارا دینی مدرسہ بھی ہے جس کے طلبہ پر زکوۃ کی رقم خرچ ہوتی ہے۔

مدرسہ کے چندہ کے سلسلہ میں بھی حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ تھی کہ مدرسہ کی ضروریات کی اہل خیر کو عموماً اطلاع کردی جائے جو ایسے مواقع خیر کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر چندہ کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے اہل علم کی بے وقعتی ہو۔

فرمایا کہ جب میں تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہوا تو توکلاً علی اللہ نانک واڑہ میں مدرسہ کھولا مگر اسباب بالکل نہ تھے، میں نے طلبہ کو کہہ دیا تھا کہ پڑھانے کے لئے تو ہم حاضر ہیں مگر تمہارے قیام وطعام اور دیگر مصارف ہمارے پاس نہیں۔ جب اہل

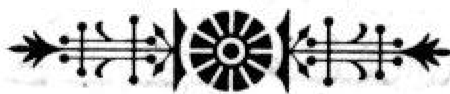
خیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو صرف تین آدمیوں نے کہا کہ آپ اخراجات کی فکر نہ کریں۔ وہ ہمارے ذمہ رہے۔ چنانچہ ایک سال کا خرچ چھتیس ۳۶ ہزار روپیہ صرف ان تین آدمیوں نے دے دیا۔

ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک میں برادرم مولانا محمد رفیع صاحب نے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا کہ مسجد دارالعلوم کے لئے دریاں نہیں ہیں۔ اگر رائے عالی ہو تو جمعہ کے اجتماع میں اپیل کروں؟ فرمایا بھائی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جتنا خرچ دریوں پر ہو آدھا میں دے دوں گا اور آدھا کہیں اور سے ہو جائے گا۔ چندہ کی اپیل نہ کریں۔ چنانچہ مولانا اپنے خیال سے رک گئے۔

اس استغناء کا اثر تھا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مدرسہ میں یہ ضابطہ بنا رکھا تھا کہ جو شخص طالب علموں کی دعوت کرے وہ طعام وغیرہ مدرسہ میں بھیج دے طالب علم دعوت کھانے کے لئے کہیں نہیں جائیں گے۔ کیوں کہ آج کل ایسا کرنے سے ایک تو طلبہ میں طمع پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا عوام بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میرے مدرسہ میں بڑے لائق و فائق مدرس پڑھاتے رہے اور بعض بغیر کسی وجہ کے مدرسہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض اوقات یہ خیال ہوتا کہ شاید ان کے جانے سے مدرسہ کی تعلیم کا نقصان ہو لہٰذا ان کی منت سماجت کروں۔ مگر ایسا نہیں کیا بلکہ کچھ کہہ سن کر دیکھ لیا جب نہ مانے تو اصرار نہیں کیا۔ اور ان کو رخصت کر دیا۔ بحمد اللہ کوئی نقصان بھی مدرسہ کا ان کے جانے سے نہ ہوا فرمایا کہ میں حق تعالیٰ سے ایک دعا کیا کرتا ہوں اور اس کے برکات بھی محسوس کرتا وہ دعاء یہ ہے

اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ عَمَّنْ اَغْنَیْتَہٗ عَنِّیْ مِنْ خَلْقِكَ۔



حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض وظائف فوائد اور لطائف

ایک استخارہ:

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کیا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ ایک استخارہ اپنے معمول میں رکھتے تھے۔اور وہ یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مندرجہ ذیل دعا چالیس مرتبہ پڑھ لیتے۔

یا حی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتك استغیث اصلح لی
شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفة عین

مفتی محمد شفیع نے فرمایا کہ میں نے بھی اس استخارہ کو اپنا معمول بنالیا ہے۔حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جو الٹا سیدھا کام کرتا ہوں درست ہو جاتا ہے۔

دو ۲ وظیفے

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۳۷۰ھ میں مجھے دو وظیفے بتلائے تھے وہ اب تک میرے عمل میں ہیں۔ایک وظیفہ تو وسعتِ رزق کے لئے ہے اور وہ وظیفہ اصل میں حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا معمول تھا۔وہ یہ کہ صبح کی نماز کے بعد ستر ۷۰ مرتبہ یہ آیت پڑھی جائے۔

اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ ط وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ.

(اول آخر درود شریف) اس وظیفہ کی برکت ہے کہ بحمد اللہ کبھی مالی تنگی پیش نہیں آئی۔

دوسرا وظیفہ حل مشکلات کے لئے ہے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ تین سو اکتالیس ۳۴۱ مرتبہ۔

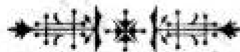
حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک نصیحت

ایک دفعہ میں حضرت کے پاس موجود تھا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیحت فرمائی کہ آپ احیاء العلوم دیکھا کریں۔ بالخصوص ربع مہلکات کا ضرور مطالعہ کریں۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ کو بھی دیکھا کریں۔ ان کے پڑھنے میں بہت نفع ہے۔ کیوں کہ یہ حضرت ابناء آخرت میں سے تھے ان کے کلام پڑھنے والے کو بھی آخرت کی فکر ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو نصیحت

اکابر نے خود اس امر کا اہتمام اور دوسروں کو بھی تاکید فرمائی ہے کہ قلب کو فضول خیالات سے خالی رکھا جائے بلکہ ضروری باتیں بھی بقدرِ ضرورت آنی چاہئیں۔ کیوں کہ اصل شئے قلب میں سمانے کی ذکر اللہ ہے۔ اسی بارہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شیخ کا واقعہ نقل کیا کہ ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ خانقاہ سے گھر تشریف لے جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں چلتے چلتے ٹھہر گئے۔ جیب سے کاغذ پنسل نکالا اور کچھ لکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا مولوی محمد شفیع تم بھی سمجھے؟ میں نے عرض کیا نہیں حضرت!

فرمایا ایک ضروری بات یاد آ گئی تھی۔ اس کو اپنی یادداشت میں نہ لکھ لیتا تو قلب میں بار بار کھٹکتی رہتی اور اس کو یاد کرنے کی فکر رہتی، قلب فارغ نہ رہتا میں نے قلب کا بوجھ کاغذ پر ڈال کر قلب کو فارغ کر لیا ہے۔ تاکہ جب کبھی ذکر کی توفیق ہو تو قلب ذکر کے لئے فارغ اور مستعد ہو۔ اور مجھے قلب کو فارغ رکھنے کا بڑا اہتمام ہے۔



علماء وطلباء کو نصیحت

ایک دفعہ طلبہ کو اخلاص کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی رضاء کے لئے پڑھو، پڑھاؤ۔ تمہاری دنیوی ضرورتیں بھی انشاءاللہ پوری ہوتی رہیں گی۔ پھر فرمایا میری پچھتر ۷۵ سال کی عمر ہے (اور اس وقت عمر اتنی تھی) میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے ایک عالم بھی ایسا نہیں دیکھا کہ جس نے اللہ کے لئے پڑھا اور پڑھایا ہو اور اللہ نے اس کو عزت وراحت کی زندگی عطا نہ کی ہو۔ اگر عالم ہو کر کوئی رسوا ہوا تو اپنی بد عملی سے ہوا۔

مولوی کی تعریف

ایک دفعہ فرمایا کہ مولوی کی تعریف حمد باری (جو فارسی کا ایک چھوٹا سا رسالہ) کے ایک شعر میں کر دی گئی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

علم مولےٰ ہو جسے ہے مولوی جیسے حضرت مولوی معنوی

پھر فرمایا کہ یہ تعریف ایک اور اعتبار سے ہے۔ میرے خیال میں مولوی وہ ہے جس میں اس قدر استعداد ہو کہ ہدایہ کے چاروں جلدوں میں جو جگہ اس کو بتلائی جائے اس کو حل کر کے سمجھا اور پڑھا سکے۔

قانون اور فضل کا فرق

ایک دفعہ مجلس میں یہ مضمون بیان فرمار ہے تھے کہ حق تعالیٰ کا قانون تو یہ ہے کہ جو مسلمان گناہوں میں مبتلا رہا ہو آخرت میں اس کو سزا ملے گی۔ اور سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔ لیکن اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو سزا نہ دیں اور ابتداء ہی جنت میں داخل فرمادیں تو ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ یہ محض ان کا فضل ہوگا۔ قانون نہیں ہوگا۔ مسلمان کو چاہئے کہ فضل کے بھروسہ پر گناہوں میں مبتلا نہ رہے۔

بلکہ قانون کا خوف کر کے گناہوں کو چھوڑ دے پھر قانون اور فضل میں فرق بتلاتے ہوئے ایک قصہ بیان فرمایا کہ۔

ایک بادشاہ نے اپنے ایک وزیر کو کہا کہ تم نے ہمیں کبھی اپنا گھر نہیں دکھایا حالانکہ ہمیں تمہارا گھر دیکھنے کا اور تمہارے چھوٹے بچے دیکھنے کا شوق ہے۔ وزیر نے عرض کیا کہ میرا گھر کیا ہے وہ آپ ہی کا گھر ہے جب دل چاہے تشریف لے چلیں، یہ سن کر بادشاہ نے آنے کا ایک دن مقرر کر دیا۔ وزیر نے اپنے گھر کو خوب مزین کیا اور اپنے بچوں کو بار بار سمجھا دیا کہ بادشاہ سلامت آئیں گے، وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم نہایت باادب ہو کر ان کے سامنے بیٹھنا۔ کسی قسم کی بات نہ کرنا شاید تمہاری زبان سے کوئی بے ادبی کی بات نکل جائے۔ مگر بچے کو جتنا سمجھایا جائے پھر بھی وہ بچہ ہی ہوتا ہے۔

جب بادشاہ آیا اور بچوں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ ان کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اور ان میں سے ایک بچے نے بادشاہ کو ایک غلیظ سی گالی دے دی۔ وزیر کے اوسان خطا ہو گئے کہ اب میری بھی خیر نہیں۔ جلدی سے بھاگا ہوا گھر سے تلوار لے آیا اور اس سے بچے کو بہت ڈرایا دھمکایا۔ اور بادشاہ کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ میں اس تلوار سے مارنا چاہتا ہوں۔ مگر بادشاہ نے کہا یہ چھوٹا بچہ ہے۔ اس کی گالی پر مجھے کوئی ناراضگی نہیں۔ بلکہ میں اس گالی کے عوض میں اپنی حکومت کی جانب سے اس کا وظیفہ مقرر کرتا ہوں۔ جب تک یہ زندہ رہے وظیفہ اس کو ملتا رہے گا۔ جو کافی مقدار میں تھا۔ یہ قصہ سُنا کر مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ گالی کے عوض میں وظیفہ ملا کرے یہ قانون نہیں بلکہ محض فضل ہے

بیگم بازار کا قصّہ

ایک دفعہ اس حدیث شریف کے متعلق بیان فرما رہے تھے: ما نحل والد

ولدہ من نحل افضل من ادب حسن ۔(الحدیث) ''یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دیا۔''

فرمایا کہ آج کل لوگ اس کی تو بہت فکر کرتے ہیں کہ اولاد کو کھانے کمانے کے قابل بنادیں، یا ان کے لئے کوئی جائیداد چھوڑ جائیں۔ مگر اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے کہ اولاد کے اخلاق واعمال کو درست کریں، بری صحبت اور برے اخلاق سے ان کو بچائیں۔ علم وتہذیب سکھائے بغیر لاکھوں روپے کی جائیداد ان کے لئے چھوڑ جانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ والدین کے بعد چند دنوں میں اس کو اڑا دیتے ہیں۔ اس پر ایک قصہ سنایا۔

قریب زمانہ میں ڈھاکہ میں ایک بڑے نواب صاحب تھے ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی جس کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی۔ چونکہ بہت پیاری اور لاڈلی تھی اس لئے اس کو تعلیم نہ دے سکے اور نہ کچھ تہذیب سکھائی، مرنے سے پہلے اس لڑکی کے لئے یہ انتظام کیا کہ اس کے نام پر ایک لاکھ روپیہ بینک میں داخل کرادیا۔ اور دوسرا انتظام یہ کیا کہ ڈھاکہ میں بازار بنوایا اور وہ سب اس لڑکی کے ملک کردیا تاکہ جب رقم ختم ہوجائے تو بازار کی دکانوں کے کرایہ سے آمدنی ہوتی رہے۔ مگر چونکہ علم وادب سے عاری تھی اس لئے والد کے مرنے کے بعد جائیداد کو اڑانا شروع کیا۔ اور فضول کاموں میں خرچ کرنے لگی۔ اگر کبھی قیمتی تھان کپڑے کا منگوایا اس کے پھاڑنے کے وقت جو آواز پیدا ہوئی وہ اس کو پسند آگئی۔ تو اس قسم کے کئی تھان منگوالئے اور پھڑواکر لطف اٹھایا۔

کسی تالاب کی سیر کو گئی اور اس کا پانی صاف شفاف تھا اس میں اس نے چاندی کا روپیہ سونے کی اشرفی ڈالی تاکہ صاف پانی میں اس کی حرکت کو دیکھے اور لطف اندوز ہو۔ ایک کے ڈالنے سے اس کو لطف آیا تو کئی اشرفیاں اور روپے منگوا کر تالاب میں ڈال کر لذت حاصل کی۔ اسطرح کے اسراف میں جائیداد کب تک تاب لاسکتی۔ پہلے بینک کا روپیہ ختم ہوا۔ پھر بازار کو بیچنا شروع کردیا۔ آخر نوبت

بایں جارسید کہ سب جائیداد کو بیچ کر بالکل کنگال ہوگئی۔ اور بھیک مانگنا شروع کیا اور اسی حالت میں مرگئی۔ اور ڈھاکہ میں اب تک اس کے والد کا بنوایا ہوا بازار بیگم بازار کے نام سے مشہور ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مزاح

اپنے احباب اور متعلقین کا دل خوش کرنے کے لئے مزاح کرنا سنت سے ثابت ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی حسب موقع اپنے متعلقین سے مسنون مزاح فرمالیا کرتے تھے اور اس قسم کے لطائف اور قصے بھی سناتے۔ اپنا ایک قصہ سنایا کہ مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس حدیث کا پاک سبق ہورہا تھا۔ حضرت کسی روایت کے ایک جزء کی تضعیف فرمارہے تھے۔ میں نے عرض کیا یہ تو ثقہ کی زیادتی ہے اور محدثین سے ضعیف بھی ہوجاتی ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہمیشہ مقبول نہیں ہوتی بلکہ بعض اسباب قادحہ کی وجہ سے ضعیف بھی ہوجاتی ہے اس کے بعد سبق میں جب ایسی زیادتی آجاتی جو محدثین کے ہاں مقبول نہ ہوتی تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ میری طرف اشارہ کرکے مزاحاً فرماتے ثقہ کی زیادتی والا کہاں بیٹھا ہے۔

ایک دفعہ مزاحاً یہ لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے خلاف حاکم کے پاس نالش کی اور کہا کہ فلاں آدمی نے مجھ پر ظلم اور زیادتی کی ہے میری دادرسی کی جائے۔ حاکم ظریف الطبع تھا اس نے مدعی کو کہا کہ تم ٹھگنے آدمی ہو۔ اور ٹھگنا آدمی چالاکی اور مکاری میں زیادہ ماہر ہوتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی تم پر ظلم کرے، مدعی نے جواب دیا کہ آپ نے درست فرمایا۔ مگر جس پر میرا دعویٰ ہے وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھگنا ہے۔ حاکم یہ سن کر ہنس پڑا اور مقدمہ درج کرلیا۔

امامِ اعمش رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ کا لطیفہ

امام اعمش رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ حدیث کے بڑے امام ہیں۔ ان کا نام سلیمان بن مہران ہے۔ عربی میں اعمش چندھے کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان کی آنکھوں میں تکلیف رہتی تھی اس لئے ان کو اعمش کہا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان کو لطیفہ سنایا۔

امام اعمش رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ ظریف الطبع تھے۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گئے۔ ایک آدمی ان کی عیادت کے لئے آیا۔ امام نے اس کو اپنے پاس بلوالیا۔ وہ آدمی ایسا جم کر بیٹھ گیا کہ اٹھنے کا نام بھی نہ لیا۔ کچھ دیر تو امام رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ نے کلفت برداشت کی مگر جب دیکھا کہ یہ اٹھتا ہی نہیں تو تکیہ سے سر اٹھایا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اس شخص کو فرمایا ان مریضک قد صح فاذھب (یعنی جس مریض کی عیادت کے لئے تم آئے تھے وہ تندرست ہو گیا ہے اب جاؤ)۔

امام اعمش رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ کا ایک اور واقعہ سنایا کہ ان کا ایک شاگرد اعرج یعنی لنگڑا تھا۔ جب استاذ کبھی اپنے کام سے بازار وغیرہ جاتے تو وہ بھی ساتھ ہو لیتا دونوں کے مل کر چلنے سے عجیب صورت بن جاتی کہ استاذ اعمش اور شاگرد اعرج۔ یہ ہیئت دیکھ کر بعض لوگ ہنس پڑتے تھے۔ ایک دن امام اعمش نے اپنے شاگرد کو فرمایا کہ جب میں لوگوں کے مجامع میں جاؤں تو بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ نہ چلا کریں۔ کیونکہ لوگ خواہ مخواہ ہنستے ہیں۔ شاگرد نے کہا ''مالنا نوجر ویعصون'' یعنی ہمارا کیا نقصان ہے ان کو گناہ ہوتا ہے اور ہمیں ثواب ملتا ہے۔ امام رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''نسلم ویسلمون خیر مما نوجر ویعصون'' یعنی ہم ان کے مذاق اور استہزاء سے بچ جائیں اور وہ گناہ سے بچ جائیں یہ اس سے بہتر ہے کہ کہ ہمیں ثواب ہو اور وہ گنہگار ہوں۔

چند دیہاتیوں کے لطائف

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قصہ سنایا کہ ایک دفعہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کچھ لکھنے میں مشغول تھے کہ ایک دیہاتی بڑا تربوز سر پر رکھے ہوئے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ نہ سلام کیا نہ اجازت مانگی۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا قوی ہیکل انسان کھڑا ہے۔ تربوز سر پر ہے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نازک مزاج تو تھے ہی اس کی حرکت پر بہت غصہ آیا۔ پوچھا کیسے آئے ہو؟ کہا کہ تھارے (تمہارے) لئے تربوز لایا ہوں۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کسی طرح پھر لکھنے میں مشغول ہوئے تو کچھ دیر کے بعد وہ دیہاتی بولا کہ تربوز کہاں رکھوں۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے غصہ میں فرمایا میرے سر پر رکھ دے۔ اس نے سادگی سے آپ کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت کو ہنسی آگئی۔ غصہ سرد ہوا اور تربوز بھی قبول کرلیا۔

بانیِ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا قصہ سُنایا کہ ایک گنوار نے ان کی دعوت کرکے اپنے گھر لے جانا چاہا۔ اور بتلایا کہ میرا گھر، نیڑے (نزدیک) ہے۔ حضرت مولانا نے دل شکنی کے خوف سے قبول کرلیا۔ وہ دیہاتی آپ کو لے کر چلا۔ جب کافی سفر طے کرلیا تو آپ نے پوچھا کہ ابھی تمہارا گھر نہیں آیا۔ کہنے لگا نزدیک ہے۔ پھر کافی سفر کرکے پوچھا کہ ابھی نہیں آیا۔ کہاں نزدیک ہے۔ پھر کچھ سفر کرنے کے بعد یہی سوال کیا۔ تو اس نے کہا کہ حضرت میرا گھر وہ دِکھے حضرت نے غصہ میں فرمایا کم بخت دِکھے تو آسمان بھی۔

اس ضمن میں ایک دیہاتی صحابی کا قصہ سنایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے سے منع کیا گیا۔ تو صحابہ کرام تمنا کرتے کہ کوئی گنوار آجائے اور سوال کرلے۔ اسی دوران سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک

ضروری سوال کی حاجت ہوئی تو آپ نے ایک دیہاتی کو تیار کیا اور اس کو سوال سمجھا دیا۔ اور فرمایا کہ تم حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چل کر یہ سوال کرو۔ میں تمہیں یہ چادر جو پہنے ہوئے ہوں دے دوں گا۔ چنانچہ وہ دیہاتی گئے اور سوال پیش کر دیا۔ آپ نے جواب دیا۔ جس کو حضرت عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سن لیا۔ سوال و جواب سے فراغت ہوئی تو وہ دیہاتی صبر نہ کر سکا۔ اور مجلس میں ہی سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہنے لگا کہ اب چادر دے دو۔ چنانچہ حسب وعدہ آپ نے چادر دے دی اور اس نے اسی مجلس میں سر پر لپیٹ لی۔ سبحان اللہ کیا سادگی تھی۔

اخلاص کی برکت

فرمایا کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث میں ایک کتاب لکھی جس کا نام موطا رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول و مشہور ہوئی۔ اسی شہرت کی بناء پر دوسرے علماء نے اس فن میں جو کتابیں لکھیں ان کا نام بھی اسی نام پر موطا رکھا۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے کہا کہ آپ کی کتاب کے نام پر کافی کتابیں تصنیف ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا کہ **ماکان للہ فھو یبقی** یعنی ان کتابوں میں سے جو اللہ کے لئے لکھی گئی ہوں گی۔ وہ باقی رہیں گی باقی معدوم ہو جائیں گی۔

دنیا جانتی ہے کہ امام مالک کا موطا اب تک باقی ہے۔ اور ایسی شہرت کسی موطا کو حاصل نہیں ہوئی اور موطا نام کی بعض کتابیں ایسی ہیں جن کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔

یہ چند واقعات اور چند باتیں تھیں جو حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنی ہوئی تھیں۔ بغیر کسی ربط کے ان کو جمع کر دیا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ العزیز نافع ہوں گی حق تعالیٰ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات بلند فرمائے اور ان کے فیوض و برکات کا حصہ ہمیں بھی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(ماخوذ ماہنامہ البلاغ کراچی مفتی اعظم نمبر)

آہ مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ

۲۶۵ ۱۶۴ ۱۰۱۱ ۵۳۰ ۶

۱۹۷۶ء

کیوں ہے یہ آہ و بکا، آج ہے ماتم کسکا سارے عالم پہ یہ ٹوٹا ہے بھلا، غم کسکا
کس کی رحلت سے ہوا ختم یہ عالم کا سکوں نوحہ کرتی ہے یہ بے ربطیٔ عالم کسکا
لے چلی کس کو اٹھا کر یہ قضائے مبرم سارے عالم میں ہے یہ نوحہ و ماتم کسکا
کون یہ محفلِ رنداں سے اُٹھا ہے ساقی جام و پیمانہ و غم کرتے ہیں ماتم کسکا
دیکھ کر خلقِ خدا کو ہیں ملائک حیران لاشہ کاندھوں پہ لئے جاتے ہیں یہ ہم کسکا
اشک کیوں گرتے ہیں تسبیح کے دانوں کیطرح سوگیا آج وہ مجذوب مجسّم کسکا
بسملوں کو تو گیا چھوڑ مسیحائے زمانہ لائیں اب زخمِ جگر کے لیئے مرہم کسکا
راہبر کسکو کہیں جائیں کہاں اہل سلوک بزمِ میخانہ میں اب کون ہے محرم کسکا
سالک و عالم و مفتی و مشائخ ہیں چیزیں درسگاہوں میں ہے یہ تذکرۂ غم کسکا
دھوم افلاک میں آمد یہ مچی ہے کس کی سر بلند آج ہے یہ خلد میں پرچم کسکا
تعزیت کس کی کرے کس سے کرے کون کرے سارا عالم ہے حزیں خاص ہے یہ غم کسکا

اے خدا تو ہی بتا ان کو بلانے والے
نام اب رکھیں گے ہم مفتیٔ اعظم کسکا

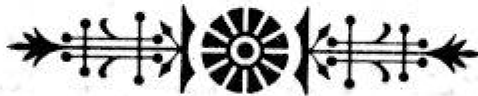
مشرف علی تھانوی

مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

علم و آگاہی کے یکتا تاجدار — مفتیٔ دیں، عالمِ گردوں وقار
رو رہے ہیں اہلِ دیں اہلِ کمال — سب کے دل پر آپ کا ہے اقتدار
آپ ہی کے فیض سے ہے مُستنیر! — تھا یہ خطّہ جہل کا تاریک غار
آپ نے رخ اس کا پھیرا سوئے خلد — جب خزاں کے موڑ پر آئی بہار
شیخ کامل، پاسبانِ علم و فن — بایزیدِ عصر، فخرِ روزگار
ہیں وہ ’’قرآنی معارف‘‘ آپ کے — جن سے ہے سرِّ معانی آشکار
فقہ ہو یا ہو ادب کا کوئی باب — ہے ہر اک تصنیف مہرِ زرنگار
عالمِ دینِ متیں، بالغ نظر! — آپ کے آگے ہے خم ہر کوہسار
اے مُحدثِ اے مفسّر اے فقیہ — اے مجاہد عابدِ شب زندہ دار
عرش سے تا، سرزمینِ پاک آج — غم کے سائے ہیں قطار اندر قطار

مفتیٔ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ جو دنیا میں نہیں
ملّتِ اسلامیہ ہے اشکبار

مسلم غازی



ایک زندۂ جاوید معجزہ

(از مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان)

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف ان کی حیات تک معجزہ ہوتے لیکن قرآن کا معجزہ بعد وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت میں باقی ہے۔ آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دنیا کے اہل علم و دانش کو للکار کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لا سکا نہ آج لا سکتا ہے اور جس کو ہمت ہو پیش کر کے دکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطی مفسر ”جلالین“ نے اپنی کتاب ”خصائص کبریٰ“ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالہ احادیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں ایک قرآن کا معجزہ دوسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں۔ پھر کوئی ان کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اٹھاتا بھی نظر نہیں آتا اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکری کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے اسلئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہو جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں، تو اب اس جگہ صرف ان کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوا۔ اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہو گیا ہوتا۔ یہ روایت ”سنن بیہقی“ میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق

ہر سال اور ہر زمانہ میں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز سات سات کنکریاں پھینکتا ہے اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں۔ اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی نہ اٹھائی جاتی ہیں اور جیسا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اٹھائی ہی نہیں جاتیں تو اگلے سال اس کا دوگنا اور تیسرے سال تگنا ہو جائے گا۔ پھر کیا شبہ ہے کہ چند سال میں یہ حصہ زمین مع جمرات کے ان کنکریوں میں چھپ جائے گا۔ اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے۔ مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور یہ مشاہدہ ہر زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح معجزہ قرآن ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے جیسے آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اس کی مثال یا نظیر پیش نہیں کی جاسکی آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اعجازِ قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآنِ کریم کو کس بناء پر آنحضرت ﷺ کا معجزہ قرار دیا گیا اور اس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے اور کیوں ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہوگئی؟

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں قرآن کے زبردست تحدی (چیلنج) کے باوجود کوئی اس کی مثال یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال پیش نہیں کرسکا یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے۔ یہ دونوں باتیں طویل الذیل اور تفصیل کی طالب ہیں۔

وجوہِ اعجازِ قرآنی

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا اور وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس پر قدیم وجدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اور ہر مفسّر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں۔

اس جگہ سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب کل علوم کی جامع کتاب کس جگہ، کس ماحول میں اور کس پر نازل ہوئی۔ اور کیا وہاں کچھ ایسے علمی سامان موجود تھے جس کے ذریعہ دائرہ اسباب میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہوسکے جو علوم اولین وآخرین کی جامع اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کرسکے۔ جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت کا مکمل نظام ہو اور تدبیر منزل سے لے کر سیاست ممالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ایسے ریگستانی اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا جس کو ''بطحاء'' مکّہ کہتے ہیں اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب وہوا ہی کچھ ایسی خوشگوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہنچنے کی رغبت کریں نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا آسان ہو۔ اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور دُور تک نہ کوئی بستی نظر آتی ہے نہ کوئی کھیت یا درخت، اس پورے خطّۂ ملک میں کچھ بڑے بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گزارنے والے انسان بستے ہیں۔ اس کے چھوٹے

دیہات کا تو دیکھنا کیا جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے علم وتعلیم کا کوئی چرچا نہیں۔ نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے۔ نہ وہاں کوئی بڑی یونیورسٹی یا دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت وبلاغت کا ایک فن ضرور دے دیا ہے۔ جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں وہ نثر اور نظم میں ایسے قادرالکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رعد کی سی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں۔ ان کی ادنیٰ ادنیٰ لڑکیاں ایسے فصیح وبلیغ شعر کہتی ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ ان کا فطری فن ہے جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جاتا غرض نہ وہاں تعلیم تعلم کا کوئی سامان ہے نہ وہاں کے رہنے والوں کو ان چیزوں سے کوئی لگاؤ یا وابستگی ہے، ان میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں مختلف اجناس مال کی درآمد برآمد ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر مکّہ کے ایک شریف گھرانے میں وہ ذات مقدس پیدا ہوتی ہے۔ جو مہبط وحی ہے جس پر قرآن اترا ہے۔ اب اس ذات مقدس کا حال سنیئے:۔

ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہوگئے۔ ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آغوش مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا۔ شریف آباؤ اجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا جس سے یتیم کی پرورش اور آئندہ زندگی کا سامان ہوسکے۔ نہایت عسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ ان حالات میں آپ نے پرورش پائی اور عمر کا ابتدائی حصہ گزارا جو تعلیم وتعلم کا اصلی وقت ہے۔ اس وقت مکہ میں اگر کوئی دارالعلوم یا اسکول یا کالج ہوتا بھی تو بھی آپ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی کسی کو نہ تھی۔ اس لئے یہ پوری قوم عرب امیین کہلاتے تھے۔ قرآنِ کریم نے بھی

ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم وتعلم سے بے خبر رہے۔ وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکیں۔ جن کا قرآنِ پاک حامل ہے۔ پھر قدرت کو تو ایک فوق العادۃ معجزہ دکھانا تھا۔ آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے، معمولی نوشت وخواند جو ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں۔ آپ نے وہ بھی نہ سیکھی، بالکل اُمّی محض رہے کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے۔ عرب کا مخصوص فن شعر وسخن تھا جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا۔ آپ کو حق تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ لی، نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

یہ امی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں۔ کسی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوسکے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے۔ صرف ملک شام کے دو تجارتی سفر ہوئے وہ بھی گنے چُنے دن کے لئے جس میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس امی محض ذات مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکّہ میں اپنی برادری میں اس طرح گزرے کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا نہ کسی مکتب میں گئے اور نہ کسی مجلس میں کوئی نظم وقصیدہ ہی پڑھا۔ ٹھیک چالیس سال کے بعد ان کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگا۔ جس کا نام قرآن ہے جو اپنی لفظی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم وفنون کے لحاظ سے محیر العقول کلام ہے اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ ہوسکتا ہے مگر یہاں یہی نہیں بلکہ اس نے ساری دنیا کو تحدی (چیلنج) دیا کہ کسی کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا مثل بنا لائے۔

اب ایک طرف قرآن کا یہ تحدی اور چیلنج دوسری طرف ساری دنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنے مال، جان، آبرو سب گنوانے کے لئے تیار ہیں مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی صورت کی مثال بنالائے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثال و بے نظیر بھی نہ ہوتی جب بھی ایک امی محض کی زبان سے اس کا ظہور اعجاز قرآن اور وجوہ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ، ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجاز کی دوسری وجہ

اب اعجاز قرآن کی دوسری وجہ دیکھئے یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ساری دنیا کے لئے آئے لیکن اس کا بلاواسطہ اور پہلے مخاطب عرب تھے جن کو اور کوئی علم وفن آتا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہنر اور پیدائشی وصف تھا۔ جس میں وہ اقوام دنیا سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ قرآن ان کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہیں میرے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو تم میری ایک سورت کی مثال بنا کر دکھادو۔ اگر قرآن کا یہ تحدی (چیلنج) صرف اپنے حُسنِ معنوی یعنی حکیمانہ اصول اور علمی معارف و اسرار ہی کی حد تک ہوتا تو قوم امیین کے لئے اس کی نظیر پیش کرنے سے عذر معقول ہوتا۔ لیکن قرآن نے صرف حسن معنوی ہی کے متعلق تحدی نہیں کی بلکہ لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا کو چیلنج دیا ہے اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے اقوام عالم میں سب سے زیادہ عرب ہی تھے۔ اگر فی الواقع یہ کلام قدرتِ بشر سے باہر کسی مافوق قدرت کا کلام نہیں تھا تو بلغاءِ عرب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک امی شخص کے کلام کی مثال بلکہ اس سے بہتر کلام فوراً پیش کر دیتے اور ایک دو آدمی یہ کام نہ کر سکتے تو قرآن نے ان کو یہ سہولت

بھی دی تھی کہ ساری قوم مل کر بنالائے۔ مگر قرآن کے اس بلند بانگ دعویٰ اور طرح طرح غیرت دلانے پر بھی غیور قوم پوری کی پوری خاموش ہے۔ چند سطریں بھی مقابلے پر نہیں پیش کرتی۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مغلوب کرنے میں جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا وہ کسی پڑھے لکھے آدمی سے مخفی نہیں، شروع میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے گنے چنے رفقاء کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر چاہا کہ وہ کلمہ اسلام کو چھوڑ دیں مگر جب دیکھا کہ یہاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے تو خوشامد کا پہلو اختیار کیا۔ عرب کا سردار عتبہ ابن ربیعہ قوم کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرب کی پوری دولت وحکومت اور بہترین حسن وجمال والی لڑکیوں کی پیش کش اس کام کے لئے کی کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، آپ نے اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سنادینے پر اکتفا کیا۔ جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ ومقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت جو قریش عرب نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے یہ سب کچھ کیا مگر یہ کسی سے نہ ہوسکا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرتا اور چند سطریں مقابلہ پر پیش کر دیتا۔ کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت نہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جس کے کام یا کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سب نے اس کے بے مثل کلام ہونے کا اعتراف کیا اور جو ان میں سے منصف مزاج تھے انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا پھر ان میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور کچھ اپنی آبائی رسوم کی پابندی یا بنی عبدالمناف کی ضد کی وجہ سے

اسلام قبول کرنے کے باوجود اعتراف سے محروم رہے۔ قریش عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اسلام کے بے مثل بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا اور اسی کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا۔

جب رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ پاک کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا اور حج کا موسم آیا تو قریش مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اطراف عرب سے حجاج آئیں گے اور رسول کریم ﷺ کا یہ کلام سُنیں گے تو فریفتہ ہو جائیں گے اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اس کے انسداد کی تدابیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے ان میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے سب نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطراف الملک سے لوگ آئیں گے اور ہم سے محمد (ﷺ) کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتایئے کہ ہم سب وہ ہی بات سب سے کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہو جائے ولید بن مغیرہ نے کہا تم ہی کہو کیا کہنا چاہیئے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد (ﷺ) معاذ اللہ مجنون ہیں۔ ان کا کلام مجنونانہ بڑھیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ ایسا ہرگز نہ کہنا کیونکہ یہ لوگ جب ان کے پاس جائیں گے اور ان سے ملاقات وگفتگو کریں گے۔ اور ان کو ایک فصیح وبلیغ عاقل انسان پائیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ولید بن مغیرہ نے اس سے بھی منع کیا اور کہا جب لوگ ان کا کلام سنیں گے وہ تو شعر وشاعری کے ماہر ہیں انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ

شاعر ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب لوگ تمہیں جھوٹا سمجھیں گے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں جو شیاطین و جنات سے سن کر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں۔ ولید نے کہا یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے۔ وہ پھر بھی تمہیں ہی جھوٹا سمجھیں گے۔ اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے ان کو ان الفاظ میں بیان کیا:۔

”خدا کی قسم تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اشعار عرب سے میرے برابر واقف نہیں۔ خدا کی قسم اس کلام میں خاص حلاوت ہے اور ایک رونق ہے جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا“

پھر ان کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلائیے پھر ہم کیا کریں اور ان کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا کہ میں غور کرنے کے بعد جواب دوں گا پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو تم ان کو ”ساحر“ کہو کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔ قوم اس پر مطمئن اور متفق ہوگئی اور سب سے یہی کہنا شروع کیا۔ مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا۔ اطراف عرب کے لوگ آئے قرآن سنا اور بہت سے مسلمان ہوگئے اور اطراف عرب میں اسلام پھیل گیا (خصائص کبریٰ) اسی طرح ایک قریشی سردار نصر بن حارث نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے کہا کہ ”اے قوم قریش آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے اور تم سب ان کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانتدار جانتے اور کہتے تھے اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے اور انہوں نے ایک بے مثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، خدا کی قسم وہ

جادوگر نہیں ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے۔ ان کے کلام سنے ہیں اور ان کے طریقوں کو سمجھا ہے وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور ان کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم وہ شاعر بھی نہیں ہم نے خود شعر و شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں۔ ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بناتے ہو، خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سنی، ان کے مختلف اور مختلط کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں۔ اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں۔ (خصائص کبریٰ ص ۱۱۴ ج ۱)

حضرت ابوذر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی انیس ایک مرتبہ مکہ معظّمہ گیا، اس نے واپس آکر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے میں نے پوچھا وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے، میرا بھائی انیس خود شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا کہ لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ان کا کلام نہ شعر ہے، نہ کہانت، نہ مجنونانی کلمات ہیں بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔ ابوذر فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب سے یہ کلمات سُن کر میں نے مکّہ کا سفر کیا اور مسجد حرام میں آکر پڑ گیا، تیس روز میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا۔ اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی، نہ کوئی ضعف محسوس کیا (خصائص ص ۱۱۶ ج ۱) واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے روم و فارس کے فصحاً و بلغاً کے کلام بہت سنے ہیں اور کاہنوں کے کلمات اور حمیر کے

مقالات بہت سنے ہیں، محمد (ﷺ) کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سنی۔ تم سب میری بات مانو اور آپ کا اتباع کرو۔ چنانچہ فتح مکہ کے سال میں ان کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ (خصائص ص ۱۱۶ ج)

اسلام اور آنحضرت ﷺ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل اور اخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سنا کرتے اور اس کے عجیب وغریب بے مثل و بے نظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے۔ مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے تو ابو جہل کا جواب یہ تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں اب جبکہ ہم اور وہ برابر حیثیت کے مالک ہیں تو وہ اب یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ہم اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں۔ میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا۔ (خصائص)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنی عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے۔

اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قرآن اور پیغمبر قرآن کے مقابلہ میں جان و مال، اولاد آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہو گئے مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال افعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے۔ جب انہوں نے قرآن کو سن کر یہ سمجھ لیا کہ

درحقیقت اس قرآن کی جو مثل ہم نہیں لا سکتے تو محض دھاندلی اور کٹ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھتا تھا کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش کر بھی دی تو پورے عرب کے فصحاء و بلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کر دیں گے اور خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ اس لئے پوری قوم نے سکوت اختیار کیا اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انہوں نے صاف طور پر اقرار و تسلیم بھی کیا جس کے چند وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اسد بن ذرداہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اقرار کیا کہ:۔

''ہم نے خواہ مخواہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کر کے اپنے رشتے ناطے توڑے اور تعلقات خراب کئے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں ہرگز جھوٹے نہیں اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہو سکتا''۔

(خصائص ص۱۱۶ ج۱)

قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسمی قیس بن نسیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ سے قرآن سنا اور چند سوالات کئے جن کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تو یہ اسی وقت مسلمان ہو گئے اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے تو لوگوں سے کہا:۔

''میں نے روم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سنے ہیں، بہت سے کاہنوں کے کلمات سننے کا تجربہ ہوا ہے۔ حمیر کے مقالات سنتا رہا ہوں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا، تم سب میری بات مانو اور ان کا اتباع کرو'' انہیں کی تحریک و تبلیغ پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے'' (ص۱۱۶ ج۱)

یہ اقرار و تسلیم ایسے لوگوں سے ہی منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور

غیر جانبدار تھے بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے، قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطی نے خصائص اکبری مین بحوالہ ''بیہقی'' نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپ کر رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنیں۔ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپ کر قرآن سننے لگے تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گزر گئی۔ جب صبح ہوگئی تو سب واپس ہوئے اتفاقاً راستہ میں تینوں مل گئے اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سنا تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ بُری حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے کیونکہ عرب کے عوام کو اگر اس کی خبر ہوگئی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ سن کر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اگلی رات آئی تو پھر ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹھیس اٹھی کہ قرآن سنیں اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سنا یہاں تک کہ رات گزر گئی اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور اس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا۔ مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذّت وحلاوت نے انہیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا۔ پھر پہنچے اور رات بھر قرآن سن کر لوٹنے لگے تو پھر راستے میں اجتماع ہو گیا تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کرلیں کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کر لی گئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صبح کو اخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہنچا کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا تو اخنس نے کہا بخدا میری بھی یہی رائے ہے اس کے بعد وہ

ابو جہل کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو کیسا پایا؟

ابو جہل نے کہا صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنو عبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلتی آتی ہے۔ قوم کی سیادت و قیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ انہوں نے سخاوت و بخشش کے ذریعہ قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے ان سے بڑھکر یہ کام کر دکھایا یا انہوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہ رہے یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں ان کے خاندان سے یہ آواز اٹھی کہ ہمارے اندر ایک نبی پیدا ہوا ہے۔ جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس لئے ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے ان کا مقابلہ کریں گے اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے (خصائص ص ۱۱۵ ج ۱)

یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔ یہ تمام واقعات علامہ جلال الدین سیوطی نے ''خصائص کبریٰ'' میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں۔ اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی۔ مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم و فارس کے مقابلہ میں ابتداءً فارس غالب آ گئے اور رومی مغلوب ہو گئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گزرنے بھی نہ پائیں گے کہ پھر رومی فارس پر غالب آ جائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہار جیت

کی شرط کرلی۔ اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آ گئے۔ تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی۔ اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط تھی وہ مال ان کو دینا پڑا۔ رسول کریم ﷺ نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا کیونکہ وہ ایک قسم کا جوا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئی ہیں اور ان کی سچائی بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی امتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علمائے یہود ونصاری جو پہلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے کبھی نہ تو کسی مکتب میں قدم رکھا، نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا۔ پھر یہ ابتدائے دنیا سے آپ کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کا ہو اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجہ

یہ ہے کہ اس کی متعدد آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی اور پھر ان کے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی۔ یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کرسکتا ہے کسی بشر سے عادتاً ممکن نہیں۔ مثلاً ارشاد قرآنی ہے کہ جب تمہاری دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کیا کہ پسپا ہوجاویں اور یہ ارشاد کہ:۔ وہ لوگ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جن کو انہوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا۔ قرآن نے ان کا انکشاف کیا۔

چھٹی وجہ

وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشن گوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کر سکیں گے اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے ان کام کو نہ کر سکے جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کا دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انہیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہیئے۔ وہ ذرا موت کی تمنا کر کے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا کہ۔

''وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کر سکیں گے۔'' کیونکہ یہود یا مشرکین زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں، ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی۔ اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے تو فوراً مر جائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کردے۔

ساتویں وجہ

وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر عام وخاص اور مومن وکافر پر طاری ہوتی ہے۔ جیسے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا، اتفاقاً انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں **سورۂ طور** پڑھتے ہوئے سنا۔ جب آپ آخری آیات پر پہنچے تو جبیر کہتے ہیں کہ میرا دل گویا اڑنے لگا اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا۔

آٹھویں وجہ

یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اکتاتا نہیں بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اس کا شوق اور بڑھتا ہے۔ دنیا کی بہتر سے بہتر اور مرغوب سے مرغوب

کتاب لے لیجئے اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے پھر وہ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا ہے، نہ ہی سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کا شوق اور رغبت بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بھی قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا اثر ہے۔

نویں وجہ

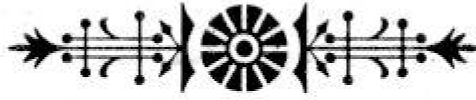
یہ ہے کہ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے وہ قیامت تک بغیر کسی تغیرّ وترمیم کے باقی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے، آج چودہ سو برس ہونے کو آئے ہیں، ہر قرن ہر زمانہ میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر زبر کی غلطی کا امکان نہیں۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانہ میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد دنیا میں بنسبت منکرین اور کافرین کے بہت کم رہی اور ذرائع نشر واشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی حصہ معتد بہ نصیب نہ تھا۔ مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

دسویں وجہ

وہ علم ومعارف ہیں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے کہ اتنے مختصر حجم اور محدود کلمات میں اتنے علوم وفنون جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال

سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے۔ شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک اور پھر عمرانیات واجتماعات اور سیاسیات ممالک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کر دے۔



حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اسراء و معراج

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.

ترجمہ: "پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تا کہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے، وہی ہے سننے والا دیکھنے والا"۔

خلاصۂ تفسیر: وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا جسکے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے غرض اس مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تا کہ ہم اسکو اپنے کچھ عجائباتِ قدرت دکھلائیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کر لینا اور سب انبیاء سے ملاقات کرنا اور ان کی باتیں سننا وغیرہ، اور بعض آگے کے متعلق ہیں مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا) بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ بڑے سُننے والے، بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے اقوال کو سُنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب ان کو یہ خاص امتیاز اور اعزاز بخشا اور اپنے قرب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہ ملا۔

معارف ومسائل: اس آیت میں واقعۂ معراجُ کا بیان ہے جو ہمارے رسول اللہ ﷺ کا ایک خصوصی اعزاز اور امتیازی معجزہ ہے، لفظ اَسْریٰ اسراء سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی رات کو لے جانا ہیں۔ اس کے بعد لَیۡلًا کے لفظ سے صراحۃً بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا اور لفظ لَیۡلًا کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس تمام واقعہ میں پوری رات بھی صرف نہیں بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے۔ مسجد حرام سے مسجد اقصٰی کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسراء کہتے ہیں اور یہاں سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے۔ اسراء اس آیت کے نصِ قطعی سے ثابت ہے اور معراج کا ذکر سورۂ نجم کی آیات میں ہے اور احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔ بِعَبۡدِہٖ اس مقام اعزاز واکرام میں لفظ بِعَبۡدِہٖ ایک خاص محبوبیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرما دیں کہ یہ میرا بندہ ہے اس سے بڑھ کر کسی بشر کا اعزاز نہیں ہوسکتا۔ حضرت حسن دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوب فرمایا:۔

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ توام   تو بزباں خود بگو بندہ نواز کیستی

یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک دوسری آیت میں عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ الخ فرما کر اپنے مقبولان بارگاہ کا اعزاز بڑھانا مقصود ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبدِ کامل بن جائے اس لئے کہ خصوصی اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفتِ عبدیت کو اختیار کیا گیا اور اس لفظ سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی مقصود ہے کہ اس حیرت انگیز سفر سے جس میں اول سے آخر تک سب فوق العادت معجزات ہی ہیں کسی کو خدائی کا وہم نہ ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے۔ اس

لئے لفظ عَبۡد کہہ کر یہ بتلا دیا گیا کہ ان تمام صفات وکمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت ﷺ اللہ کے بندے ہی ہیں، خدا نہیں۔

معراج جسمانی ہونے پر قرآن وسُنّت کے دلائل اور اجماع: قرآن مجید کے ارشادات اور احادیثِ متواترہ سے جن کا ذکر آگے آتا ہے، ثابت ہے کہ اسراء ومعراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سُبۡحَانَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتا تو اس میں کونسی عجیب بات ہے، خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا، فلاں فلاں کام کئے۔

دوسرا اشارہ لفظ عَبۡد سے اس طرف ہے کیونکہ عَبۡد صرف روح نہیں بلکہ جسم وروح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ واقعہ معراج آنحضرت ﷺ نے حضرت اُمّ ہانی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہَا کو بتلایا تو انہوں نے حضور ﷺ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی؟

پھر جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفارِ مکہ نے تکذیب کی اور مذاق اُڑایا۔ یہاں تک کہ بعض نومسلم اس خبر کو سُن کر مرتد ہو گئے۔ اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے یا بعد میں کوئی معراج روحانی بصورت خواب بھی ہوئی ہو۔ جمہور امت کے نزدیک آیت قرآن وَمَا جَعَلۡنَا الرُّؤۡيَا الَّتِيۡٓ اَرَيۡنٰكَ میں رُؤۡيَا سے مراد رویت ہے مگر اسکو بلفظ رُؤۡيَا (جو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر رؤیا کہا گیا ہو۔ کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رؤیا کے معنی خواب ہی کے لئے

جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعۂ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پیچھے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جو اس کا خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسراء کی متواتر ہیں اور نقاش نے بیس صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایات اس بات میں نقل کی ہیں اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور زیادہ تفصیل دی ہے۔ (قرطبی)

اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری جرح وتعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے پھر ۲۵ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام ذکر کیے ہیں۔

❶ عمر ابن خطاب	❷ علی المرتضیٰ	❸ ابن مسعود	❹ ابوذر غفاری
❺ مالک بن صعصعہ	❻ ابوہریرہ	❼ ابوسعید	❽ ابن عباس
❾ شداد بن اوس	❿ ابی بن کعب	⓫ عبدالرحمن بن قرظ	⓬ ابوحبہ
⓭ ابولیلیٰ	⓮ عبداللہ بن عمر	⓯ جابر بن عبداللہ	⓰ حذیفہ بن یمان
⓱ بریدہ	⓲ ابوایوب انصاری	⓳ ابوامامہ	⓴ سمرۃ بن جندب
㉑ ابوالحمراء	㉒ صہیب الرومی	㉓ اُمِّ ہانی	㉔ عائشہ اُم المومنین

㉕ اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اس کے بعد ابن کثیر نے فرمایا:

فحدیث الاسراء اجمع علیه المسلمون واعرض عنه الزنادقة والملحدون. (ابن کثیر)

یعنی: واقعہ اسراء کی حدیث پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے صرف ملحد وزندیق لوگوں نے اس کو نہیں مانا''

مختصر واقعۂ معراج ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت سے:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیث متعلقہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر اسراء بیداری میں پیش آیا خواب میں نہیں۔ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھا اور آپ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں، اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا جس کے نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے اس زینہ کے ذریعے آپ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے، اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زینہ کی حقیقت تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا۔ آجکل بھی زینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں، ایسے زینے بھی ہیں جو خود حرکت کرتے ہیں' لفٹ کی صورت کے زینے بھی ہیں۔ اس معجزانہ زینے کے متعلق کسی شک وشبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں)، ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے۔ مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام اور ساتویں میں خلیل اللہ ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔ پھر آپ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے مقام میں پہنچے جہاں قلمِ تقدیر لکھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جس پر اللہ شانہٗ کے حکم سے سونے کے پروانے مختلف رنگ کے پروانے گر رہے تھے اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اسی جگہ حضرت جبریل امین علیہ الصلاۃ والسلام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصل صورت میں دیکھا جن کے چھ سو بازو تھے اور وہیں پر ایک رفرف سبز رنگ کا دیکھا جس نے افق کو گھیرا ہوا

تھا۔ رفرف مسندِ سبز ہرے رنگ کی پالکی۔ اور آپ نے بیت المعمور کو بھی دیکھا جس کے پاس بانئ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام دیوار سے کمر لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس بیت معمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جن کی باری دوبارہ داخل ہونے کی قیامت تک نہیں آتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بچشم خود معائنہ فرمایا۔ اس وقت آپ کی امت پر اول پچاس نمازوں کے فرض ہونے کا حکم ملا، پھر تخفیف کر کے پانچ کردی گئیں۔ اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ واپس بیت المقدس میں اترے اور جن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آسمانوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی آپ کے ساتھ اترے (گویا) آپ کو رخصت کرنے کے لئے بیت المقدس تک ساتھ آئے۔ اسوقت آپ نے نماز کا وقت ہوجانے پر سب انبیاء کے ساتھ نماز ادا فرمائی، یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیر بتاتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء علیہم السلام کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا کیونکہ آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعہ میں یہ منقول ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام سے جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہو چکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور یوں بھی ظاہر یہی ہے کہ اس سفر کا اصل مقصد ملاء اعلیٰ میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب اصل کام سے فراغت ہوئی تو انبیاء علیہم السلام آپ کیساتھ مشایعت (رخصت) کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپ کو جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت اور سب پر فضیلت کا علمی ثبوت دیا گیا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہوکر اندھیرے وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ واللہ اعلم

واقعۂ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابونعیم اصبہانی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں محمد بن عمر واقدی [۱] کی سند سے بروایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ روم قیصر کے پاس اپنا نامہ مبارک دے کر حضرت دحیہ ابن خلیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا۔ اس کے بعد حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط پہنچانے اور شاہِ روم تک پہنچنے اور اس کے صاحب عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا (جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے) جس کے آخر میں ہے کہ شاہِ روم ہرقل نے نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اسوقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے۔ شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اسوقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے۔ شاہِ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جن کی تفصیل صحیح بخاری میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادے سے کوئی چیز اس کے سواء مانع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس کا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں۔ البتہ مجھے اسوقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جس کا جھوٹ ہونا بادشاہ خود سمجھ لے گا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک

[۱] واقدی رحمہ اللہ تعالیٰ کو روایت حدیث میں محدثین نے ضعیف کہا ہے لیکن امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے محتاط محدث نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق عقائد یا حلال وحرام سے نہیں اور ایسے تاریخی معاملات میں ان کی روایت معتبر ہے۔ ۱۲ منہ

معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کرلیں گے کہ وہ جھوٹ ہے۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے؟ میں نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سویرے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچے۔

ایلیاء (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اسوقت شاہِ روم ہرقل کے سرہانے پہ قریب کھڑا ہوا تھا، اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہِ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کو اس کا علم کیسے اور کیونکر ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اسوقت تک سوتا نہ تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کردوں اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کردیئے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہوسکا تو میں نے اپنے عملہ کے لوگوں کو بلایا انہوں نے مل کر کوشش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہوسکا۔ دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلارہے ہیں۔ میں نے عاجز ہوکر کاریگروں اور نجاروں کو بلوایا۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازہ کی عمارت کا بوجھ پڑگیا ہے۔ اب صبح سے پہلے ان کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں۔ صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جاوے؟ میں مجبور ہوکر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازہ پر پہنچا میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روزن کیا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھ دیا گیا ہے۔ اسوقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج رات اس دروازے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے شاید اسلئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ آپ نے ہماری مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں۔

(ابن کثیر ص ۲۴ ج ۳)

اسراء ومعراج کی تاریخ:

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ معراج کی تاریخ میں روایات مختلف ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا۔ اور حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہوچکی تھی۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کا واقعہ بعثتِ نبوی کے سات سال بعد ہوا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ واقعۂ معراج بعثت نبوی سے پانچ سال بعد ہوا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا۔ ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعۂ معراج ہجرتِ مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حربی کہتے ہیں کہ واقعہ اسراء ومعراج ربیع الثانی کی ستائیس ویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے اور ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ حضرات محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور عام طور پر یہ ہے کہ ماہ رجب کی ۲۷ویں شب شبِ معراج ہے۔ واللہ اعلم

مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مسجد حرام پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کونسی؟ تو آپ نے فرمایا ''مسجد اقصیٰ''۔ میں نے عرض کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ

نے فرمایا چالیس سال، پھر فرمایا کہ (مسجدوں کی ترتیب تو یہ ہے) لیکن اللہ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنادیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں پر نماز ادا کرلیا کرو۔ (رواہ مسلم)

امام تفسیر مجاہد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا تھا اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر تک پہنچتی ہیں، اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے بنایا ہے۔ (رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ) (تفسیر قرطبی ص ۱۳۷ ج ۴)

اور مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہوجاتا ہے کہ بعض روایات میں آپ کا اسرأ کے لئے تشریف لے جانا حضرت ام ہانی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہَا کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے۔ اگر مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ کچھ مستبعد نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہَا کے مکان میں ہوں وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے، پھر وہاں سے سفر اسراء کی ابتداء ہوئی ہو۔ واللہ اعلم

مسجد اقصیٰ اور ملک شام کی برکات

آیۃ میں بَارَکْنَا حَوْلَہٗ میں حول سے مراد پوری زمین شام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں فلسطین کی سرزمین کو تقدسِ خاص عطا فرمایا ہے۔ (روح المعانی)

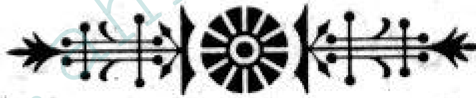
اسکی برکات دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی، دینی برکات تو یہ ہیں کہ تمام انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَام وسابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن ومدفن ہے اور دنیوی برکات اس سرزمین کا سرسبز ہونا اور اس میں عمدہ چشمے، نہریں اور باغات وغیرہ کا ہونا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ملک شام! تو تمام شہروں میں سے میرا منتخب شہر ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو پہنچاؤں گا۔ (قرطبی)

اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ دجال ساری زمین میں پھرے گا مگر چار مسجدوں تک اس کی رسائی نہ ہوگی:

❶ مسجدِ مدینہ ❷ مسجدِ مکہ مکرمہ ❸ مسجدِ اقصیٰ ❹ مسجدِ طور

(بحوالہ ماہنامہ الرشید لاہور۔ مئی ۱۹۸۱ء)



از تصنیف: حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سابق مفتیٔ اعظم پاکستان

حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ کا اسلام
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

(ایک دن میں اخلاقی کایا پلٹ)

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف میں مشغول تھے۔ فضالہ ابن عمیر ملوح اس قصد سے طواف میں داخل ہوئے کہ اچانک فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دلی خیال کا انکشاف ہو گیا۔ جب طواف کرتے ہوئے فضالہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا نام فضالہ ہے؟ عرض کیا بے شک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا ہی نام فضالہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! تم دل میں کیا سوچ رہے ہو۔ فضالہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا "کچھ نہیں" میں تو ذکر اللہ میں مشغول تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کریمانہ اخلاق سے ان کے دلی راز کا افشا نہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خدا تعالیٰ سے استغفار کرو اور اس کے ساتھ ہی اپنا دست مبارک فضالہ کے سینے پر رکھ دیا۔ فضالہ کہتے ہیں کہ واللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت اپنا دست مبارک میرے سینے سے اُٹھایا تو دنیا کی کوئی چیز میرے قلب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ تھی۔

فوراً مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور وہی فضالہ جو قتلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرم بننے

کے لئے حرم میں داخل ہو گئے تھے، اسیر حب رسول ﷺ ہو کر واپس ہوتے ہیں۔ اور صرف اسی ایک زیارت کا وہ گہرا رنگ لے کر جاتے ہیں کہ جاہلیت اور کفر کے تمام اخلاق و عادات ایک دم چھوٹ جاتے ہیں۔ اپنے گھر واپس آئے تو یہاں ایک عورت سے ان کی شناسائی و تعلق تھا جس کے پاس جایا کرتے تھے، وہ مل گئی، اس نے کچھ باتیں کرنا چاہیں اس وقت فضالہ (صبغۃ اللہ) کے گہرے رنگ میں رنگے جا چکے تھے اور قدیم، پرانی محبت تقاضائے نفسانی سب ایک نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے قدموں پر نثار کر آئے تھے فوراً اس کے جواب میں اشعار پڑھے۔

قالت هلهم الى الحديث فقلت لا　يابى عليك الله والاسلام

''محبوب نے کہا آؤ بات چیت کریں۔ میں نے کہا ہرگز نہیں اللہ اور اسلام اس سے منع کرتا ہے''

لو ما رائيت محمدا وقبيله　بالفتح يوم تكسر الاصنام

''اگر تم فتح مکہ کے دن محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے قبیلہ کو دیکھتیں جب کہ بت توڑے جا رہے تھے''

لرايت دين الله اضحى بينا　والشرك يغشيى وجهه الاظلام

''تو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیتی کہ اللہ کا دین واضح ہو گیا اور شرک وکفر کے چہرے پر تاریکی چھا گئی''

اللہ اللہ کیا نظر فیض اثر تھی کہ جو کام عمر بھر کی ریاضت ومجاہدہ سے حاصل نہیں ہو سکتا وہ ایک نظر میں ہو گیا۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں　دو چار دن رہے تھے کسی کی نگاہ میں



دربارِ نبوت کی حاضری کا ایک عجیب واقعہ

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بعد الوفات)

یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کوئی خواب یا افسانہ نہیں، صحیح اور سچا واقعہ ہے جو محدثانہ اسناد صحیح کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ نویں صدی ہجری کے مشہور و معروف علامہ عبدالعزیز مکی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے رسالہ (فیض الجود علی حدیث شیّبتنی ہود) میں عارف باللہ سیدی عبداللہ بن سعد یافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "نشر المحاسن" کے حوالے سے نقل کرتے ہیں اور حضرت یافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ مجھے صحیح اسناد کے ساتھ پہنچا ہے اور اس زمانے میں بہت زیادہ مشہور ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عارف باللہ شیخ ابن الزغب یمنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت تھی کہ ہمیشہ اپنے وطن سے سفر کرکے اوّل حج ادا کرتے اور پھر زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ حاضری دربار کے وقت والہانہ اشعار قصیدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں لکھ کر روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حسب عادت وہ قصیدہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو ایک رافضی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ آج میری دعوت قبول کیجئے۔ حضرت شیخ نے از روئے تواضع اور اتباع سنت دعوت قبول فرمائی۔ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کا حال معلوم نہ تھا کہ یہ رافضی ہے اور صدّیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح کرنے سے ناراض ہے، آپ رحمہ اللہ تعالیٰ حسب وعدہ اس کے مکان پر تشریف لے گئے، مکان میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے دو حبشی غلاموں کو اشارہ کیا جن کو پہلے سمجھا رکھا تھا، وہ دونوں اس ولی اللہ کو لپٹ گئے اور

آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی زبان مبارک کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد اس مبخت رافضی نے کہا کہ جاؤ یہ زبان ابوبکر وعمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے پاس لے جاؤ جن کی تم مدح کیا کرتے ہو وہ اس کو جوڑ دیں گے۔

شیخ موصوف کٹی ہوئی زبان ہاتھ میں لئے ہوئے روضہ اقدس کی طرف دوڑے اور روضہ مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا واقعہ ذکر کیا اور روئے، جب رات ہوئی تو خواب میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس واقعہ کی وجہ سے غمگین صورت میں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیخ کے ہاتھ میں سے یہ کٹی ہوئی زبان اپنے دست مبارک میں لی اور شیخ کو قریب کر کے زبان ان کے منہ میں اپنی جگہ پر رکھ دی۔

یہ خواب دیکھ کر شیخ بیدار ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ زبان بالکل صحیح وسالم اپنی جگہ پر لگی ہوئی ہے۔ دربار نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کھلا ہوا معجزہ دیکھ کر اپنے وطن واپس آ گئے۔

سال آئندہ پھر حج کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور حسب عادت قصیدہ مدحیہ روضہ اقدس کے سامنے پڑھ کر فارغ ہوئے تو پھر ایک شخص نے دعوت کے لئے درخواست کی۔ شیخ نے پھر توکلا علی اللہ قبول فرمائی اور اس کے ساتھ مکان میں داخل ہوئے تو وہی پہلے دیکھا ہوا مکان معلوم ہوا۔ خداوند تعالیٰ کے بھروسہ پر داخل ہوئے۔ اس شخص نے نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ بٹھایا اور پر تکلف کھانے کھلائے۔ کھانے کے بعد یہ شخص شیخ کو ایک کوٹھڑی میں لے گیا وہاں دیکھا کہ ایک بندر بیٹھا ہوا ہے۔ اس شخص نے شیخ سے کہا کہ آپ جانتے ہیں یہ بندر کون ہے؟ فرمایا نہیں۔ اس شخص نے عرض کیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے آپ کی زبان قطع کی تھی۔ حق تعالیٰ نے اس کو بندر کی صورت میں مسخ کر دیا ہے یہ میرا باپ ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں۔

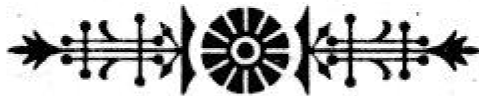
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ظاہرہ کے سامنے یہ کوئی بڑی چیز نہیں لیکن اس سے

یہ امر اور ثابت ہوا کہ رسالت مآب ﷺ جس طرح روضۂ اقدس میں زندہ تشریف فرما ہیں اسی طرح آپ ﷺ کے معجزات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس کے واقعات ایک دو نہیں سینکڑوں کی تعداد میں امت کے ہر طبقہ کو پیش آتے رہتے ہیں۔

ایک اور عجیب واقعہ

ابوعبداللہ الجلاء رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ ایک سال میں بہت مفلس فاقہ زدہ تھا۔ اتفاقاً مدینہ طیبہ کی حاضری نصیب ہوئی۔ میں روضۂ اقدس کے سامنے حاضر ہوا، سلام کے بعد میں نے عرض کیا کہ میں فاقہ رسیدہ ہوں اور آج آپ کا مہمان ہوں۔ یہاں سے فارغ ہو کر آیا تو رات کو سو گیا۔ خواب میں جمال مبارک کی زیارت سے مشرف ہوا، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مجھے روٹی عطا فرمائی۔ میں نے خواب ہی میں کھانا شروع کر دیا۔ کچھ حصہ کھایا تھا کہ آنکھ کھل گئی، دیکھتا ہوں کہ بچی ہوئی روٹی میرے ہاتھ میں ہے۔

(فیض الجود مذکور صفحہ ۲۹) (ماہنامہ الصیانۃ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء)



مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا

اَبدی وآفاقی اعلانِ رسالت وختمِ نبوّۃ

قُلْ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ (سورۃ اعراف پ۹)
اے انسانو! تحقیق بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کے لئے۔

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا کہ وہ اپنی رسالت کا اعلان فرمائیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے سکھائے ہوئے لفظوں کو دھرایا اور تمام انسانوں کو مخاطب بنایا۔ وہ انسان جو عہد رسالت مآب میں زندہ تھے یا عہدِ رسول مبین کے بعد پیدا ہوئے یا ازمنۂ وسطیٰ میں صفحۂ ارضی پر اپنے اعمال کی چھاپ چھوڑ گئے یا قیامت تک آنے والے انسان جو اپنی عملی زندگی کے نشانات کتابِ ارضی میں ثبت کریں گے، وہ سرخ وسفید ہوں، کالے ہوں یا گندمی عرب ہوں یا عجمی، سبھی اس خطاب کی زد میں ہیں۔ یہ خطابِ رسول زمان ومکان کی قید سے آزاد اور قومیت ووطینت کی قید سے بھی ماوراء ومنزہ ہے۔

اور وہ انسان بھی جو کسی نسبت کے مقید ہیں یعنی یہودی، عیسائی، صابی، مجوسی، درتشتی، بدھسٹ، بالمیکی، ہندو، مظاہر پرست، نجوم وکواکب پرست، اصنام پرست، اشخاص پرست، اور وہ مخلوق بھی جسے عہدِ جدید کی تحقیقات انسان کہے۔ برفانی

انسان (اگر وہ انسان ہے) سب اور اس کائنات میں جہاں کہیں بھی زمینوں، آسمانوں میں انسان نام کی کوئی مخلوق دریافت ہو وہ سب اس خطابِ عام میں شامل ومخاطب ہیں اور محمد ﷺ کا یہ خطاب قیامت تک اس فضاءِ بسیط میں گونج رہا ہے، جدید تحقیقات نے اب یہ بات ثابت کردی ہے کہ ماضی قریب وبعید کی تمام آوازیں فضا میں موجود ہیں اور کیچ کی جاسکتی ہیں، ریکارڈ ہوسکتی ہیں، اس حوالہ سے بھی یہ صدائے اعلانِ رسالت ہر لمحہ و ہر آن، صوتِ رسول کی آفاقی لہروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کررہی ہے اور بار بار یہ اعلان اپنی پکار اپنی نوعی اور معنوی دعوت کی طرف متوجہ کررہا ہے کہ اے زمین وآسمان میں بسنے والے انسانو! اے تمام زمانوں کے انسانو! اے تمام مکانوں کے انسانو! میں تم تمام کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

اس آیت کریمہ کا اعلانِ عام ہی حضور ﷺ کی ختمِ نبوت کی بڑی روشن دلیل ہے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت تمام زمانوں اور مکانوں کے انسانوں کے لئے ہے اور ایسا کوئی زمانہ ہے نہ ایسی کوئی جگہ ہے جہاں جنابِ رسالتِ پناہ ﷺ کی نبوّت ورسالت اور عصمت وامامت کا علَم نہ لہرایا گیا ہو اور جہاں یہ اعلان رسالت براہِ راست یا بالواسطہ نہ پہنچادیا گیا ہو۔ اب کسی زمانہ وکسی جگہ میں کوئی نبی پیدا ہوگا تو کیوں؟ اس کی ضرورت کیا ہے؟ وہ آکر کیا کرے گا؟ کیا سُنائے گا؟ کیا سکھائے گا؟ کس کا تزکیہ کرے گا؟ کسے حکمت سکھائے گا؟ کیا وہ حضور ﷺ کے اعلان رسالت سے بڑھ کر کوئی نیا اعلان کریگا؟ یا وہ اس اعلان کے مساوی رتبہ پاکر اعلان کرے گا؟ یا وہ اس سے کمتر درجہ پر فائز ہوکر اعلان کرے گا؟ ظاہر ہے حضور ﷺ سے ماضی میں کوئی نہ بڑھ سکا، آپ ﷺ کے عہد خیر وبرکت میں کوئی برابر نہ ہوسکا۔ کسی کا چراغ نہ جل سکا، برابر ہونا اور چراغ جلانا تو بڑی بات ہے۔ اس پورے عہد میں کوئی بھی نہ ٹھہر سکا، بہتوں نے سرتوڑ

کوشش کی، لسانی، جسمانی اور مادی توانائیوں سے لیس ہوکر بیسیوں مدّ مقابل ہوئے مگر "فجعلهم كعصفٍ ماكول" وہ کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا دیئے گئے اور جو آپ سے رُتبہ میں چھوٹے تھے وہ سب کے سب اللہ نے ماضی میں نبوت ورسالت کے ابتدائی وارتقائی مراحل میں بھیج دیئے وہ آئے اور صرف اپنی اپنی قوموں کو سنوارنے کے لئے آئے اور ان سب سچوں نے (علیہم الصلوٰت والتسلیمات) اپنی اپنی نبوّت ورسالت کی راجدھانی میں، ادائیگی فرض میں اُن کمالاتِ فائقہ کا مظاہرہ کیا اور ایسی مضبوط وقوی جدوجہد فرمائی اور ایثار وقربانی کے ایسے نقوش جریدۂ عالم پہ ثبت کئے کہ انسانی مزاجوں کی ارض ناہموار ایک بہت بڑے آنے والے کے لئے ہموار کردی اور ان تمام انبیاء صادقین (علیہم السلام) اپنے نے اپنے عہد میں اس سب سے عظیم وبزرگ آنے والے کی بشارتیں بانٹیں حسنِ مستقبل کی خوش خبری دی۔

يَاتي من بعدی اسمهٗ احمد

میرے بعد (اب) جس نے آنا ہے ان کا نام نامی ہے، احمد ہے۔

جب پوری انسانیت کو ایک کے انتظار میں سنوارا سجایا اور وہ آنے والے محمد رسول اللہ آگئے جو سب سے اعلیٰ تھے، جو نبوّت ورسالت کے ارتقاء وکمال کی انتہاء تھے، اب اگر کسی نے آنا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ چڑھ کر آئے، اب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم تر درجہ کا پیدا ہو تو عروج سے زوال کی طرف آنیوالی بات ہے اور عظمت سے پستی کی طرف آنے کا تصوّر بھی کونین کی ہلاکت کے مترادف ہے چہ جائیکہ سب چھوٹوں سے بھی چھوٹا چھوٹا ہی نہیں حقیر نہیں، حقیر اور صرف حقیر نہیں حقیر ترین، ہمیں اپنی حقیر ترین شخصیت کی طرف بلائے اس امت کی اس سے زیادہ بے عزتی اور کیا ہوسکتی ہے[۱] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شمولیت کو فخر سمجھیں اور اپنے امتیوں کو

[۱] کہ انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

حضور کی اتباع میں دیکھ کر فرحت وانبساط کا اظہار کریں اور ایک حقیر ترین حضور ﷺ کی امّت گرامی کو اپنی اتباع کی طرف پکارے۔ بغاوت اور کسے کہتے ہیں یہی تو بغاوت ہے۔

نبوّت و رسالت محمد کی

عباء ختمِ نبوّت محمد کی

(صلی اللہ علیہ وآلہ وازواجہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً)

امّت محمد کی

اور اطاعت مرزا غلام احمد کی !

(لعنۃ اللّٰہ علیہ و علی اعوانہٖ وانصارہٖ)

ع

ببیں کہ از کہ بریدی وبا کہ پیوستی

اب انسان اس چھوٹے، کھوٹے اور جھوٹے موٹے کے پیغام نافرجام کے منتظر ہیں؟

جب حضور ﷺ کی نبوّت..........قیامت تک

آپ کی رسالت..........قیامت تک

آپ کی امامت..........قیامت تک

آپ کی امت.....(وہ تمام انسان جو آئیں گے) قیامت تک

تو مسٹر گاما قادیانی کس نسل کے لئے ہے؟ اور کس زمانے کے لئے ہے؟

اور وہ بحیثیت مجدّد ومہدی خلیفہ وامام اور بحیثیت نبی کیا کرے گا آ کر؟ کیا دین میں کوئی کمی ہے جسے وہ پورا کرے گا آ کر؟ کیا نبوت میں کوئی نقص تھا جس کی اس نے تکمیل کرنی ہے؟ کیا انسان دینِ اسلام اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سیر ہو چکے ہیں؟ (معاذ اللہ) جو گاما ان کی پیاس بجھائے گا؟

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ ودل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا؟

اب تو جو بھی اس وادی میں قدم رکھے گا ذلیل ورسوا ہوگا، منہ کے بَل گھسیٹا جائے گا۔ پھر قرآنِ حکیم میں جس طرح حضور ﷺ کی بعثت وآمد کا ذکر سابقہ نبیوں نے فرمایا اگر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد بھی سلسلہ نبوت ورسالت باقی رہنا ہوتا تو یقیناً قرآنِ کریم میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی زبانی اس کی تفصیل بیان ہوجاتی تو ہم سمجھتے کہ ابھی نبوّت تکمیل کے مراحل میں ہے اور ابھی یہ اپنے عروج، کمالِ ارتقاء اور منتہاء مقصود تک نہیں پہنچی۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوّت ورسالت کو ارتقاء کی تمام گھاٹیوں، منزلوں اور مرحلوں سے گزار کر عروج وکمال کی انتہاء تک پہنچا کے یہ سلسلہ مکمل کردیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی۔

یعنی دونوں چیزیں اپنے کمال پر پہنچ چکی ہیں، ان میں کوئی کمی، نقص، عیب، ضعف وکمزوری یا نارسائی کی کوئی بات نہیں رہی۔ نبوّت ورسالت اور پیامِ نبوّت ورسالت دونوں اللہ کی طرف سے ہدایت کے لئے بے مثال وباکمال ہیں۔

اب نہ تو کوئی پیام باقی ہے جو نازل کئے جانے کے قابل ہے
اور نہ ہی کوئی ایسا شخص ہے جو نبوّت کا اہل ہے

اور امام الانبیاء وخاتم الانبیاء سیّدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے بڑے بلیغ پیرائے میں یہ اعلان کرنے کو فرمایا۔ چنانچہ آقا کریم نے یہ اعلان فرمایا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ.

محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے (یا نبیوں پر مُہر)

اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں حقیقت باطنی کو الفاظ کے ظاہری جسم میں منتقل فرمادیا کہ میرے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ نبوت نے اپنے تمام مراحل کا عبوری سفر کرکے اپنی منزل پالی ہے اور یہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں پہنچی ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد کون ہے جو اس منزل سے نکلے اور کون ہے جو عظمتوں کی بلندی کے بعد ذلتوں کی پستی میں اترے؟

بعض لوگ غلام احمد کی ابلیسی تاویلات کو پیش کرتے ہیں اور اس کے ماننے والے موذی بھی لباس تاویل میں ملبوس اور دھوکہ وفریب میں مصروف نظر آتے ہیں، وہ اس آیت کریمہ کے مضمون میں مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ حضور کے تو چار لڑکے تھے اور تم کہتے ہو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تم میں سے کسی کے باپ نہیں۔

حالانکہ جواب قرآن کے لفظوں میں موجود ہے۔ "مِنْ رِّجَالِکُمْ" تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں۔ بچوں کے باپ کی نفی نہیں فرمائی۔ مرد کی نسبت نفی ہے۔ ظاہر ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام چار بچوں کے والد ماجد تو تھے جو بچپن میں ہی موت نے آلئے اور وہ مرد نہ بن سکے۔ مرد تو علی المرتضٰی بنے اور ظاہر ہے وہ بیٹے نہیں تھے زید اور اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سب امتی اور غلام ہی تو تھے، صلبی اولاد نہ تھے۔ اور اگر کوئی اس پر اصرار کرے کہ علی، زید، اُسامہ یا کوئی اور اولاد ہی تھے تو قرآن کریم نے اس کی نفی فرمادی۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَاءَ کُمْ اَبْنَاءَ کُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ

تم جنہیں منہ سے بیٹا کہہ کے پکارو، وہ تمہارے بیٹے نہیں بلکہ یہ تو صرف منہ کی بات ہے۔

ویسے عظمت ورحمتِ نبوی کی عمومیت کے اعتبار سے تو آپ ساری اُمت کے مردوزن کے والد ماجد ہیں۔سیّدنا آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر قیامت تک کے پیدا ہونے والی نسلِ آدم اولادِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے (عظمۃً) یہ بھی ایک مفہوم ہے ''سیّدِ وُلْدِ آدمَ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے اس ارشادِ عالی کا۔

اِنِّی اُبَاهِی بِکُمُ الْاُمَمَ (کنز العمال ص ۲۳۲ ج ۶)

مرزائیوں کا نامعقول اور تلبیسی عمل یہ بھی ہے کہ جو مسلمان دینی تعلیم کی نعمت سے محروم ہیں، زبان وبیان، لغت اور گرائمر تک سے قطعاً ناآشنا ہیں، گو جدید تعلیم یافتہ ہیں انہیں لفظ خاتم کے لغوی معنٰی میں الجھا کر چت کرالیتے ہیں۔قارئین حیران ہوں گے کہ اس معاملہ میں قصہ (حکایت اور روایت) فروش مذہبی طبقاتی کش مکش کے بڑے ماہر ہوتے ہیں میں نے مرزائیوں کی اس چالاکی اور حرفت کے سامنے جزبز ہوتے دیکھے اس وقت ان کے چہرے کی حالت وکیفیت ایسی دیکھی جیسے رگوں میں خون منجمد کردینے والی سردیوں کی یخ بستہ اور تاریک رات میں ویران وسنسان سڑکیں حالانکہ اس صدی کے ہمارے اسلاف،

امام المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ

امیرِ پیرانِ پنجاب حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ تعالیٰ

امام المناظرین حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

امیر المناظرین حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری رحمہ اللہ تعالیٰ

مفتیِ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی اموی رحمہم اللہ تعالیٰ وتغمد ثراھم ومثواھم

اور دیگر بزرگانِ ملت ورہنمایانِ امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) نے اس موضوع پر اس قدر علمی خدمت کی ہے کہ عام اُردو پڑھنے والا مسلمان بھی اگر تھوڑی سی توجہ کرے تو یہ مشکل نہایت آسان ہوجاتی ہے۔ (ماہانہ نقیب ختم نبوۃ ملتان۔فروری ۱۸۹۱ء)

لفظ خاتم

❶ اگر زبر اور زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ ہیں نگینہ اور مہر جس پر نام یا عبارت کندہ کرائی جائے۔

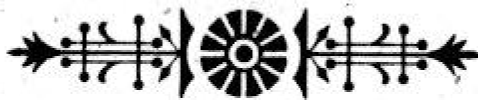
❷ خَاتِم زیر اور زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنیٰ انگوٹھی بھی ہے۔

❸ خِاتَم زیر اور زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو آخر القوم یعنی قوم کا آخری فرد بھی اس کا معنیٰ ہے۔

❹ خَاتَم زیر اور زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو گھوڑے کے پاؤں کی سفیدی کو بھی خاتم کہتے ہیں۔

❺ خَاتَم زیر اور زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ گدی کے نیچے کا گڑھا ہے[1]

اب مرزائی بتائیں ان پانچوں معنوں میں سے کون سا معنیٰ حضور ﷺ کے لئے استعمال کرنا پسند کرتے ہیں، ان معنوں میں سے کوئی معنیٰ باعتبار فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کے قوائد و ضوابط کی رو سے ادب جاہلی سے لیکر آج تک کوئی ایک شعر، ایک جملہ، ایک قائدہ و ضابطہ بیان کریں جس سے کسی عام انسان کو ان مذکورہ بالا معنوں سے منسوب کیا گیا ہو چہ جائیکہ ان معنوں سے انبیاء کے امام محمد رسول ﷺ کو پکارا لکھا اور پڑھا جائے، میرا تو خیال ہے کہ عربی زبان کی بلاغتوں اور نزاکتوں کے شناسا کفار بھی یہ حماقت کبھی نہ کریں جو غلام احمد ملعون نے کی لفظ خَاتَمُ کی۔



[1] لسان العرب، تاج العروس، صحاح جوہری، قاموس، مفتی الادب وغیرہ دیکھئے ۱۲

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

دعاویٔ مرزا غلام احمد قادیانی

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر آپ کے شاگردان رشید حضرات اکابر دیوبند نے قادیانیت کی تردید میں رسائل لکھے اور ردقادیانیت کے لٹریچر میں ایک گرانقدر ذخیرہ علمی جمع کر دیا۔ تب اس زمانہ میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''دعاویٔ مرزا'' رسالہ تحریر فرمایا۔ نئے حوالجات کے ساتھ پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔ فالحمدللّٰہ اولاً وآخراً (مرتب)

الحمدللہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصاً علی سیدنامحمد المجتبی ومن یھدیہ اھتدی!

یوں تو مہدی بھی ہو عیسیٰ بھی ہو سلطان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دنیا میں بہت سے گمراہ فرقے پیدا ہوئے اور آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مرزائی فرقہ ایک عجیب چیستان ہے کہ اس کے دعوے اور عقیدے کا پتہ آج تک خود مرزائیوں کو بھی نہیں لگا، جس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ اس فرقے کے بانی مرزا قادیانی نے خود اپنے وجود کو دنیا کے سامنے ایک لاینحل معمے کی شکل میں پیش کیا ہے اور ایسے متناقض اور متضاد دعوے کئے کہ خود ان کی امت بھی مصیبت میں ہے کہ ہم اپنے گرو کو کیا کہیں؟ کوئی تو ان کو مستقل صاحبِ شریعت نبی کہتا ہے، کوئی غیر تشریعی نبی مانتا ہے اور کسی نے ان کی خاطر ایک نئی قسم کا نبی لغوی

تراشا ہے اور ان کو مسیح موعود ''مہدی'' اور لغوی یا مجازی نبی کہتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ مرزا قادیانی کا وجود ایک ایسی چیستان ہے جس کا حل نہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں جو کچھ اپنے متعلق لکھا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ متعین کرنا بھی دشوار ہے کہ مرزا قادیانی انسان ہیں یا اینٹ پتھر؟ مرد ہیں یا عورت؟ مسلمان ہیں یا ہندو؟، مہدی ہیں یا حارث؟ والی ہیں یا نبی؟ فرشتے ہیں یا دیو؟ جیسا کہ دعاوی مندرجہ رسالہ ہذا سے معلوم ہوتا ہے۔

نوٹ: اگر کوئی مرزائی یہ ثابت کردے کہ یہ عبارت مرزا قادیانی کی نہیں تو اس کو فی عبارت دس روپیہ انعام دیا جائے گا۔

مرزائیوں کے تمام فرقوں کو کھلا چیلنج؟

دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مرزائی امت کے تینوں فرقے مل کر قیامت تک یہ بھی متعین نہیں کر سکتے کہ مرزا قادیانی کا دعویٰ کیا ہے اور وہ کون ہے اور کیا ہے؟ دنیا سے اپنے آپ کو کیا کہلوانا چاہتا ہے؟ لیکن جب ہم ان کی تصانیف کو غور سے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعاویٰ میں اختلاط واختلاف بھی ان کی ایک گہری چال ہے۔ وہ اصل میں خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھا کہ قوم اس کو تسلیم نہ کرے گی۔ اس لئے تدریج سے کام لیا۔ پہلے خادم اسلام مبلغ بنے۔ پھر مجدد ہوئے۔ پھر مہدی ہو گئے۔ اور جب دیکھا کہ قوم میں ایسے بیوقوفوں کی کمی نہیں جو ان کے ہر دعوے کو مان لیں تو پھر کھلے بندوں، نبی رسول، خاتم الانبیاء، وغیرہ سبھی کچھ ہو گئے، اور ہونہار مرد نے اپنے آخری دعوے خدائی کی بھی تمہید ڈال دی تھی۔ جس کی تصدیق عبارات مذکورہ ۲۶ تا ۳۰ سے بخوبی ہوتی ہے۔ لیکن قسمت سے عمر نے وفا نہ کی۔ ورنہ مرزائی دنیا کا خدا بھی نئی روشنی اور نئے فیشن کا بن گیا ہوتا۔ خود مرزا قادیانی کی عبارات ذیل میں اس تدریجی ترقی اور اس کے سبب پر ہمارے دعوے کے گواہ ہیں۔ مرزا قادیانی نے لکھا ہے کہ:

''میری دعوت کے مشکلات میں سے ایک رسالت ایک وحی الٰہی ایک مسیح موعود کا دعویٰ تھا۔'' (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۵۳ خزائن ج ۲۱ ص ۶۸)

پھر کہتے ہیں کہ علاوہ اس کے اور مشکلات یہ معلوم ہوتے ہیں کہ بعض امور اس دعوت میں ایسے تھے کہ ہرگز امید نہ تھی کہ قوم ان کو قبول کر سکے۔ اور قوم پر تو اس قدر بھی امید نہ تھی کہ وہ اس امر کو بھی تسلیم کر سکیں کہ بعد زمانہ نبوت وحی غیر تشریعی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور قیامت تک باقی ہے۔

نیز حقیقت الوحی کی عبارت ذیل بھی خود اس تدریجی ترقی کی شاہد ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مرزا قادیانی ختم نبوت کے قائل تھے اور کسی نبی کا پیدا ہونا جائز نہ رکھتے تھے۔ اور اپنے آپ کو نبی نہیں کہتے تھے۔ بعد میں ارزانی غلہ نے نبی بنا دیا۔ لکھتے ہیں:

''اسی طرح اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مسیح ابن مریم سے کیا نسبت ہے۔ وہ نبی تھے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے اور اگر کوئی امر میری فضیلت کے متعلق ظاہر ہوتا تھا تو میں اس کو جزوی فضیلت قرار دیتا تھا مگر بعد میں جو خدائے تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی۔ اس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا۔''

(حقیقت الوحی ص ۱۴۹، ص ۱۵۰، روحانی خزائن ج ۲۲، ۱۵۳، ۱۵۴)

اس کے بعد ہم مرزا قادیانی کے دعاوی خود ان کی تصانیف سے مع حوالہ صفحات نقل کرتے ہیں جو دعوے متعدد کتابوں اور مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ بغرض اختصار عبارات تو ان میں سے ایک ہی نقل کر دی گئی ہے، باقی کے حوالہ صفحات درج کئے گئے ہیں۔

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفی اللہ عنہ وعافاہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

❶......مبلغ اسلام اور مصلح ہونے کا دعویٰ

''یہ عاجز مولف براہین احمدیہ حضرت قادر مطلق جل شانہ کی طرف سے مامور ہوا ہے کہ بنی اسرائیلی مسیح کے طرز پر کمال مسکینی وفروتنی اور غربت اور تذلل وتواضع سے اصلاح خلق کے لئے کوشش کرے۔'' (مجموعہ اشتہارات ج۱ ص۲۳)

❷......مجدد ہونے کا دعویٰ

اب بتلائیں کہ اگر یہ عاجز حق پر نہیں ہے تو پھر وہ کون آیا جس نے اس چودھویں صدی کے سر پر مجدد ہونے کا ایسا دعویٰ کیا جیسا کہ اس عاجز نے کیا''۔

(ازالۂ اوہام ص۱۵۴، خزائن ج۳ ص۱۷۹ ملخص)

❸......محدث ہونے کا دعویٰ

''اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عاجز خدائے تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے محدث ہو کر آیا ہے اور محدث بھی ایک معنے سے نبی ہوتا ہے۔ گو اس کے لئے نبوت تامہ نہیں مگر تاہم جزئی طور پر وہ ایک نبی ہے۔''

(توضیح المرام ص۱۸، خزائن ج۳ ص۶۰، ازالۂ اوہام ص۵۸۷، خزائن ج۳ ص۴۱۶)

❹......امام زماں ہونے کا دعویٰ

''میں لوگوں کے لئے تجھے امام بناؤں گا، تو ان کا رہبر ہوگا۔''

(ضرورۃ الامام ص۲۶، خزائن ج۱۳ ص۴۹۷)

❺......خلیفۂ الٰہی اور خدا کا جانشین ہونے کا دعویٰ

''میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنا جانشین بناؤں تو میں نے آدم کو یعنی تجھے پیدا کیا۔'' (حقیقت الوحی ص۷۶، روحانی خزائن ج۲۲ ص۷۹)

❻......مہدی ہونے کا دعویٰ

اشتہار معیار الاخیار وریویو آف ریلجنز نومبر ودسمبر ۱۹۰۳ء وغیرہ، یہ دعویٰ مرزا قادیانی کی اکثر تصانیف میں بکثرت موجود ہے۔ اس لئے عبارت کی حاجت نہیں۔

❼.....حارث مددگار مہدی ہونے کا دعویٰ

"واضح ہو کہ یہ پیشن گوئی جو ابوداؤد کی صحیح میں درج ہے کہ ایک شخص حارث نام یعنی حارث ماوراء نہر سے یعنی سمرقند کی طرف سے نکلے گا جو آل رسول کو تقویت دے گا۔ جس کی امداو نصرت ہر ایک مؤمن پر واجب ہوگی۔ الہامی طور پر مجھ پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ پیشن گوئی اور مسیح کے آنے کی پیشن گوئی جو مسلمانوں کا امام اور مسلمانوں میں سے ہوگا دراصل یہ دونوں پیشن گوئیاں متحد المضمون ہیں۔ اور دونوں کا مصداق یہی عاجز ہے۔" (ازالہ ہام ص ۹۷ روحانی خزائن ج ۳ ص ۱۴۱)

❽.....نبی امتی اور بروزی وظلی یا غیر تشریعی ہونے کا دعویٰ

"اور چونکہ وہ بروز محمدی جو قدیم سے موعود تھا وہ میں ہوں۔ اس سے بروزی رنگ کی نبوت مجھے عطا کی گئی۔" (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ ص ۱۱ روحانی خزائن ج ۱۸ ص ۲۱۵)

❾.......نبوت ورسالت اور وحی کا دعویٰ

"سچا خداوہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔" (دافع البلاء ص ۱۱ خزائن ج ۱۸ ص ۲۳۱) "حق یہ ہے کہ خدا کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے لفظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں۔ نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ۔" (براہین احمدیہ ص ۴۹۸) نیز یہی مضمون (اربعین نمبر ۴ ص ۶ اور نزول المسیح ص ۹۹، روحانی خزائن ج ۱۸ ص ۴۷۷ میں) بکثرت موجود ہے۔

❿.....اپنی وحی کے بالکل قرآن کے برابر واجب الایمان قطعی ہونے کا دعویٰ

"میں خدا کی تئیس برس کی متواتر وحی کو کیسے رد کر سکتا ہوں۔ میں اس کی اس پاک وحی پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ ان تمام وحیوں پر ایمان لاتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں۔"

(حقیقت الوحی ص ۱۵۰ ایضاً ص ۲۱۱، خزائن ج ۲۲ ص ۱۵۲، ص ۲۲۰، انجام آتھم ص ۶۲، خزائن ج ۱۱ ص ایضاً)

⓫ .....سارے عالم کیلیئے مدار نجات ہونے کا دعویٰ اور یہ کہ اپنی امت کے سوا امت محمدیہ کے چالیس کروڑ مسلمان کافر جہنمی ہیں

''کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر کہ ایک شخص اسلام سے انکار کرتا ہے اور آنحضرت ﷺ کو خدا کا رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجتہ کے جھوٹا جانتا ہے۔ جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارہ میں خدا اور سول نے تائید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتاب میں بھی تاکید پائی جاتی ہے، پس اس لئے کہ وہ خدا اور سول کے فرمان کا منکر ہے کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔''

(حقیقت الوحی ص ۱۷۹ ' خزائن ج ۲۲ ص ۱۸۵)

''اور اس بات کو تقریباً نو برس کا عرصہ گزر گیا کہ جب میں دہلی گیا تھا اور میاں نذیر حسین غیر مقلد کو دعوت دین اسلام کی گئی۔'' (اربعین نمبر ۴ حاشیہ ' خزائن ۱۷ ص ۴۴۱ حاشیہ)

یہی دعویٰ سیرت الابدال ' انجام آتھم وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔ اور کہتے ہیں کہ: ''اب دیکھو خدا نے میری وحی اور میری تعلیم اور میری بیعت کو نوح کی کشتی قرار دیا اور تمام انسانوں کے لئے مدار نجات ٹھہرایا۔''

(اربعین نمبر ۴ ص ۶ ' خزائن ج ۱۷ ص ۴۳۵)

⓬ ......مستقل تشریعی نبی ہونے کا دعویٰ اور یہ کہ وہ احادیث نبویہ پر حاکم ہے جس کو چاہے قبول کرے اور جس کو چاہے ردّی کی طرح پھینک دے

''اور مجھے بتلایا گیا تھا کہ تیری خبر قرآن اور حدیث میں موجود ہے اور تو ہی اس آیت کا مصداق ہے۔ هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دين الحق ليظهره على الدين كله !(اعجاز احمدی ص ۷' خزائن ج ۱۹ ص ۱۱۳) اس عبارت میں نبوت تشریعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہمارے رسول ﷺ اس آیت کے مصداق نہیں جو صریح کفر ہے اور کہتا ہے کہ: ''اگر کہو کہ صاحب الشریعت افتراء

کر کے ہلاک ہوتا ہے نہ ہر ایک مفتری تو اول تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ خدا نے افتراء کے ساتھ شریعت کی کوئی قید نہیں لگائی۔ ماسوائے اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے، جس نے اپنی وحی کے ذریعہ چند امر اور نہی بیان کئے۔ وہی صاحب شریعت ہوگیا۔ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں۔ کیونکہ میری وحی میں امر بھی اور نہی بھی۔ مثلاً یہ الہام: ''قل للمؤ منین یغضوا من ابصارھم ذالك از کي لھم''۔ یہ براہین احمدیہ میں درج ہے اور اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور اس پر تیئیس برس کی مدت بھی گزر گئی اور ایسا ہی اب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی۔ (اربعین نمبر ۴ص ۶' خزائن ج ۱۷ص ۴۳۵)

پھر لکھتے ہیں: ''چونکہ میری وحی میں امر بھی اور نہی بھی اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید بھی۔'' (اربعین نمبر ۴ص ۶' خزائن ج ۱۷ص ۴۳۵ حاشیہ)

''اور ہم اس کے جواب میں خدا کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعوے کی حدیث بنیاد نہیں بلکہ قرآن اور وہ وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں! تائیدی طور پر وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردّی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔'' (اعجازِ احمدی ص ۳۰' ۳۱' خزائن ج ۱۹ص ۱۴۰)

⓭ ......اپنے لئے دس لاکھ معجزات کا دعویٰ

''اور میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اسی نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے اور اس نے میری تصدیق کے لئے بڑے بڑے نشانات ظاہر کئے جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔'' (تتمہ حقیقت الوحی ص ۶۸' خزائن ج ۲۲ص ۵۰۳) اور براہین احمدیہ حصہ پنجم میں: ''دس لاکھ تعداد معجزات شمار کی ہے۔''

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم ص ۵۸' خزائن ج ۲۱ص ۷۵)

۱۴..... تمام انبیاءِ سابقین سے افضل ہونے کا دعویٰ اور سب کی توہین

"بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثناء ہمارے نبی ﷺ کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں ان کا ثبوت اس کثرت کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے اور خدا نے اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔" (تتمہ حقیقت الوحی ص ۱۳۶، خزائن ج ۲۲ ص ۵۷۴)

۱۵..... آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ان کو اس کلام میں آدمؑ قرار دیا ہے: "یا آدم اسکن انت وزوجک" (اربعین نمبر ۳ ص ۲۳، روحانی خزائن ج ۱۷ ص ۴۱۰، ۴۱۱)

۱۶..... ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

"آیت: "واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی" اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب امت محمدیہ میں بہت فرقہ ہو جائیں گے۔ تب آخر زمانہ میں ایک ابراہیم پیدا ہوگا اور ان سب فرقوں میں وہ فرقہ نجات پائے گا کہ اس ابراہیم کا پیرو ہوگا۔" (اربعین نمبر ۳ ص ۳۲، خزائن ج ۱۷ ص ۴۲۱)

۱۷..... نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۱۸..... یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۱۹..... موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۰..... داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۱..... شیث علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۲..... یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۳..... اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۴..... یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

۲۵..... اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

''میں آدم ہوں، میں شیث ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحٰق ہوں، میں اسماعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، میں یوسف ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ہوں، اور آنحضرت ﷺ کے نام کا مظہر اتم ہوں۔ یعنی ظلی طور پر میں محمد اور احمد ہوں۔'' (حاشیہ حقیقت الوحی ص ۷۲، خزائن ج ۲۲ ص ۷۶)

۲۶......عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلاۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

''اس خدا کی تعریف جس نے تجھے مسیح بن مریم بنایا۔'' (حاشیہ حقیقت الوحی ص ۷۲، خزائن ج ۲۲ ص ۷۵) یہ دعویٰ تقریباً سب ہی کتابوں میں موجود ہے۔

۲۷......عیسیٰ علیہ السلام افضل ہونے کا دعویٰ اور ان کو مغلظات، بازاری گالیاں

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے
(دافع البلاء ص ۲۰، خزائن ج ۱۸ ص ۲۴۰)

''خدا نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مسیح ابن مریم میرے زمانہ میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں ہرگز نہ کر سکتا۔ اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں ہرگز نہ دکھلا سکتا''۔ (حقیقت الوحی ص ۱۴۸، خزائن ج ۲۲ ص ۱۵۲) ''آپ کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے۔ تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زنا کار کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔'' (حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم ص ۷، خزائن ج ۱۱ ص ۲۹۱) ''پس اس نادان اسرائیلی نے ان معمولی باتوں کا پیشن گوئی کیوں نام رکھا۔'' (ضمیمہ انجام آتھم ص ۴، خزائن ج ۱۱ ص ۲۸۸) ''یہ بھی یاد رہے کہ آپ کو کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی۔''
(حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم ص ۵، خزائن ج ۱۱ ص ۲۸۹)

۲۸......نوح علیہ الصلاۃ والسلام سے افضل ہونے کا دعویٰ اور ان کی توہین

''اور خدائے تعالیٰ میرے لئے اس کثرت سے نشان دکھلا رہا ہے کہ اگر نوح

علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں وہ نشان دکھلائے جاتے تو وہ لوگ غرق نہ ہوتے۔''
(تتمہ حقیقت الوحی ص۱۳۷، خزائن ج۲۲ ص۵۷۵)

۲۹......مریم علیہ الصلاۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

''پہلے خدا نے میرا نام مریم رکھا اور بعد اس کے ظاہر کیا کہ اس مریم میں خدا کی طرف سے روح پھونکی گئی اور پھر فرمایا کہ روح پھونکنے کے بعد مریمی مرتبہ عیسوی مرتبہ کی طرف منتقل ہوگیا اور اس طرح مریم سے عیسیٰ پیدا ہوکر ابن مریم کہلایا۔''
(حاشیہ حقیقت الوحی ص۷۲، روحانی خزائن ج۲۲ ص۷۵)

۳۰......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابری کا دعویٰ

''یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس واسطہ کوملحوظ رکھ کر اور اس میں ہوکر اور اس نام محمد و احمد سے مسمی ہوکر میں رسول بھی ہوں اور نبی بھی۔'' (ایک غلطی کا ازالہ ص۷، روحانی خزائن ۱۸ص ۲۱۱) ''بارہا بتلا چکا ہوں کہ میں بموجب آیت: ''و آخرین منهم لما یلحقوا بهم۔'' بروزی طور پر وہی خاتم الانبیاء ہوں۔'' (ایک غلطی کا ازالہ ص۸ خزائن ج۱۸ص ۲۱۲) اکثر ان اوصاف کو اپنے لئے ثابت کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں۔

۳۱......ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے افضلیت کا دعویٰ

''ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد صرف تین ہزار لکھی ہے۔'' (تحفہ گولڑویہ ص۴۰، روحانی خزائن ج۱۷ ص۱۵۳) اور اپنے معجزات کی تعداد براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۵٦، خزائن ج۲۱ ص۷۲ پر دس لاکھ بتلائی ہے: ''له خسف القمر المنیر وان لی غسا القمران المشرقان اتنکرو۔'' اس کے لئے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چاند کے خسوف کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں کا۔ اب کیا تو انکار کرے گا۔'' (اعجاز احمدی ص۷۱، روحانی خزائن ج۱۹ ص۱۸۳) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر افضلیت کے دعوے کے ساتھ معجزہ شق القمر کا انکار اور توہین بھی ہے۔

۳۲......میکائیل علیہ الصلاۃ والسلام ہونے کا دعویٰ

"اور دانیال نبی نے اپنی کتاب میں میرا نام میکائیل رکھا ہے۔"

(حاشیہ اربعین نمبر۳ص ۲۵ خزائن ج ۱۷ص ۴۱۳)

۳۳......خدا کی مثل ہونے کا دعویٰ

"اور عبرانی میں لفظی معنے میکائیل کے ہیں خدا کے مانند۔"

(حاشیہ اربعین نمبر۳ص ۲۵ خزائن ج ۱۷ص ۴۱۳)

۳۴......اپنے بیٹے کا خدا کی مثل ہونے کا دعویٰ

"انا نبشرك بغلام مظهر الحق و العلى كان الله نزل من السماء۔"

(استفتاء ص ۸۵ خزائن ج ۲۲ص ۷۱۲)

۳۵......خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ

"انت منى بمنزلة اولادى" (حاشیہ اربعین نمبر۴ص ۱۹ خزائن ج ۱۷ص ۴۵۲)

۳۶......اپنے اندر خدا کے اتر آنے کا دعویٰ

آپ کو الہام ہوا: "آوا ہن" جس کی تفسیر خود ہی یہ کرتے ہیں کہ: "خدا تیرے اندر اتر آیا۔" (کتاب البریہ ص ۷۷ خزائن ج ۱۳ص ۱۰۲)

۳۷......خود خدا ہونا بحالتِ کشف اور زمین و آسمان پیدا کرنا

"اور میں نے اپنے کشف میں دیکھا کہ میں خود خدا ہوں اور یقین کیا کہ وہی ہوں۔ (پھر کہتا ہے) اور اس کی الوہیت مجھ میں موجزن ہے۔ (پھر کہتا ہے) اور اس حالت میں یوں کہہ رہا تھا کہ ہم ایک نیا نظام اور آسمان اور نئی زمین چاہتے ہیں تو میں نے پہلے تو آسمان و زمین کو اجمالی صورت میں پیدا کیا۔ جس میں کوئی ترتیب اور تفریق نہ تھی۔ پھر میں نے منشاء حق کے موافق اس کی ترتیب و تفریق کی اور میں دیکھتا تھا کہ میں اس کے خلق پر قادر ہوں۔ پھر میں نے آسمان دنیا کو پیدا کیا اور کہا: "انا زينا السماء الدنيا بمصابيح"۔ پھر میں نے کہا اب ہم انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کریں گے۔ پھر میری حالت کشف سے الہام کی طرف منتقل ہوگئی

اور میری زبان پر جاری ہوا: ’’اردت ان استخلف فخلقت آدم انا خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔‘‘ یہ الہامات ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے پر ظاہر ہوئے۔‘‘

(کتاب البریہ ص ۸۵ ،۸۶ ،۸۷ خزائن ج ۱۳ ص ۱۰۳ ،۱۰۴ ،۱۰۵) (آئینہ کمالات اسلام ص ۵۶۴ ،۵۶۵ خزائن ۵ ص ایضاً)

۳۸......مرزا قادیانی میں حیض کا خون ہونا اور پھر اس کا بچہ ہونا

’’منشی الٰہی بخش کی نسبت یہ الہام ہوا۔ یہ لوگ خون حیض تجھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی ناپاکی پلیدی اور خباثت کی تلاش میں ہیں اور خدا چاہتا ہے کہ جو اپنی متواتر نعمتیں جو تیرے پر ہیں دکھلائے اور خون حیض سے تجھے کیونکر مشابہت ہو اور وہ کہاں تجھ میں باقی ہے۔ پاک تغیرات نے اس خون کو خوبصورت لڑکا بنادیا اور وہ لڑکا جو اس خون سے بنا میرے ہاتھ سے پیدا ہوا۔‘‘ (حاشیہ اربعین نمبر ۴ ص ۱۹ ،خزائن ۱۷ ص ۴۵۲)

۳۹......حاملہ ہونا

عبارت مذکورہ۔ (کشتی نوح ص ۴۷ ،روحانی خزائن ج ۱۹ ص ۵۰)

۴۰......حجر اسود ہونے کا دعویٰ

الہام یہ ہے کہ:

یکے پائے من مے بوسد ومن میگفتم کہ حجر اسود منم

(حاشیہ اربعین نمبر ۴ ص ۱۵ ،روحانی خزائن ج ۱۷ ص ۴۴۵)

۴۱......بیت اللہ ہونے کا دعویٰ

’’خدا نے اپنے الہامات میں میرا نام بیت اللہ بھی رکھا ہے۔‘‘

(حاشیہ اربعین نمبر ۴ ص ۱۵ ،خزائن ۱۷ ص ۴۴۵)

۴۲......سلمان ہونے کا دعویٰ

الہام ہوا: ’’انت سلمان منی یاذاالبرکات۔‘‘ (تذکرہ ص ۶۰۳)

۴۳......کرشن ہونے کا دعویٰ

’’آریہ قوم کے لوگ کرشن کے ظہور کا ان دنوں میں انتظار کرتے ہیں۔ وہ کرشن

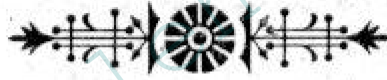
میں ہی ہوں۔" (تمہ حقیقت الوحی ص ۸۵ خزائن ج ۲۲ص ۵۲۱)

۴۴......آریوں کا بادشاہ ہونے کا دعویٰ

"اور یہ دعویٰ صرف میری طرف سے نہیں بلکہ خدا نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا وہ تو ہی ہے۔آریوں کا بادشاہ۔"
(تمہ حقیقت الوحی ص ۸۵ خزائن ج ۲۲ص ۵۲۲)

نبی اور عیسیٰ تو اپنی زبانی بن گیا مگر بادشاہت میں زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا۔اس لئے پھر کہا کہ بادشاہت سے مراد آسمانی بادشاہت ہے۔فقط!

(ماہنامہ لالوک ملتان)



مفتی اعظم پاکستان، مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا

عُلمائے کرام سے خصوصی خطاب

۲۵ شوال ۱۳۸۴ھ بروز ہفتہ۔ مدرسہ محمودیہ، امانت گنج ضلع بریسال۔
مشرقی پاکستان بوقت گیارہ بجے۔

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُوْءِ مِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّل عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَن یَّھْدِہِ اللّٰہ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَن یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. (امابعد)

عربی کا یہ مسنون خطبہ جو میں نے ابھی پڑھا، تقریروں، مواعظ اور خطبات کے شروع میں پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اس خطبہ کے مضامین کی طرف عام طور سے توجہ نہیں کی جاتی، آج کی مجلس میں اسی کے بعض اجزاء کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ ' کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد اس بات پر کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اس نیک کام کے ارادہ کی توفیق دی، وَنَسْتَعِیْنُہٗ ارادے بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے پورے نہیں ہوسکتے اس لئے مدد طلب کرتے ہیں۔

وَنَسْتَغْفِرُہٗ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ استغفار کس چیز سے کیا جارہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہمارے گناہ جو ہم سے ہر وقت ہوتے رہتے ہیں وہ ہمارے نیک کاموں میں رکاوٹ اور سدِّ راہ ہیں، اس لئے ان کی مغفرت طلب کی گئی۔

"نستعینه" اور " نستغفرہ" میں یہ جوڑ ہے کہ اوّل طلب اعانت کے لئے ہے اور ثانی رفعِ موانع (یعنی رکاوٹوں اور مشکلات کو دُور کرنے) کیلئے۔

وَنعوذ باللّٰہِ من شرور انفسنا نفس کے شرور (گناہ) ہمارے تمام نیک کاموں کو بے روح کردیتے ہیں، مثلاً تکبر ریا عُجب وغیرہ۔ اس لئے ان سے پناہ مانگی گئی۔

وَمِن سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا سیئات کی اضافت اعمال کی جانب صفت کی اضافت موصوف کی جانب کے قبیل سے میرے نزدیک نہیں۔ بلکہ یہ اضافت بیانیہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سیّئات (گناہ) یہی اعمال ہوتے ہیں جن کو ہم نیکی سمجھ کر کرتے ہیں، آج کی مجلس میں میں اسی چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، باتیں بہت ہیں، اس لئے کوئی ترتیب قائم کرنا بھی مشکل ہے، بس ایک دردِ دل ہے، وہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ دے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے کہ نہ رہے

ہمارے مدرسے اور خانقاہیں تیس ۳۰ چالیس ۴۰ سال سے بانجھ ہیں، ان مدرسوں سے اَب آدمی (تربیت یافتہ) یا مسلمان (اللہ والے) پیدا نہیں ہوتے ہیں، بلکہ "مولانا" پیدا ہوتے ہیں۔ یا تو یہ حالت تھی کہ میرے والد[ا] صاحب کا ارشاد ہے کہ:

"میں نے دارالعلوم دیوبند کا وہ وقت دیکھا ہے جب مہتمم اور صدر مدرس سے چپراسی اور دربان تک ہر ایک صاحبِ نسبت ولی اللہ تھا، دربان چوکیداری کر رہا ہوتا تھا، اور ساتھ ہی اس کے لطائف ستہ جاری رہتے تھے، دن کو وہ مدرسہ تھا اور رات کو خانقاہ، رات کو ہر کمرہ سے گریہ وزاری اور ذکر اللہ کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔"

"در مدرسہ خانقاہ دیدم"

چنانچہ حضرت شیخ الهند رحمہُ اللہُ تعالیٰ نے مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اِن الفاظ

[ا] یعنی حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمہُ اللہُ تعالیٰ صدر مدرس درجۂ فارسی دارالعلوم دیوبند۔

میں نکالی تھی کہ

"در مدرسہ خانقاہ دیدم"

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوپاکستان اور باہر کے ممالک میں بھی جہاں کہیں دین نظر آتا ہے اُس میں دیوبند کا بہت بڑا حصہ ہے۔

دنیا میں محققین کی کوئی کمی نہیں، مگر دیوبند کا جو خاص رنگ ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ چند سال قبل میں دمشق کی ایک کانفرنس میں شریک ہوا وہاں دنیا بھر کے علماء تھے، وہاں بھی اس کا مشاہدہ ہوا۔ دیوبند کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں، لفظ کے ساتھ معنی، ظاہر کے ساتھ باطن اور علم کے ساتھ عمل موجود تھا۔

آج نئے نئے فتنے تیزی سے اُٹھ رہے ہیں۔ مغربی تہذیب کے اثرات کراچی میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور وہاں لادینی تیزی سے پھیل رہی ہے، مگر ایک لادینی میں مشرقی پاکستان عرصہ سے آگے بڑھا ہوا ہے، وہ ہے ہندو مسلم کا اشتراک (دوستی)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مسلمانوں کو کس طرح تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ان کا قتلِ عام ہوا؟ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی ۵۰ ہزار عورتیں ہندوؤں اور سکھّوں کے قبضے میں چلی گئیں، علامہ بغدادی نے لکھا ہے کہ سقوطِ بغداد کے وقت کئی لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ مگر عورتوں کی عصمت کی قربانی مسلمان نے کبھی نہیں دی تھی، یہ مصیبت سب سے پہلے ہم پر نازل ہوئی، اس کے باوجود ہندوؤں کو ہم نے بھائی بنا رکھا ہے حالانکہ قرآن نے ان کو ہمارا دشمن قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسلام اور ایمان کو اُخوّت اور برادری کی بنیاد قرار دیا تھا، اور ہم وطنی کی بنیاد پر اللہ کے دشمنوں کو اپنا بھائی بنا کر دوسرے صوبے کے مسلمانوں کو اپنا دشمن بنا رہے ہیں۔ تو ایک لادینی تو یہ ہے جو مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے، اور باقی عیاشیوں اور بے حیائی میں کراچی اور مغربی پاکستان سب کا امام بنا ہوا ہے، غرض بے دینی ہر طرف

مختلف صورتوں میں تیزی سے پھیل رہی ہے، مگر آج کے مولوی کو اس کی فکر نہیں، وہ کبھی ان حالات پر غور نہیں کرتا، آنحضرت ﷺ نے ہرقل قیصرِ روم کو لکھا تھا کہ:

وَان تولّیتَ فَاِنَّ عَلَیْكَ اِثْمَ الْیَرِیْسِیِّیْن

(اگر تو نے دین سے روگردانی کی تو تجھ پر تیری رعایا کا بھی گناہ ہوگا)

آپ حضرات عام مسلمانوں کے پیشویٰ اور مقتدیٰ ہیں، لہٰذا آپ حضرات پر ان حالات میں سب سے زیادہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔

اگر ہمارے دل مین دین کا درد ہوتا تو ممکن نہیں تھا، کہ دین سے یہ بغاوت ہوتی رہے اور ہم خاموش و غافل بیٹھے رہیں۔

ایک مرتبہ حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں کچھ زمانہ غیبوبت کے بعد حاضر ہوا تو دیکھا کہ بہت کمزور ہورہے ہیں، جیسے کئی مہینے سے بیمار ہوں، پوچھنے پر فرمایا کہ بھائی مسلمان تباہ ہوگیا، اسے نہ ہندو پوچھتا ہے نہ انگریز۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب کانگریس نے اپنی وزارت بنائی مگر مسلمانوں کو قطعاً نظرانداز کردیا۔

اسی طرح حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو اُس وقت احقر نے دیکھا جب عنایت اللہ مشرقی کا فتنہ ملک میں پھیل رہا تھا۔ حالانکہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشاغل سیاسی نہیں تھے مگر چونکہ دین کا درد تھا اس لئے بے چین تھے، مگر ہم نہایت اطمینان سے بے دینی کے اس سیلاب کو برداشت کررہے ہیں، مگر ہمارے ایک پیسہ کا نقصان ہونے لگے تو بوکھلا جاتے ہیں۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ ہم تدریس، تبلیغ وغیرہ جو کچھ کرتے ہیں، وہ دین کے لئے نہیں بلکہ دُنیا کے لئے ہے۔

دُوسری خرابی یہ ہے کہ آجکل مولویوں کا نیلام ہوتا ہے، مولوی کو جہاں پانچ روپے زیادہ مل جائیں چلے جاتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں جب میری تنخواہ ۳۵ روپے تھی، اس وقت کلکتہ میں مجھے سات ۷۰۰ سو روپے کی پیشکش کی گئی جو میں نے قبول نہیں کی، ہمارے

بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے، لیکن اب یہ بات ہمارے طبقہ میں ختم ہوتی جارہی ہے۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ ہم اپنے پڑھنے پڑھانے کا مقصد گم کرچکے ہیں، تدریس ایک پیشہ بن چکا ہے، پیشِ نظر یہ نہیں رہتا کہ ہمیں مخلص خادمانِ دین محقق علماء پیدا کرنے ہیں بلکہ اشارہ گیا ہے کہ طالب علم کو کتاب اور اس کا حاشیہ پڑھادیا جائے۔ اسے خود کیوں پڑھاتا تھا؟ اور کیوں پڑھاتے ہیں؟ یہ آج کا مولوی کبھی نہیں سوچتا، اس پڑھنے پڑھانے اور دینی تعلیم کا مقصد صرف یہ تھا کہ صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں خود رنگ جانا اور دُوسروں کو رنگنا، اگر یہ مقصد پیشِ نظر نہیں تو تدریس کے بجائے پھاوڑا لیکر مزدوری کرلینا بدرجہا بہتر ہے، اگر یہ مقصد نہیں تو ہمارے برابر کوئی خسارہ میں نہیں، قرآن کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ ہم اس کے مصداق ہوکر رہ گئے ہیں۔

تدریس میں ہماری تمام کاوشیں ان مباحث میں منحصر ہوکر رہ گئی ہیں کہ امام شافعی نے کیا کہا؟ ان کی دلیل کیا ہے؟ اور ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے، خوب یاد رکھئے کہ قبر میں اور محشر میں ہم سے یہ سوال نہیں ہوگا، ہم سے سوال یہ ہوگا کہ او مدرس!، او خطیب! او مفتی! بتا جب میرے دین پر فتنوں کی بارش ہورہی تھی تو نے میرے دین کے واسطے کیا کیا؟ کتنے کافروں کو مسلمان اور کتنے بدکاروں کو دین کے رنگ میں رنگا تھا؟

دین کی، عربی کی تعلیم آج روز بروز گھٹتی جاتی ہے، مولوی صاحب کنویں کے مینڈک کی طرح یہ دیکھ کر مطمئن ہیں کہ اُن کے مدرسہ میں ان کے ہاتھ چُومنے والے چند لوگ ان کو مل جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ علماء وطلباء کی تعداد بہت کافی ہے، حالانکہ ہر سال اس دین کے طالب علم گھٹ رہے ہیں، ہمیں صرف وہ طلباء ملتے ہیں جن کی دنیا کے کسی شعبہ میں کھپت نہ ہو۔

جو کسی بھی درجہ میں آسودہ حال ہوں یا دُنیا کے کسی دوسرے شعبہ میں کھپ

سکتے ہوں وہ ہمارے مدارس کا رُخ نہیں کرتے۔

بہرحال فتنوں، اور بے دینی کا سیلاب ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو سب سے پہلے تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس دعوے سے دستبردار ہو جائیں کہ ہم خادمِ دین ہیں، کیونکہ حالات اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں، اور اس قسم کے دعویداروں کے بارے میں قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے وَیَوْمَ الْقِیَامَةِ تَرَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وُجُوْهُهُمْ مُسْوَدَّةٌ ۔امام غزالی رَحمہُ اللّٰہُ تَعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے دعوے دار ہوں مگر دین دار نہ ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ذہن نشین کریں کہ ان مدرسوں کا مقصد شرح جامی کے حواشی رٹوانا نہیں بلکہ دین کے رنگ میں رنگنا ہے، قرآن و حدیث کی صحیح فہم پیدا کر کے ان کے رنگ کو طلباء میں پیدا کرنا ہے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اکابر کی تقاریر درس رَٹ رکھی ہیں ان سے طلباء کے سامنے اپنے محقق ہونے کا رعب بٹھاتے ہین، کبھی یہ فکر نہیں ہوتی کہ طالب علم کو کچھ دین بھی آیا یا نہیں،

حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں
تا بخواند بر سلیمی زاں فسوں

آجکل طلباء تو طلباء بعض مدرسین کی حالت یہ ہے کہ اگر ان سے برجستہ کسی آیت کا ترجمہ پوچھ لیں تو نہیں بتا سکیں گے، اس کے باوجود لمبی لمبی تحقیقات رٹ کر اپنی علمیت کا رعب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

ان مدرسوں کو سنبھالنے کے لئے یہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مقصد مسلمان پیدا کرنا، پھر مولوی بنانا اور پھر محقق بنانا ہے۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ موجودہ فتنوں کا مقابلہ صرف اِن مدرسوں سے تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ان کے فوائد صرف ایک مخصوص حلقہ تک محدود ہیں۔ عوام میں جو بے دینی اور فساد پھیل رہا ہے اس کے انسداد کیلئے مدرسے کافی نہیں۔

اور یہ کام کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے، اور ہم عنداللہ مسئول ہیں، خلاصہ یہ کہ ہمارے ذمہ دو کام ہیں، ایک افرادسازی، اور دوسرا جماعت سازی، مگر جماعت سازی اُس طریقہ سے نہیں جو آجکل چل پڑا ہے، بلکہ اس طرح کہ

ہم تو تنہا ہی چلے تھے جانبِ منزل مگر
ہمسفر ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسیٰ مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیٓ اِلَی اللّٰہ، کہ کام تو تنہا ہی شروع کردیا، جب کُفر سے مقابلہ پیش آیا تو "من انصاری الی اللّٰہ" فرمایا۔

آج ہم جماعت سازی کی فکر میں تو پڑ گئے ہیں افرادسازی کا کام چھوڑ دیا ہے، حالانکہ جماعت سازی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ فردسازی نہ ہو، مکّی زندگی میں آپ ﷺ نے افراد کو تیار کیا، جب افراد بن گئے تو مدنی زندگی میں جماعتی طرز کا کام شروع کیا۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ تمام مدرسے اپنے اندر تو افراد تیار کریں، اور باہر کیلئے ہر مدرسہ میں ایک تنخواہ دار مبلغ رکھا جائے، اور بکثرت مدارس مل کر اس کا کوئی منظّم طریقہ باہمی مشورہ سے اختیار کریں، اس میں اجمالی طور پر عرض یہ ہے کہ ابتداء صرف مجمع علیہ مسائل (جن پر فقہاء کرام کا اتفاق ہے) کی تبلیغ کی جائے۔ جس مسئلہ کی فوری ضرورت سمجھی جائے پورے ملک کے مبلغین اس کی تبلیغ بیک وقت کریں۔

اگر یہ دونوں کام کر لئے گئے تو امید ہے کہ انشاء اللہ ہم اپنی اہم ذمہ داریوں سے کسی حد تک بری ہوسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق کامل عطاء فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین.

(ماہنامہ البلاغ کراچی جولائی ۱۹۸۴ء از مفتی محمد شفیع)

اخلاص اور اُس کے ثمرات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک بصیرت افروز تقریر جو انہوں نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائل پور کے ایک اجتماع میں فرمائی تھی مولانا محمد زکی کیفی مرحوم نے یہ تقریر مرتب کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر کچھ معروضات پیش کرنا بڑا اہمت طلب مسئلہ ہے کیونکہ اس دَور میں اخلاص کا ہی فقدان ہے۔ ہماری روزمرہ کی مصروفیات جو بظاہر عبادت نظر آتی ہیں اُن کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن میں سے اکثر کاموں میں مقصودِ نظر یا جلب منفعت ہے یا شہرت اور ناموری اور نام ونمود کی خواہش اپنے علم وفضل کا اظہار اور دوسرے لوگوں سے اپنی برتری کا لوہا منوانا۔

اگر میں اپنا جائزہ لے کر دیکھوں کہ مجھ میں کس قدر اخلاص ہے تو شاید بولنے کی ہمت نہ ہو لیکن قرآن حکیم نے جو ''لِمَ تَقُولُونَ مَالَا تَفْعَلُونَ'' فرمایا ہے اُس کے نتیجے میں بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کوئی نیک عمل نہیں کرتے تو اس نیک عمل کی ترغیب کسی دوسرے کو بھی دینا صحیح نہیں ہوگا۔ اس شبہ کو دُور کرنے کے لئے اس کا صحیح مفہوم بیان کرنا چاہتا ہوں۔

میرے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک جامع جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ آیت دعویٰ کے متعلق ہے۔ دعوت کے متعلق نہیں۔ مثلاً نماز ہم صحیح نہ پڑھتے ہوں اور دعویٰ یہ کرتے ہوں کہ نماز

بالکل صحیح پڑھتے ہیں۔ روزہ، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کو اُن کے آداب کے مطابق ادا نہ کریں اور دعویٰ یہ کریں کہ ہم ان کو پورے طور پر صحیح ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کے کام کا اس آیت میں ممانعت فرمائی گئی ہے۔ لیکن اگر ہم کوئی نیک عمل اپنے کسل یا غفلت اور کمزوری کے باعث نہیں کر سکے تو یہ بات اس عمل کی دعوت دوسرے لوگوں کو دینے میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ دعوت دیتے وقت اپنے نفس کو بھی مخاطب کرنا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو بھی۔ کیونکہ دعوت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ داعی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص نماز باجماعت کے معاملے میں خود کوتاہ ہے اور نماز باجماعت کے فضائل واہمیّت پر وعظ کہتا ہے تو قدرتی طور پر اس کا نفس بھی خود ندامت محسوس کرلے گا اور بالآخر انشاءاللہ اس کو بھی پابند بنادے گا۔

حضرت تھانوی رَحمہُ اللہُ تعالیٰ جس رذیلہ کا اپنی ذات میں احساس کرتے تھے تو اس پر وعظ کہتے تھے اور اس طرح اپنے نفس کا علاج کرلیتے تھے۔ چونکہ بحمداللہ اس مجلس میں دعویٰ کی کوئی بات نہیں ہے صرف دعوت ہی کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ اس لئے اخلاص پر چند باتیں کہنے کی ہمت کررہا ہوں۔

قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ.

یعنی ہم جو عبادت بھی کریں اس میں ہمارا تمام تر مقصود ومطلوب اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل کرنا ہو۔ اس کے علاوہ اور کسی قسم کا داعیہ، نام ونمود یا مالی منفعت، عزت وشہرت وغیرہ نہ ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی دل میں پیدا ہوگئی تو دعوت خالص نہیں رہے گی۔ ''اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ''

ایک حدیث میں سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''جب بندہ کسی عمل میں دو نیتیں کرلیتا ہے تو اللہ تبارکَ وتعالیٰ فرماتے

ہیں کہ جب تم نے اس عمل میں میرے ساتھ غیر کو شریک کرلیا تو
مَیں یہ غیر کو ہی دے دیتا ہوں''۔

اور منطق کا مشہور مقولہ ہے:

کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل کے تابع ہوتا ہے۔

یاد رکھئے ہر عمل کا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے اور ایک اس کی رُوح ہوتی ہے۔
قرآن حکیم نے انسانی تخلیق کے متعلق پہلے تو تدریجی تخلیق کا ذکر کیا ہم نے نُطفہ کو مضغہ بنادیا پھر مُضغہ سے ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ تدریجی تخلیق کا بیان فرما کر ارشاد ہوا۔

''ثُمَّ اَنشَاْنٰهُ خَلْقاً آخر'' اور وہ روح کی تخلیق ہے۔ روح تمام افعال کا صدور کرانے والی ہے اور جسم اس کے کہنے کے مطابق کام کرتا ہے۔ انسانی روح تو پہلے سے موجود تھی لیکن جسم میں آنے سے پہلے نہ وہ مؤمن تھی نہ کافر اور نہ اس کا کوئی عمل تھا۔ جب اس کا تعلق بدن کے ساتھ قائم کر دیا گیا تو کام شروع ہوا۔ نہ صرف روح سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف جسم سے، تمام دُنیا کے کارخانوں کا دارومدار اسی پر ہے۔

بجلی حاصل کرنے کے لئے پہلے بجلی کو تاروں کی فٹنگ وغیرہ کی جاتی ہے، اس کے بعد بلب لگایا جاتا ہے۔ یہاں تک تو بجلی کا ڈھانچہ تھا اب اس کے بعد پاور ہاؤس سے کرنٹ آتا ہے جو بجلی کی رُوح ہے تب روشنی حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح ہر عمل کا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے اور ایک اس کی روح ہوتی ہے، نماز میں ہاتھ اُٹھا کر تکبیر کہنا، قیام وقعود اور رکوع وسجود وغیرہ یہ سب نماز کا ڈھانچہ ہے اور اس کی روح اخلاص ہے کہ دورانِ نماز غیر اللہ کا خیال نہ آنے پائے، اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھنے کا عمل ایک دعویٰ ہے کہ ہم نے ماسوی اللہ سے ہاتھ اُٹھالیا ہے۔ اسی کو احسانِ صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔

تمام اعمالِ صالحہ کی روح اخلاص ہے، اس لئے ہمیں ہر عمل کے وقت اس کا

خیال رکھنا ہوگا کہ اس عمل کا ڈھانچہ بھی درست ہو اور اس میں روح بھی موجود ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اعمال کے اعداد کا شمار نہیں ہوتا کہ کتنی نمازیں پڑھیں؟ کس قدر روزے رکھے؟ کتنے حج کیے؟ بلکہ وہاں بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا تعداد نہیں گنی جائے گی۔ قرآن وحدیث میں آپ نے کہیں نہیں پڑھا ہوگا، کہ یوم حساب میں اعمال کی گنتی کی جائے گی۔

قرآن کریم میں احسن عمل فرمایا گیا ہے اکثر عملاً نہیں فرمایا۔ ہر عمل میں حسن عمل کو دیکھا جائے گا، کثرت عمل کو نہیں دیکھا جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں عمل کے وزن کے اعتبار سے جزا ملے گی، اعمال میں جس قدر اخلاص ہوگا اسی قدر وہ اعمال وزنی ہوں گے، کسی کا عمل دیکھنے میں معمولی ہوگا لیکن اخلاص کی بدولت اس کی جزاء بہت بڑی ہوگی اور کسی کے اعمال دیکھنے میں بہت عظیم ہوں گے لیکن اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی جزاء بہت معمولی ہوگی۔ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

"کسی صحابی کا ایک مُد مال خرچ کرنا (جو ہمارے ایک سیر کے قریب ہوتا ہے) غیر صحابی کے جَبل اُحد کے برابر خرچ سے بھی زیادہ باعثِ اجر ہوگا"

آخر اس کا سبب کیا ہے بظاہر تو یہ بے انصافی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص اُحد کے برابر خرچ کر کے اجر حاصل نہ کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحابی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے جو اخلاص عمل حاصل ہو گیا وہ غیر صحابی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اسی لئے اخلاصِ عمل کی وجہ سے صحابی کے معمولی اعمال کا وزن بڑھا ہوا ہے اور غیر صحابی میں اخلاص عمل کی کمی کی وجہ سے اس کے عمل کا درجہ گھٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ (جو عمر ثانی کہلاتے ہیں) اور حضرت امیر معاویہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہُ میں سے کون افضل ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ:۔

"میں بہ قسم کہتا ہوں کہ حضرت معاویہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہُ کا مقام تو بہت بلند ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھوڑے کی ناک کا وہ غبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کے وقت اس کی ناک میں پہنچا سینکڑوں عمر بن عبد العزیز سے بہتر ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے فضائل وکمالات اپنی جگہ سب مسلّم ہیں، لیکن وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی دولت کہاں سے لاسکیں گے؟

اخلاص کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک آخرت میں وزن بڑھنے کا، دوسرے نقد ثمرہ دُنیا میں مخاطب پر اثر انداز ہونے کا، تجربہ شاہد ہے کہ اخلاص کے ساتھ جو بات کہی جاتی ہے وہ مؤثر ومفید ہوتی ہے اور تلخ بھی ہوتی ہے تو ناگوار نہیں ہوتی، اختلاف کی صُورت میں جنگ وجدال اور معرکہ آرائیوں کا بڑا سبب اخلاص کی کمی یا اس کا فقدان ہے۔ اگر بات اخلاص کے ساتھ کہی جاتی ہے تو اس کا انداز محبت، ہمدردی اور دل سوزی کا ہوتا ہے اور اخلاص نہ ہو تو بات وہی ہوتی ہے لیکن انداز توہین آمیز ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ افتراق وانتشار اور جنگ وجدل کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

مؤطا امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا ایک قول مذکور ہے:

الناس مبتلی ومعافی فارحموا مبتلی وسئلو اللّٰہ العافیۃ.

”کچھ لوگ بیمار ہیں اور کچھ عافیت میں ہیں، پس بیمار پر رحم کھاؤ اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے عافیت طلب کرو“۔

یہ حکیمانہ ہدایت نامہ ہے کہ اگر کسی کو بیمار دیکھو، بُرے اعمال میں مُبتلا پاؤ تو اُس کو اس بیماری اور اعمالِ بد سے بچانے کی کوشش پوری ہمدردی، دل سوزی اور لگن کے ساتھ کرو اور ایسے ایسے طریقے سے کرو کہ مریض تنگدل پریشان اور بیزار نہ ہو۔

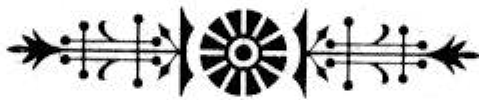
اس کو بیمار اور خود کو صحت مند دیکھ کر اپنے آپ کو افضل نہ سمجھو اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے محض اپنے فضل سے تمہیں اس بُری عادت میں مُبتلا نہیں کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر دعوت میں اخلاص ہوگا تو خود بخود داعی غور وفکر کرکے اپنی بات ایسے انداز میں پہنچانے کی سعی کرے گا جو مخاطب کے قلب پر اثر انداز ہو۔

انبیائے مرسلین کا طریق اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ اصلاح کرنا ہے اور اصلاح اس طریق کے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ میرے استاد اور میرے پھوپھی زاد بھائی تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات' حق نیت سے' حق طریق سے کہی جائے تو ضرور مؤثر ہوتی ہے، جہاں بات مؤثر نہیں ہوتی وہاں ان تین باتوں میں سے کسی بات کی کمی ہوتی ہے، اگر رعایتوں کے ساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے گی تو انشاء اللہ مؤثر ہوگی۔ مخاطب اثر قبول کر کے صحیح عمل کرے گا اور اگر مخاطب عمل نہ بھی کر سکا تو کم از کم یہ فائدہ لازمی ہے کہ اس کو صحیح علم ہو جاتا ہے۔

بڑے بڑے مقررین اور جادو بیان خطیب تقریریں کرتے ہیں۔ وقتی طور پر بڑے بڑے اجتماع ان کی تقریروں کو سُنتے بھی ہیں۔ لیکن اکثر تقریریں ختم ہونے کے ساتھ ہی فضاء میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور بعض اللہ کے نیک بندے نہ تقریر کرنا جانتے ہیں نہ ان کو خطابت کے انداز آتے ہیں۔ سیدھی سادھی مختصر بات کہتے ہیں اور وہ دلوں میں اتر کر ہزاروں انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اخلاص عمل کے راستہ میں نام و نمود، جذبۂ شہرت، اظہار علم، مالی منفعت وغیرہ رکاوٹ بنتے ہیں۔ لیکن اگر انسان ان چیزوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لئے نظر انداز کر دے تو یہ فوائد مع زوائد کے اللہ تبارک وتعالیٰ خود بخود حاصل کرا دیتے ہیں، جو لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دُنیا کو ٹھوکر مار دیتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ دُنیا کو اُن کے قدموں میں تابع بنا کر ڈال دیتے ہیں بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اخلاص کی دولت عطا فرمائے اور ہم سے اپنے دین کی خدمت اخلاص کے ساتھ لے۔ آمین (البلاغ کراچی) (بحوالہ ماہنامہ الصیانۃ لاہور جنوری ۲۰۰۰ء)



جہاد میں اخلاص کی ضرورت

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک تقریر جو ۱۳۸۵ء میں سکھر کی جامع مسجد میں خطابِ جمعہ کے دوران حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی۔ اس تقریر کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قلمبند فرمایا تھا۔ اب حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب بھی دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دونوں بزرگوں کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین۔ (۴ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ بروز جمعہ)

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم (خطبہ ماثورہ) فقال اللہ تبارک وتعالیٰ:

وَجَاهِدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِه، الی فنعم المولیٰ ونعم النَّصير:

آج میرے لئے چند خوشیاں جمع ہوگئی ہیں، اول یہ کہ تقریباً بارہ سال قبل اس جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اور اب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے بڑی شاندار مسجد کو دیکھ رہا ہوں اور پوری مسجد الحمدللہ نمازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور دراصل مسجد کی آبادی نمازیوں ہی سے ہوتی ہے، مسجد بھی ہو اور نمازی بھی ہوں اصل تعمیر یہی ہے۔ دوسری نعمت یہ ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم اور سنت مبارکہ کی جھلک اللہ جل شانہ نے عنایت فرمائی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے ہیں تو سب سے پہلا انتظام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ہی کا فرمایا۔ مسجد تعمیر فرمائی اور دوسرے سال رمضان المبارک کے

مہینے میں جہاد کا آغاز فرمایا جسے جنگ بدر کہا جاتا ہے۔ تو پہلے تعمیر مسجد ہوئی اس کے بعد دفاعی جہاد، یہی حسنِ ترتیب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مسجد کو بھی بخشی کہ پہلے یہ مسجد تعمیر ہوئی اس کے بعد مسجد بنانے والوں کو جہاد کی توفیق ہوئی۔ جو ٦ ستمبر ١٩٦٥ء کو بھارت کے جواب میں ہوا۔

تاریخ اسلام ایسے واقعات سے لبریز ہے کہ جہاں بھی مسلمانوں نے فتوحات کی ہیں۔ فتح پا لینے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جماعت کا انتظام کرنیکے لئے مساجد تعمیر کرائیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اسلام کی اساس اور بڑا استون ہے۔ جس طرح کوئی تعمیر ستونوں پر قائم ہوتی ہے اسی طرح دین اسلام کا نماز بڑا عظیم الشان ستون ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مصر فتح کیا تو ان کی مسجد آج تک وہاں موجود ہے۔ اسی طرح ملک شام فتح ہوا تو وہاں جو فتح کے بعد مسجد تعمیر ہوئی وہ آج بھی موجود ہے۔ غرض جس جگہ لشکر گیا شہر ہو، گاؤں ہو حتی کہ جنگل میں اگر قیام کرنا پڑا تو وہاں بھی مسجد تعمیر کی۔ محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا بڑا حملہ سندھ میں دیبل پر کیا۔ عربی مورخین اس کو دیبل ہی لکھتے ہیں لیکن اس کی تعین میں اختلاف ہے کہ اب وہ کونسی جگہ ہے۔ کسی نے کہا منوہڑہ کا مقام ہے، کسی نے ٹھٹھہ کو کہا لیکن جدید محکمۂ آثار سے معلوم ہوا کہ وہ کراچی سے دور ایک جگہ ہے وہ جگہ دیبل ہے وہاں راجہ داہر کا ایک دبا ہوا قلعہ بھی نکلا ہے اور ایک جامع مسجد کے آثار بھی نکل رہے ہیں۔ اس دیبل کا حضرت محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد بڑی بہادری سے تین دن کی لڑائی کے بعد وہاں امن قائم ہوگیا تو سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی گئی اور چار ہزار گھر مسلمانوں کے یہاں آباد ہوئے۔ (بلاذری ص ۴۳۷)

محمد بن قاسم بارہ ہزار کا لشکر لے کر یہاں آئے جس میں چھ ہزار عراقی تھے اور چھ ہزار دیگر مجاہدین تھے۔ محاصرے کے بعد قبیلہ مراد کا ایک سپاہی جو کوفہ کا رہنے والا

تھا سب سے پہلے فصیل پر چڑھ کر اس نے اسلامی جھنڈا نصب کر دیا۔ اور اللہ اکبر کی پر رعب آواز سے مسلمانوں کو اپنی کامیابی کا خیال دلایا پھر تو مسلمان ہر طرف سے پہنچ گئے اور شہر میں داخل ہوئے۔ یہ اللہ کا نام ایسا ہے کہ جب مسلمان اس کا نام لے کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کو اونچا کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو کامیابی اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر برہمن آباد کے شہر پر حملہ کیا، برہمن آباد دوسری صدی میں آکر مٹ گیا اس کا جائے وقوع اب معلوم نہیں البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روہڑی اور حیدر آباد کے درمیان میں کسی جگہ تھا، بہرحال یہ بھی فتح ہو گیا اور مجاہدین کی تعداد تیس ہزار ہوگئی۔ سوچنا یہ ہے کہ شروع میں بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ فوج تھی اب یہ اٹھارہ اور کہاں سے بڑھ گئے، کوئی خاص کمک نہیں ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ اسلام کی حقانیت کی دلیل تھی کہ اس قلیل عرصے میں اٹھارہ ہزار افراد مسلمان بلکہ غازی بن گئے۔ حدیث شریف میں ہے۔

لن یغلب اثنا عشرَ الفًا من قلّةٍ

مسلمانوں کا لشکر اگر بارہ ہزار ہو تو وہ قلت کی بنا پر کبھی مغلوب نہ ہوگا۔

اصل ہتھیار صلاح وتقوی وللہیت کا ہے جب افواج میں صلاح وتقویٰ ہوگا تو وہ اتنے ہی کامیاب ہوں گے۔ پہلے افواج میں یہی تبلیغ ہوتی تھی اور ان کو صلاح وتقویٰ کا درس دیا جاتا تھا۔

سلطان شہابُ الدین غوری کے ۱۲ ہزار لشکر میں حضرت امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب تفسیر کبیر تھے۔ فوجیوں کی روحانی غذا اور ان کی تربیت کے لئے انتخاب کیا گیا کہ حضرت امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کو رکھا جائے چنانچہ آپ قرآن شریف کا درس دیتے تھے تو یہ بارہ ہزار کا لشکر جیسے فوجی مشق کرتا ہوگا اسی طرح وہ روحانی مشق بھی کرتا ہوگا جب ایسا لشکر اور بارہ ہزار ہو جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی

تائیدِ غیبی اس کے ساتھ ہوتی ہے، وہاں فلم یا ناچ گانا نہیں ہوتا تھا یہ تو غضب الٰہی کو دعوت دینے والی چیزیں ہیں۔

اس تقویٰ وصلاح کی بات تھی کہ جب مسلمان اس زیور سے مزین تھے تو ان پر غیر مسلم بھی پورا اعتماد کرتے تھے، جس وقت برہمن آباد فتح ہوا تو شہر والوں نے دروازے بند کر لئے تھے آخر محاصرہ سے تنگ آ کر انہوں نے محمد بن قاسم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کو ایک خط لکھا کہ ہم لوگ امن چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے نہیں لڑیں گے۔ باقی آپ جانیں، راجہ داہر جانے۔ چنانچہ اس امن کو منظور کر لیا تو صرف خط پر منظوری دیدی۔ پھر ان کافروں کو اتنا اعتبار تھا کہ انہوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور خود اسی طرح باقاعدہ کاروبار میں مشغول تھے، فوج شہر کے اندر داخل ہو رہی ہے اور دکاندار اپنی دکان پر بیٹھا ہوا ہے، مزدور اپنی مزدوری کر رہا ہے، نہ خوف ہے نہ حراس ہے کیونکہ مسلمان کی زبان کا اعتبار تھا۔ ایسی نظیر کوئی دوسری قوم میں دکھا سکتا ہے۔ محمد بن قاسم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے بھی اسی جگہ آ کر پہلے مسجد تعمیر کی۔

مؤمن کو اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ ہونا چاہیئے۔ مؤمن کے پاس یہ بڑی عظیم الشان طاقت ہے اتفاق واتحاد اور خدا پر بھروسہ۔ اگر روحانی طاقت پیدا ہو جائے تو سلامتی کونسل بھی ایک طرف رہے مردِ مؤمن کو کوئی نہیں روک سکتا۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی۔ وَجَاهِدُوا فِی اللہِ حَقَّ جِهَادِهٖ اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ کی راہ میں پورا پورا جہاد کرو۔ فی اللہ کی قید بتلا رہی ہے کہ مسلمان کی جنگ اللہ کے واسطے ہوتی ہے دنیاوی اغراض سے مؤمن کی جنگ بالا ہوتی ہے۔ مؤمن ملک گیری، دولت وحشمت یا وطن کے لئے نہیں لڑتا ہے اس کی تو صرف اللہ کے واسطے لڑائی ہوتی ہے۔ اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری ہوں، اسلام فروغ پائے، جہاں اسلام کا جھنڈا سر بلند ہو وہی ہمارا وطن ہے دنیا دار وطن کے لئے لڑتے ہیں۔ ہم مادرِ وطن کے پجاری نہیں۔ جہاد وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو، اس کی

رضا مقصود ہو۔ ورنہ اس لڑائی کا نام فساد اور خونریزی ہے جب اعلاء کلمۃ اللہ ہماری نظر سے اوجھل ہو جائے تو وہ جہاد کی برکتیں بھی نہیں ہوتیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسکندریہ جو ایک نہایت خوبصورت اور تجارتی شہر تھا اس کے فتح کرنے کے لئے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ برابر ایک ڈیڑھ ماہ تک محاصرہ رہا۔ لیکن فتح کی کوئی صورت نہ ہوئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ناراض ہوئے کہ کیا وجہ ہے کہ اب تک فتح کی خبر نہیں آئی۔ اللہ کے لئے جہاد ہو۔ اور دیر ہو جائے یہ کیسے ہوا؟ کوئی نہ کوئی اس کا سبب ضرور پیدا ہوا ہے۔ دنیاوی جنگوں کو برسوں لگ جاتے ہیں لیکن اس لئے کوئی نہ کوئی خامی ایسی ہے کہ دیر ہوگئی ہے ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر اتنا یقین ہوتا تھا کہ مؤمن کامل اور فرمانبردار و مطیع ہو تو اتنی دیر نصرت الٰہی میں نہیں ہوسکتی۔ اس کا وعدہ سچا ہے۔ اس لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خط لکھا کہ فتح کے دیر ہونے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم لوگوں کو شاید وہاں کی دولت وحشمت اور وہاں کے محلات تمہاری نظروں میں آگئے ہیں اور لالچ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگیا ہے اس نے تمہارے دل میں وہن اور سستی پیدا کردی ہے۔ اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح میں دیر ہوگئی ہے لہذا اب جو جمعہ آرہا ہے اس میں تم سب ملکر اپنی نیتوں اور خیالات کی تجدید کرو۔ اور محض رضائے الٰہی کے لئے جہاد کی نیت خالص کرو اور چند بڑے درجے کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو لشکر کے آگے کرو اور ایک بارگی حملہ کرو۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ خط سب کو سنایا اور پھر سب نے نیتوں کی تجدید کی۔ توبہ کی اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھے تو اسی دن غروب آفتاب نہ ہونے پایا تھا کہ اللہ نے اسکندریہ کو فتح کرادیا۔

اصل طاقت مومن میں صلاح وتقوی کی ہے اگر اس ہتھیار سے مومن پیراستہ

ہوتو اللہ تعالیٰ کی تائید ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم میں فرمایا فی اللہ۔ اپنے آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تیار رکھو۔

اس کے بعد فرمایا حق جہادہ پوری طرح جہاد کرو۔ جتنی تم میں کسی قسم کی طاقت ہے خرچ کرڈالو۔ اللہ کے راستے میں ہمت نہ ہارو، جہاد کا حق ادا کرو۔

اس کے بعد بعض افکار ہمارے اندر ایسے پھیلائے گئے ہیں جو دراصل بھارت کی طرف سے آئے ہیں اور بھارت ریڈیو سے وہ نشر بھی کیئے گئے ہیں۔ خود بھارت کا یہ رویہ رہا کہ پاکستان ریڈیو سننے تک کی ممانعت ہی نہیں بلکہ سننے والے پر چھ ماہ قید کی سزا بھی لگادی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ پاکستان میں ہندوؤں کی بات کون سنے گا۔ اس لئے اس نے چند علماء کے نام لے کر بیانات شائع کئے۔ سواول تو ان علماء کو جن کے نام لئے گئے یہاں کون جانتا ہے۔ انہوں کا یہ کہنا کہ پاکستان کے علماء کا نعرہَ جہاد صحیح نہیں۔ جبکہ چھ کروڑ مسلمان بھارت میں آباد ہیں، یہاں لال قلعہ ہے شاہجہاں کی جامع مسجد ہے، کافروں پر جہاد ہوا کرتا ہے۔ صرف دو کروڑ کا فرق ہے بھارت میں چھ کروڑ مسلمان ہیں اور پاکستان میں آٹھ کروڑ ہیں۔ پھر نائب صدر یہاں مُسلمان ہے اس قسم کے بیانات سب فریب ہیں۔

خوب یادرکھئے دارالاسلام پرحملہ کرنا حرام ہے۔ خواہ وہاں کافر بھی بستے ہوں اور دارالکفر پرحملہ کرنا واجب ہے خواہ وہاں مسلمان ہی کیوں نہ بستے ہوں۔

دارالاسلام کی تعریف یہ ہے کہ جہاں مسلمان برسراقتدار ہوں اور اسلام پر عمل کرنے میں آزاد ہوں۔ کوئی رکاوٹ ان کو نہ ہو۔ وہاں خلافت راشدہ کے احکام جاری کرسکیں۔ لیکن اگر بدبختی کی وجہ سے دیر ہوجائے۔ لیکن تمام مسلمان ملکر اگر چاہیں تو جاری کرسکیں تو وہ دارالاسلام ہی رہے گا یہ مسلمانوں کی بدبختی کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان اپنے اسلام کے قوانین کوٹالتے رہیں جس طرح مسجد وہ تو ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اگر وہاں کوئی نماز نہ پڑھے تو مسلمانوں کے اس میں نماز نہ پڑھنے سے

مسجد کے حکم سے وہ نہیں نکل سکتی، یوں کہیں گے کہ مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ مسجد میں عبادت نہیں کرتے۔

بھارت میں مسلمان اگرچہ ۶ کروڑ ہیں مگر مغلوب ہیں اپنے مال وآبرو وجان کی حفاظت بھی نہیں کرسکتے، آئے دن ہندو حملہ کردیتے ہیں۔ بھارت کو دارالاسلام کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بھارت جھوٹ بولتا ہے۔ جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور اگر ان کی یہ منطق مان بھی لی جائے کہ جہاں ۶ کڑور مسلمان آباد ہوں وہ بھی دارالکفر نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے جب محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے سندھ کو فتح کیا اور اسلام کے قوانین جاری کیۓ تو اس حصے کو دارالاسلام کہیں گے۔ حالانکہ ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی لیکن اقتدار مسلمانوں کے پاس تھا جہاں تک اقتدار مسلمانوں کا تھا وہ دارالاسلام تھا باقی تمام ہندوستان دارالکفر ہی رہا۔ تو دار کا تعلق مسلمان یا ہندوؤں کے بسنے پر نہیں ہے بلکہ اقتدار پر ہے۔

مکہ معظّمہ میں بھی ابتدا میں مسلمان بھی آباد تھے۔ لیکن اس وقت وہ دارالاسلام نہیں تھا ورنہ ہجرت کیوں کرتے اور پھر جہاد کیسے کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح حبشہ میں اگر کچھ مسلمان جاکر بس گئے تھے تو کیا وہ دارالاسلام ہوگیا تھا؟ حالانکہ مکہ معظّمہ میں تو بیت اللہ بھی تھا لیکن پھر بھی فتح مکہ اور جہاد کیا گیا۔

خداوند تعالیٰ ان بھارت کے مسلمانوں کی جان مال آبرو کی حفاظت فرمائے میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں لیکن وہ ہے دارالکفر ہی۔ مسلمانوں کے بسے رہنے سے دارالاسلام نہیں ہوسکتا ہے۔

جہاد اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کریں، عدل قائم کریں، ظلم کو مٹائیں اور جو رکاوٹیں اس درمیان میں حائل ہوں ان کو دور کریں۔ اور جب کسی جگہ بھی ہمارے مسلمان بھائیوں پر ظلم ہوتا ہو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی امداد کریں۔

جب کافروں کا کوئی سا لشکر ہمارے ملک پر حملہ کردے تو سب پر جہاد فرضِ عین

ہو جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ نعمت جہاد عطا فرمائی ہے۔ مسئلہ کشمیر انہوں نے چھیڑا تھا۔ لہذا ان کی امداد کرنا ہمارا فرض ہے۔ "یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا" کا مضمون سامنے ہے لہذا ان ظالموں سے بچانا فرض ہے۔

لہذا مسلمانوں کی امداد کرنا اور دارالاسلام کی حفاظت کیلئے اور کشمیری مظلوموں کو ظلم سے چھڑانا یہ تین باتیں ہیں جن کی بنا پر ہم پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

پاکستان کیساتھ اللہ تعالیٰ کا عجیب معاملہ ہے اوّل تو اس کا بننا ہی عجیب بات ہے پھر اس کا باقی رہنا بھی معجزہ ہی ہے پھر یہ جہاد بھی ایک معجزہ ہے۔ پہلے اس پاکستان بنانے کے لئے گلی گلی کوچے چیختے پھرتے تھے کہ پاکستان لیں گے، وہاں قرآن واسلام کا قانون ہوگا لاالہ الا اللہ پڑھ کر اللہ کا نام لے کر اعلان کرتے تھے جب اللہ کا نام اور لا الہ الا اللہ پڑھ کر بڑھے اللہ پاک نے پاکستان بنا دیا۔ جب بن گیا تو اس کے باقی رہنے کا احتمال نہ تھا۔ دفتروں میں کاغذ پینسل تک نہ تھیں۔ فوجیں سب ملک سے باہر تھیں۔ نہ خزانہ تھا نہ تنخواہ دینے کی طاقت تھی اور حوادثات ایسے پیش آئے کہ آنے والا یہی کہتا تھا کہ صرف ایمان اور جان بچ جائے اور پاکستان آتے تھے تو اس طرح کہ کافر سب کچھ چھین لیتے تھے، مال لانے نہ دیتے تھے سکھوں نے قتل عام کر رکھا تھا۔ مشرقی پاکستان پر حملہ ہو جاتا وہ بھی اس وقت اس کی ٹکر کا نہ تھا لیکن یہ اللہ پاک کی کریمی ہے کہ اس نے اسی پاکستان کو ایک مضبوط قلعہ بنا دیا۔

سو پاکستان اللہ کا نام لے کر بنا ہے۔ لا الہ الا اللّٰہ کہہ کر اور دارالاسلام کہکر بنا ہے اور یہی کہکر اس کو لیا گیا ہے۔

لیکن ہم نے اس نعمت کا شکر نہ ادا کیا۔ یہاں آ کر اس اللہ اور لا الہ الا اللّٰہ کو بھول گئے ایسی ظلمتوں میں پھنس گئے[1]۔ ان پر ان ہی کرتوتوں سے عذاب ہی آیا۔

[1] اگر ہم اندازہ کریں جو معصی قوم عد و ثمود اور معذب قوموں کے تھے ان سے کم نہیں رہیں گے

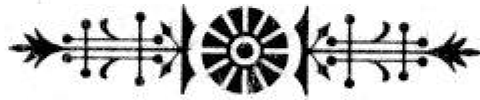
کسی پر پتھر برسائے گئے، کسی بستی پر آگ برسی اور کسی قوم پر آندھی کا عذاب بھیجا گیا۔ اپنے کرتوتوں پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم مستحق عذاب ہو چکے تھے۔ لیکن عذاب کے رکنے کی وجہ سرور کائنات ﷺ کا وجود اطہر ہے۔ جس کی وجہ سے عذاب نہیں آیا۔ خدائے پاک نے فرمایا۔

وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم آپ کا وجود مسعود کہ آپ (مدینہ منورہ) دنیا ہی میں تشریف فرما ہیں آپ ہی کے طفیل سے ہم بچے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے ہم نے ناشکری کی اور بندہ جب ناشکری کرتا ہے۔ اللہ پاک اس کو عذاب دیتے ہیں لیکن اس کا کتنا کرم ہے کہ ہم کو کس طرح محفوظ رکھا۔ دشمن کے جو منصوبے تھے وہ دراصل شکل عذاب کی تھی اللہ پاک نے اس کو ٹالدیا۔ یہ اس کی عنایت ومہربانی، ہے مزید اللہ کا یہ انعام ہوا کہ ہم میں بیداری پیدا کردی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سارے پاکستان کے مسلمانوں کے دل میں الفت ڈال دی۔ سب کا رُخ ایک ہی طرف پھیر دیا۔ جو پاکستان کے خلاف بھی حزب مخالف تھے وہ بھی باہم مل گئے۔ دلوں کا پھیرنا کسی قانون کا کام نہیں ہے صرف ایک اللہ پاک کا کام ہے۔ گلی کوچوں میں دعائیں ہورہی ہیں۔ بچوں تک میں جوشِ جہاد ہے۔ عورتیں دعا کررہی ہیں۔ یہ کسی تلوار کا کسی سیاست کا کام نہیں ہے۔ ایک سیاسی دلدلوں میں پھنسی ہوئی قوم ساری ایک دھاگے میں بندھ جائے یہ صرف اللہ کی تائید غیبی ہے۔ اور جہاد کی بدولت ہے۔ اعمال درست کرلئے، معاصی راگ باجے بند کردیئے۔ نمازی بڑھ گئے، مساجد نمازیوں سے پر ہوگئیں، خوف وہراس بالکل نہ رہا۔ مہنگائی نہ ہوئی، ہر شخص اپنی زندگی کو درست کرنے کی فکر میں ہے یہ اللہ کا بڑا انعام ہے اس کو اب جانے نہ دینا چاہئیے، ہر شخص کو نماز پڑھنی چاہئیے، بداعمالیاں چھوڑ دینی چاہئیں اور کبھی اپنی اصلاح سے غافل نہ رہنا چاہئے۔ مغربیت کی لعنت کو اتار پھینکنا چاہیئے۔ اگر مسلمان

بن کر زندہ رہنا ہے تو اسلام کی پوری تابعداری کریں، ممکن ہے اور کوئی اس قسم کا جھٹکا باقی ہو تو اللہ پاک ہم پر کرم فرمائے۔ ہمیں صرف اللہ پاک پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ تقویٰ اختیار کرنے کا وقت ہے۔ حکومت کو بھی رعایا کو بھی سب کو اس کوشش میں لگ جانا چاہیئے کہ دین پر قائم ہو جائیں اور ہم نے کیا کیا سب اللہ پاک کا ہی کام ہے۔ دشمن چڑھ آیا، جہاد ہم پر مسلط ہوا، توجہ الی اللہ ہوگئی پھر اتحاد و الفت پیدا کی۔ پھر فرشتوں کی امداد فرمائی۔ اب ان ہی چیزوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھو۔ واعلموا ان اللّٰہ مَعَ المتقین ۔ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ صرف رجسٹری مسلمان ہونے پر نہیں، حقیقی مسلمان ہونا چاہیئے۔

ہمارے سامنے سلطنتِ مغلیہ کی تاریخ دور نہیں ہے جب وہ عیش وعشرت میں آگئے تو کس طرح برباد ہو گئے حالانکہ وہ مسلمان تھے لیکن وہ تاریخ بہت دور نہیں کہ شہزادوں کا سر باپ کے سامنے دسترخواں پر کھانے کے لئے پیش کیا گیا، جب اعمال غلط ہو گئے تو تائید نہیں آتی۔ لہٰذا خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ اپنی اصلاح کی فکر کریں، بے حیائی، عریانی، بے پردگی، فحش لٹریچر، مغربی فیشن سے دور رہنا چاہیئے، ان کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اللہ پاک سے بہت ڈرتے رہنا چاہیئے۔

(ماہنامہ البلاغ کراچی دسمبر ۱۹۸۹ء)



اقتباس از خطاب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

بموقع افتتاح بخاری شریف (شوال ۱۳۹۵ھ)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے موت کے جھٹکے سے بچا کر آپ کے پاس پہنچادیا ہے میں نے اپنی آخری عمر کے پچیس سال دار العلوم کیلئے خرچ کئے ہیں آج پچیسویں بار افتتاحِ بخاری کر رہا ہوں۔

ایک فائدہ تو یہ ہے کہ:

غالباً ابوزہرہ رحمہ اللہ تعالیٰ عراقی کا واقعہ ہے کہ جب موت کا وقت آیا تو اپنے طلبہ کو جمع کیا کہ آؤ بھائی حدیث کا سبق پڑھ لو' طلبہ جمع ہوئے تو یہ حدیث پڑھائی من کان آخر کلامہ الہ الا اللّٰہ۔ جب لا الہ الا اللّٰہ کہا تو روح قبض ہوگئی حدیث کا آخری حصہ دخل الجنة نہ کہہ سکے یہ جملہ ملائکہ ہی نے کہا ہوگا۔ تو مجھے بھی یہ توقع تھی کہ اگر یہی وقت میری زندگی کا آخری وقت ہے تو موت حدیث ہی کے درس کے دوران آئے۔

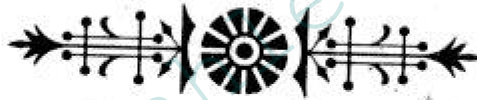
دوسرا فائدہ آپ سب حضرات کا یہ ہے اب تو حدیث کا ذوق ہی ختم ہو رہا ہے۔ ایک بزرگ کا مقولہ تھا کہ میری تمنا یہ ہے کہ بیت خال و سند عال،

میں علم اور عمل اور ہر اعتبار ہی سے چھوٹا ہوں مگر ایک فرق یہ ہے کہ میں نے اسی (۸۰) سال طلبہ اساتذہ' اور بزرگوں میں گذارے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے حدیث کی سند بھی بہت عالی عطا فرمائی ہے۔

آپ حدیث پڑھیں گے تو شروع میں یہ لفظ بھی آپ کو پڑھایا جائے گا کہ بہ قال حدثنا، بہ کی ضمیر اس سند کی طرف راجع ہے جو استاذ سے مصنف تک ہوتی ہے۔

میں نے صحیح بخاری کو حضرت حجۃ الاسلام سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھا ہے جو اپنے زمانہ کے ابن حجر تھے، انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھا انہوں نے حضرت شاہ عبدالغنی سے پڑھا ہے۔ اس طرح میرے اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمہ اللہ تعالیٰ تک صرف تین واسطے ہیں۔

علاوہ ازیں اجازتوں کے اعتبار سے بھی میری سند بہت عالی ہے، مجھے صحاح ستہ کی اجازت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے حاصل ہے ان کو حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ سے۔ (البلاغ کراچی، مارچ ۱۹۹۸ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

فَاعۡتَبِرُوۡا يَا اُولِي الۡاَبۡصَارِ

دل کے کانوں سے سُن فغاں میری درسِ عبرت ہے داستاں میری

درسِ عبرت

یعنی

اُندلس کے ایک مشہور عالم اور بزرگ کا نہایت عبرت انگیز واقعہ

جس کا

حضرت مولانا مُحمّد شَفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے عربی سے دلچسپ اُردو میں ترجمہ کیا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى:

لیل ونہار کا انقلاب، دنیا کا عروج وزوال، قوموں کی ترقی وتنزل، سلف وخلف کے واقعات ایک چشم بصیرت کے لئے ہزاروں عبرتیں دامن میں رکھتے ہیں، اور بآواز بلند کہہ رہے ہیں کہ ؎

جگہ جی لگانے کی یہ دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

الغرض تمام تاریخ عالم انہیں عبرتوں کا آئینہ ہے، جس کا ایک ورق ناظرینِ کرام

کے سامنے کھولا جاتا ہے، کیا خوب فرمایا ہے میرے آقا حضرت شیخ الہند نے

انقلابات جہاں واعظِ رب ہیں دیکھو ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

ذیل کا عبرت آموز واقعہ علامہ دمیری کی حیوۃ الحیوان مطبوعہ مصر سے نقل کیا جاتا ہے۔

غافل مرد کہ مرکب مردانِ مرد را درسنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

سن ھجری کی دوسری صدی ختم پر ہے، آفتاب نبوّت غروب ہوئے ابھی بہت زیادہ مدّت نہیں گذری، لوگوں میں امانت ودیانت اور تدین وتقویٰ کا عنصر غالب ہے، اسلام کے ہونہار فرزند جن کے ہاتھ پر اس کو فروغ ہونیوالا ہے کچھ برسر کار ہیں اور کچھ ابھی تربیت پارہے ہیں۔ ائمہ دین کا زمانہ ہے، ہر ایک شہر علمائے دین وصلحاء متقین سے آباد نظر آتا ہے۔

خصوصاً مدینۃ الاسلام (بغداد) جو اس وقت مسلمانوں کا دار السلطنت ہے، اپنی ظاہری اور باطنی آرائشوں سے آراستہ ہو کر گلزار بنا ہوا ہے، ایک طرف اگر اس کی دلفریب عمارتیں اور ان میں گذرنیوالی نہریں دل لبھانیوالی ہیں، تو دوسری طرف علماء اور صلحاء کی مجلسیں، درس وتدریس کے حلقے ذکر وتلاوت کی دلکش آوازیں خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کی دلجمعی کا ایک کافی سامان ہے، فقہاء ومحدثین اور عباد وزہاد کا ایک عجیب وغریب مجمع ہے، اس مبارک مجمع میں ایک بزرگ ابوعبداللہ اندلسی کے نام سے مشہور ہیں، جو اکثر اہل عراق کے پیر ومرشد اور استاذ ومحدث ہیں، آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے جن کا ایک عبرت ناک واقعہ ہمیں اس وقت ہدیۂ ناظرین کرنا ہے،

یہ بزرگ علاوہ زاھد وعابد اور عارف باللہ ہونے کے حدیث وتفسیر میں بھی ایک جلیل القدر امام ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو تیس ہزار حدیثیں حفظ تھیں، اور

قرآن شریف تمام روایات قرأت کے ساتھ پڑھتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے سفر کا ارادہ کیا، تلامذہ اور مریدین کی جماعت میں سے بھی بہت آدمی آپ کے ساتھ ہولئے، جن میں حضرت جنید بغدادی اور حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں، حضرت شبلی قدس سرہٗ کا بیان ہے کہ ہمارا قافلہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے نہایت امن وامان اور آرام واطمینان کے ساتھ منزل بمنزل مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا، کہ ہمارا گذر عیسائیوں کی ایک بستی پر ہوا، نماز کا وقت ہو چکا تھا لیکن پانی موجود نہ ہونیکی وجہ سے اب تک ادا نہ کرسکتے تھے، بستی میں پہنچ کر پانی کی تلاش ہوئی، ہم نے بستی کا چکر لگایا، اس دوران میں ہم چند مندروں اور گرجا گھروں پر پہنچے جن میں آفتاب پرستوں، یہودیوں اور صلیب پرست نصرانیوں کے رہبانیوں اور پادریوں کا مجمع تھا، جن میں سے ہر شخص ع ہر کس بخیال خویش خبطے دارد، کا نمونہ بنا ہوا تھا، کوئی آفتاب کو پوجتا اور کوئی آگ کو ڈنڈوت کرتا تھا، اور کوئی صلیب کو اپنا قبلۂ حاجات بنائے ہوئے تھا، ہم یہ دیکھ کر متعجب ہوئے اور اُن لوگوں کی کم عقلی اور گمراہی پر حیرت کرتے ہوئے آگے بڑھے، آخر گھومتے گھومتے بستی کے کنارے پر ہم ایک کنویں پر پہنچے، جس پر چند نوجوان لڑکیاں پانی پلا رہی تھیں، اتفاق سے شیخ مرشد ابو عبداللہ اندلسی کی نظر ان میں سے ایک لڑکی پر پڑی، جو اپنی خداداد حسن وجمال میں سب ہجولیوں سے ممتاز ہونے کے ساتھ زیور اور لباس سے آراستہ تھی، شیخ کی اس سے چار آنکھیں ہوتے ہی حالت دگرگوں ہونے لگی، چہرہ بدلنے لگا، اسی انتشار طبع کی حالت میں شیخ اسکی ہجولیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، یہ کس کی لڑکی ہے؟

لڑکیاں: یہ اس بستی کے سردار کی لڑکی ہے۔[1]

شیخ: پھر اس کے باپ نے اس کو اتنا ذلیل کیوں بنا رکھا ہے کہ کنویں سے خود ہی

[1] سردار کا لڑکی کو باہر نکالنا اور کنویں پر بھیجنا اگرچہ بے شبہ مذموم و نا روا تھا مگر ساتھ ہی اس کا لڑکی کے اخلاق اور خاوند کی اطاعت کا خیال ضرور قابل داد ہے، ہمیں چاہیئے کہ اس سے عبرت حاصل کریں اور میکہ کی بود وباش میں لڑکیوں کے اخلاق خراب نہ ہونے دیں انکو سسرال کے آداب اور خاوند کی اطاعت کا سبق دیں ۱۲ منہ

پانی بھرتی ہے، کیا وہ اس کے لئے کوئی ماما نوکر نہیں رکھ سکتا جو اس کی خدمت کرے؟ کیوں نہیں، مگر اس کا باپ ایک نہایت عقیل اور فہیم آدمی ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ لڑکی اپنے باپ کے مال و متاع حشم و خدم پر غرہ ہو کر کہیں اپنے فطری اخلاق خراب نہ کر بیٹھے، اور نکاح کے بعد شوہر کے یہاں جا کر اس کی خدمت میں کوئی قصور نہ کرے۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شیخ اس کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئے اور تین دن کامل اس پر گذر گئے، کہ نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ کسی سے کلام کرتے ہیں، البتہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو نماز ادا کر لیتے ہیں، مریدین اور تلامذہ کی کثیر التعداد جماعت ان کے ساتھ ہے، لیکن سخت ضیق میں ہیں کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے یہ حالت دیکھ کر پیش قدمی کی اور عرض کیا کہ اے شیخ! آپ کے مریدین آپ کے اس مستمر سکوت سے متعجب اور پریشان ہیں، کچھ تو فرمائیے کیا حال ہے؟

شیخ: (قوم کی طرف متوجہ ہو کر) میرے عزیزو! میں اپنی حالت تم سے کب تک چھپاؤں، پرسوں میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے اسکی محبّت مجھ پر اتنی غالب آچکی ہے کہ میرے تمام اعضاء و جوارح پر اسی کا تسلّط ہے، اب کسی طرح ممکن نہیں کہ میں اس سرزمین کو چھوڑ دوں۔

برنخیزم زسر کوئی تو تا جاں دارم
در رسد کار بجاں از سر جاں برخیزم

حضرت شبلی: اے ہمارے سردار! آپ اہل عراق کے پیر و مرشد، علم و فضل اور زہد و عبادت میں شہرۂ آفاق ہیں، آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے، بطفیل قرآن عزیز ہمیں اور اُن سب کو رُسوا نہ کیجئے۔

شیخ: میرے عزیزو! میرا اور تمہارا نصیب، تقدیر خداوندی ہو چکی ہے، مجھ سے ولایت کا لباس سلب کرلیا گیا اور ہدایات کی علامات اُٹھالی گئیں، یہ کہہ کر رونا شروع کیا، اور کہا ”اے میری قوم! قضا وقدر نافذ ہوچکی ہے اب کام میرے بس کا نہیں ہے“۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس عجیب واقعہ پر سخت تعجب ہوا اور حسرت سے رونا شروع کیا، شیخ بھی ہمارے ساتھ رو رہے تھے، یہاں تک کہ زمین آنسوؤں کے اُمنڈ آنیوالے سیلاب سے تر ہوگئی، اسکے بعد ہم مجبور ہوکر اپنے وطن بغداد کی طرف لوٹے، لوگ ہمارے آنیکی خبر سُن کر شیخ کی زیارت کے لئے شہر سے باہر آئے اور شیخ کو ہمارے ساتھ نہ دیکھ کر سبب دریافت کیا ہم نے سارا واقعہ بیان کیا واقعہ سُن کر لوگوں میں کہرام مچ گیا، شیخ کے مریدوں میں سے کثیر التعداد جماعت تو اسی غم وحسرت میں اسی وقت عالمِ آخرت کو سدھار گئی، اور باقی لوگ گڑ گڑا کر خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں دعائیں کر رہے ہیں کہ مقلب القلوب! شیخ کو ہدایت کر اور پھر اپنے مرتبہ پر لوٹا دے اس کے بعد تمام خانقاہیں بند ہوگئیں، اور ہم ایک سال تک اسی حسرت وافسوس میں شیخ کے فراق میں لوٹتے رہے، ایک سال کے بعد جب ہم مریدوں نے ارادہ کیا کہ چل کر شیخ کی خبر لیں، کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں تو ہماری ایک جماعت نے سفر کیا اور اس گاؤں میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے شیخ کا حال دریافت کیا۔

گاؤں والے: وہ جنگل میں خنزیر (سُور) چرا رہا ہے۔

ہم: خدا کی پناہ یہ کیا ہوا؟

گاؤں والے: اس نے سردار کی لڑکی سے منگنی کی تھی، اس کے باپ نے اس شرط پر منظور کرلیا اور وہ جنگل میں سُور چرانے کی خدمت پر مامور ہے۔

ہم یہ سُنکر ششدر رہ گئے اور غم سے ہمارے کلیجے پھٹنے لگے، آنکھوں سے

بیساختہ آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ نے لگا، بمشکل دل تھام کر اس جنگل میں پہنچے، جہاں وہ سُور چرار ہے تھے، دیکھا تو شیخ کے سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے اور کمر میں زنار باندھی ہوئی ہے، اور اس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے خنزیروں کے سامنے کھڑے ہیں جن سے وعظ اور خطبہ کے وقت سہارا لیا کرتے تھے، جس نے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا، شیخ نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سر جُھکا لیا، ہم نے قریب پہنچ کر السلام علیکم کہا۔

شیخ: (کسی قدر دبی زبان سے) وعلیکم السلام۔

شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: اے شیخ! اس علم وفضل اور حدیث وتفسیر کے ہوتے ہوئے آج تمہارا کیا حال ہے؟

شیخ: میرے بھائیو! میں اپنے اختیار میں نہیں، میرے مولانے جس طرح چاہا مجھ میں تصرّف کیا اور اس قدر تقرب کے بعد جب چاہا کہ مجھے اپنے دروازہ سے دور پھینکدے تو پھر اس کی قضا کو کون ٹالنے والا تھا، اے عزیزو! خدائے بے نیاز کے قہر سے ڈرو، اپنے علم وفضل پر مغرور نہ ہو، اس کے بعد آسمان کیطرف نظر اُٹھا کر کہا اے میرے مولا! میرا گمان تیرے بارے میں ایسا نہ تھا کہ تو مجھ کو ذلیل وخوار کر کے اپنے دروازہ سے نکالدیگا یہ کہہ کر خدا تعالیٰ سے استغاثہ کرنا اور رونا شروع کر دیا اور آواز دی کہ اے شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ! اپنے غیر کو دیکھ کر عبرت حاصل کر (حدیث میں ہے السعید من وعظ بغیرہ) یعنی نیک بخت وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: (رونے کی وجہ سے لکنت کرتی ہوئی آواز سے نہایت دردناک لہجہ میں) اے ہمارے پروردگار ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استغاثہ کرتے ہیں ہر کام میں ہم کو تیرا ہی بھروسہ ہے، ہم سے یہ مصیبت دفع کردے کہ تیرے سوا کوئی دفع کرنیوالا نہیں۔

خنزیران کا رونا اور انکی دردناک آواز سُنتے ہی سب کے سب وہیں جمع ہو گئے اور زمین پر مُرغ بسمل کی طرح لوٹنا اور چلاّنا شروع کیا، اور اس زور سے چیخے کہ انکی آواز سے جنگل اور پہاڑ گونج اُٹھے، یہ میدانِ حشر کا نمونہ بن گیا، ادھر شیخ حسرت کے عالم میں زار، زار رو رہے تھے۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: شیخ! آپ حافظ قرآن تھے اور قرآن کو ساتوں قرأت سے پڑھا کرتے تھے، اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟

شیخ: اے عزیز! مجھے تمام قرآن میں دو آیتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: وہ دو آیتیں کونسی ہیں؟

شیخ: ایک تو یہ ہے **ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم ان اللہ یفعل مایشاء** (جس کو اللہ ذلیل کرتا ہے اسکو کوئی عزت دینے والا نہیں بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے) اور دوسری یہ ہے **ومن یبدل الکفر بالایمان فقد ضلَّ سواء السبیل** (جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا)۔

شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: اے شیخ! آپکو تیس ھزار حدیثیں مع اسناد کے برزبان یاد تھیں اب ان میں سے بھی کوئی یاد ہے؟

شیخ: صرف ایک حدیث یاد ہے، یعنی **من بدل دینہ فاقتلوہ** (جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اسکو قتل کر ڈالو)۔

شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: ہم یہ حال دیکھ کر بصد حسرت و یاس شیخ کو وہیں چھوڑ کر واپس ہوئے اور بغداد کا قصد کیا ابھی تین منزل طے کرنے پائے تھے کہ تیسرے روز اچانک اپنے آگے دیکھا کہ نہر سے غسل کر کے نکل رہے ہیں، اور بآواز بلند شہادتین **اشھدان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھدانّ محمدًا رسول اللہ** پڑھتے جاتے تھے، اس وقت ہماری مسرّت کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس سے پہلے ہماری

مُصیبت اور حسرت ویاس کا اندازہ ہو۔

شیخ: (قریب پہنچ کر) ''مجھے ایک کپڑا دو'' اور کپڑا لے کر سب سے پہلے نماز کی نیّت باندھی، ہم منتظر ہیں کہ شیخ نماز سے فارغ ہوں تو مفصل واقعہ سُنیں، تھوڑی دیر کے بعد شیخ نماز سے فارغ ہوئے اور ہماری طرف متوجہ ہوکر بیٹھ گئے۔

ہم: اس خدائے قدیر وحلیم کا ہزار ہزار شکر جس نے آپکو ہم سے ملایا، اور ہماری عبرت کا شیرازہ بکھر جانیکے بعد پھر درست فرمادیا، مگر ذرا بیان تو فرمایئے کہ اس انکار شدید کے بعد پھر آپ کا آنا کیسے ہوا؟

شیخ: میرے دوستو! جب تم مجھے چھوڑ کر واپس ہوئے میں نے گڑ گڑا کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعاء کی کہ خداوندا مجھے اس جنجال سے نجات دے میں تیرا خطا کار بندہ ہوں، اس سمیع الدعاء نے باایں ہمہ میری آواز سُن لی اور میرے سارے گناہ محو کردیئے۔

ہم: شیخ! کیا آپ کے اس ابتلاء (آزمائش) کا کوئی سبب تھا؟

شیخ: ہاں جب ہم گاؤں میں اترے اور بتخانوں اور گرجا گھروں پر ہمارا گذر ہوا تو آتش پرستوں اور صلیب پرستوں کو غیر اللہ کی عبادت میں مشغول دیکھ میرے دل میں تکبّر اور بڑائی پیدا ہوئی کہ ہم مؤمن مؤحد ہیں، اور یہ کمبخت کیسے احمق ہیں کہ بے حس وبے شعور چیزونکی پرستش کرتے ہیں مجھے اسی وقت ایک غیبی آواز دیگئی کہ یہ ایمان وتوحید کچھ تمہارا ذاتی کمال نہیں بلکہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے، اور اگر تم چاہو تو ہم تمہیں ابھی بتلادیں''۔ اور مجھے اسیوقت یہ احساس ہوا کہ گویا کوئی جانور میرے قلب سے نکل کر اڑ گیا ہے جو درحقیقت ایمان تھا۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ: اس کے بعد ھمارا قافلہ نہایت خوشی اور کامیابی کے ساتھ بغداد پہنچا، سب مریدین شیخ کی زیارت اور انکے دوبارہ قبول اسلام سے خوشیاں منارہے ہیں خانقاہیں اور حجرے کھول دیئے گئے بادشاہِ وقت شیخ

کی زیارت کے لئے حاضر ہوااور کچھ ھدایا پیش کئے۔
شیخ پھر اپنی قدیم شغل میں مشغول ہو گئے، اور پھر وہی حدیث وتفسیر وعظ وتذکیر تعلیم وتربیت کا دور شروع ہو گیا، خداوند عالم نے شیخ کا بھولا ہوا علم پھر انکو عطا فرمادیا، بلکہ اب نسبتاً پہلے سے ہر علم وفن میں ترقی ہے تلامذہ کی تعداد چالیس ہزار، اور اسی حالت میں ایک مدّت گذر گئی، ایک روز ہم صبح کی نماز پڑھ کر شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک کسی شخص نے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، میں دروازہ پر گیا تو دیکھا کہ ایک شخص سیاہ کپڑوں میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔

میں: آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیا مقصود ہے؟

آنیوالا: اپنے شیخ سے کہدو کہ وہ لڑکی جسکو آپ فلاں گاؤں میں (اس گاؤں کا نام لیکر جسمیں شیخ مبتلا ہوئے تھے) آپکی خدمت کے لئے حاضر ہے، سچ ہے کہ جب کوئی خدا تعالی کا ہو رہتا ہے تو اسارا جہاں اس کا ہو جاتا ہے۔

چوں ازو گشتی ھمہ چیز ازگذشت   چوں ازو گشتی ھمہ چیز از تو گذشت

میں شیخ کے پاس گیا واقعہ بیان کیا، شیخ سنتے ہی زرد ہو گئے اور خوف سے کانپنے لگے، اس کے بعد اسکو اندر آنیکی اجازت دی۔
لڑکی شیخ کو دیکھتے ہی زار زار رو رہی ہے، شدّت گریہ دم لینے کی اجازت نہیں دیتی کہ کچھ کلام کرے۔

شیخ: (لڑکی سے خطاب کر کے) تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ اور یہانتک تمہیں کس نے پہنچایا؟

لڑکی: اے میرے سردار جب آپ ہمارے گاؤں سے رخصت ہوئے اور مجھے خبر ملی، تو میری بے چینی اور بے قراری جس حد کو پہنچی، اسکو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے، نہ بھوک رہی نہ پیاس، نیند تو کہاں آتی، میں رات بھر اسی اضطراب میں رہ کر صبح کے

قریب ذرا لیٹ گئی، اور اس وقت مجھ پر کچھ غنودگی سی غالب ہوئی، اس غنودگی میں میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تو مؤمنات میں داخل ہونا چاہتی ہے تو بتوں کی عبادت چھوڑ دے اور شیخ کا اتباع کر، اور اپنے دین سے توبہ کر کے شیخ کے دین میں داخل ہو جا۔

میں: (اسی خواب کے عالم میں اس شخص کو خطاب کر کے) شیخ کا دین کیا ہے؟

شخص: اس کا دین اسلام ہے۔

میں: اسلام کیا چیز ہے؟

شخص: اس بات کا دل اور زبان سے گواہی دینا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے برحق رسول و پیغمبر ہیں۔

میں: تو اچھا میں شیخ کے پاس کس طرح پہنچ سکتی ہوں؟

شخص: ذرا آنکھیں بند کرلو، اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو۔

میں: بہت اچھا، یہ کہا اور کھڑی ہوگئی، اور ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

شخص: (میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھوڑی دور چل کر) لو بس آنکھیں کھول دو، میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو دجلہ (ایک نہر ہے جو بغداد کے نیچے بہتی ہے) کے کنارے پایا، اب میں متحیر ہوں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ میں چند منٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

اس شخص نے آپکے حجرے کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سامنے شیخ کا حجرہ ہے، وہاں چلی جاؤ، اور شیخ سے کہدو کہ آپ کا بھائی خضر (علیہ الصلاۃ والسلام) آپکو سلام کہتا ہے، میں اس شخص کے اشارہ کے موافق یہاں پہنچ گئی، اور اب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں، مجھے مسلمان کر لیجئے۔

شیخ نے اس کو مسلمان کر کے اپنی پڑوس کے ایک حجرے میں ٹھہرا دیا کہ یہاں عبادت کرتی رہو۔

لڑکی عبادت میں مشغول ہوگئی، اور زہد وعبادت میں اپنے اکثر اقران سے سبقت لے گئی، دن بھر روزہ رکھتی ہے، اور رات بھر اپنے مالک بے نیاز کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی، محنت سے بدن ڈھل گیا ہے اور چمڑے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، آخر اسی میں مریض ہوگئی، اور مرض اتنا ممتد ہوا کہ موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اور اب مسافر آخرت کے دل میں اس کے سوا کوئی حسرت باقی نہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لے، کیوں کہ جس وقت سے یہ اس حجرے میں مقیم ہے، نہ شیخ نے اسکو دیکھا ہے اور نہ یہی شیخ کی زیارت کرسکی جس سے آپ چند گھڑی کے مہمان کی حسرت و یاس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اسوقت ع

تا زیرلب آرند وچشیدن نگذارند

کا مصداق بنا ہوا ہے، آخر شیخ کو کہلا بھیجا کہ موت سے پہلے ایک مرتبہ میرے پاس ہو جائیں ۔

یار اگر سر پر سیدن بیمار غمست
گو بیا خوش کہ ہنوزش نفسے می آید

شیخ یہ سُن کر فوراً تشریف لائے، جاں بلب لڑکی حسرت بھری نگاہوں سے شیخ کی طرف دیکھنا چاہتی ہے مگر آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسے ایک نظر بھر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتیں، آنسوؤں کا ایک تار بندھا ہوا ہے مگر ضعف سے بولنے کی اجازت نہیں لیکن اس کی زبان بے زبانی یہ کہہ رہی ہے ۔

دمِ آخر ہے ظالم دیکھ لینے دے نظر بھر کر سدا پھر دیدۂ تر کرتے رہنا اشک افشانی

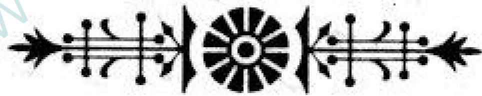
آخر لڑکھڑائی زبان اور بیٹھی ہوئی آواز سے اتنا لفظ کہا؟ کیا کہا؟

شیخ: (شفقت آمیز آواز سے) تم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ہماری

ملاقات جنّت میں ہونیوالی ہے۔

لڑکی شیخ کے ناصحانہ کلمات سے متأثر ہوکر خاموش ہوگئی اور اب یہ خاموشی ممتد ہوئی کہ یہ مہر سکوت صبح قیامت سے پہلے نہ ٹوٹیگی، اس پر کچھ دیر نہیں گذری تھی کہ مسافر آخرت نے اس دار فانی کو خیر باد کہا۔

شیخ اسکی وفات پر آبدیدہ ہیں مگر انکی حیات بھی دنیا میں چند روز سے زائد نہیں رہی، حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ چند ہی روز کے بعد شیخ اس عالمِ فانی سے رخصت ہوئے، کچھ دنوں کے بعد میں نے شیخ کو خواب میں دیکھا کہ جنّت کے ایک پُر فضا باغ میں مقیم ہیں، اور ستر ۷۰ حوروں سے آپ کا نکاح ہوا جن میں پہلی وہ عورت جس کے ساتھ نکاح ہوا ہے یہی لڑکی ہے اور اب وہ دونوں ابدالآباد کے لئے جنّت کی بیش قیمت نعمتوں میں خوش وخرم ہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمُ (ماہنامہ البلاغ کراچی اگست ۱۹۸۹ء)



از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اعمالِ باطنہ

پچھلی مجلسوں میں یہ بات بار بار واضح ہوچکی ہے کہ احکام اسلام دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق انسان کے بدن اور اعضاء و جوارح سے ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، صدقہ، نکاح، طلاق، میراث، معاملات، تجارت و اجارہ، معاشرت وغیرہ۔

دوسری قسم وہ ہے جن کا تعلق انسان کے قلب و روح سے ہے جن میں ایمان، اخلاص، توحید، صدقہ، اللہ و رسول کی محبت، عظمت، صبر، شکر، قناعت، زہد وغیرہ ہیں۔

پہلی قسم کی صحت و سقم اور صحیح و فاسد کا بیان کتب فقہ میں ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی صحت و سقم اور صحیح و فاسد کا بیان کتب اخلاق و تصوف میں، جس طرح پہلی قسم احکام دین اسلام کا عظیم شعار ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت احکام اسلام میں قسم دوم کو حاصل ہے۔ مگر سوء اتفاق کہیے یا کید شیطانی، مسلمانوں کے دیندار طبقوں میں بھی اسلام صرف پہلی قسم کے احکام کو سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری قسم کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے کہ گویا اسلام میں ان کی کوئی ضرورت و اہمیت ہی نہیں۔ عوام تو عوام علماء اور طلباء علم دین میں بھی اعمالِ باطنہ کی اصلاح کی طرف سے انتہائی بے فکری اور غفلت کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

اسی لئے مجلس کا موضوع صرف اعمالِ باطنہ کو قرار دیا ہے۔

اعمالِ باطنہ کی مجمل فہرست

جس طرح کے اعمال ظاہرہ میں کچھ چیزیں فرائض واجبات اور مستحبات ہیں جن کے ادا کرنے پر بہت بڑا اجر وثواب اور نہ کرنے پر سخت عذاب ہے اور کچھ چیزیں حرام وناجائز یا مکروہات ہیں جن کے کرنے میں........سخت وعیدیں عذاب کی ہیں اوران کے چھوڑنے میں ثواب ہے اسی طرح اعمال باطنہ میں کچھ فرائض و واجبات ہیں جن کو فضائل کہا جاتا ہے۔اور کچھ چیزیں حرام وناجائز ہیں جن کو رذائل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان فضائل ورذائل کی مختصر فہرست یہ ہے' ان کی تفصیلات اگلی مجلسوں میں انشاءاللہ تعالیٰ بیان ہوں گی۔

اعمال باطنہ میں سب سے اہم فرض تو ایمان اوراس کے متعلقہ عقائد ہیں جن کے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا،ان کا بیان چونکہ مستقل علم عقائد میں کیا جاتا ہے اوراس کی تعلیم داخل نصاب بھی ہے اس لئے اس مجلس میں ان کے علاوہ دوسرے اعمال باطنہ کا بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔

اعمالِ باطنہ کے فرائض واجبات

توبہ' صبر' شکر' رجاء' خوف' زہد' توحید' توکل' محبت' رضا' اخلاص' صدق عمل' یہ اصطلاحی الفاظ ہیں ان کی تشریح اوران کے حصول کے طریقے آئندہ ذکر کئے جائیں گے۔

اعمالِ باطنہ کے حرام وناجائز

شہوت' آفات زبان' غضب' کینہ' حسد' حب دنیا' بخل' حرص' حب جاہ' ریاء' تکبر وغرور۔ یہ بھی اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان کا پورا مفہوم وحقیقت اور ان سے بچنے کے طریقے آئندہ ذکر کئے جائیں گے۔

اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں ایک خاص فرق

پچھلی کسی مجلس میں یہ بات بتلائی گئی تھی کہ اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ آنکھوں سے مشاہدہ کئے جاتے ہیں جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ اعمال حسنہ آنکھوں سے محسوس ہوتے ہیں اسی طرح چوری، ڈاکہ، جھوٹ، غیبت، بدمعاشی، عیاشی بھی محسوسات ہیں۔ ہر آنکھوں والا ان کی برائی بھلائی کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔

لیکن اعمال باطنہ تکبر، حسد، کینہ، حب جاہ، حب مال، بخل، حرص وغیرہ کسی کو آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ جو شخص ان گناہوں میں مبتلا ہے۔ مگر ظاہری اعمال کا پابند ہے اس کو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ باطنی فسق و فجور میں مبتلا ہے، وہ لوگوں کی نظر میں نیک صالح متقی بنا رہ سکتا ہے۔

دوسروں کی نظروں سے باطنی عیوب کا مستور رہنا تو ظاہر ہے اس سے زیادہ قابل فکر یہ ہے کہ باطنی عیوب اور گناہوں کو بسا اوقات وہ شخص بھی نہیں پہچانتا جو ان میں مبتلا ہے کیونکہ جتنے باطنی گناہ اور عیوب ہیں ان کی شکلیں اور آثار ایسے کاموں سے ملتے جلتے ہیں جو حسنات یا مباحات ہیں۔

مثلاً تکبر اور عزت نفس ملتے جلتے دو کام ہیں، تکبر حرام ہے اور عزت نفس کی حفاظت مطلوب شرعی ہے۔ حسد اور غبطہ ملتے جلتے ہیں، حسد حرام ہے۔ غبطہ جائز بلکہ مطلوب شرعی ہے۔ کیونکہ غبطہ کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کی قسمت و فضیلت کو دیکھ کر اس کی تمنا کرنا کہ یہ مجھے بھی حاصل ہو جائیں۔ یہ کوئی مذموم چیز نہیں۔ مذموم حسد ہے جس میں دوسرے کی نعمت و فضیلت کے سلب ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔

اسی طرح باطن کے جتنے عیوب میں مبتلا ہے بسا اوقات دھوکہ میں رہتا ہے۔ تکبر کو عزت نفس اور حسد کو غبطہ قرار دے کر بے فکر ہوتا ہے۔

اعمالِ باطنہ کی اصلاح کے لئے مرشد کی ضرورت

اس لئے اعمال باطنہ کی اصلاح عادتاً اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ اپنے آپ کو کسی ایسے شیخ مرشد کے حوالے کردے جو باطنی فضائل اور رذائل میں پوری بصیرت اور مہارت رکھتا ہو۔ خود بھی باطنی رذائل سے پاک رہنے کی کوشش میں لگا ہو اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتا ہو۔ پھر اس کی تشخیص و تجویز کے سامنے اپنے رائے کو بالکل فنا کر کے ٹھیک اسی طرح عمل کرے جس طرح ایک بیمار اپنے آپ کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کے حوالہ کر کے اسی کی تشخیص و تجویز پر عمل کرتا ہے اگر خود بھی حکیم یا ڈاکٹر ہوتا ہے تو بیمار ہونے کی حالت میں اپنی رائے اور اپنی تجویز کو چھوڑ کر معالج کا مکمل اتباع کرتا ہے۔ اعمال ظاہرہ کے صحت وفساد کو تو کسی استاد سے پڑھ پڑھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے اور کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اعمال باطنہ کی اصلاح میں محض کسی کتاب کا پڑھ لینا اور پوری طرح سمجھ لینا بھی کافی نہیں ہوتا ان کی اصلاح مرشد کامل کے اتباع کے بغیر عادتاً ممکن نہیں۔ خرق عادت کے طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو کوئی دولت بغیر اسباب ظاہری کے عطا فرما دیں۔ یہ الگ بات ہے مگر اس کو کام کا طریقہ نہیں کہا جا سکتا۔

اعمالِ باطنہ کی اصلاح کے لئے امام غزالی کی تجویز

حجتہ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ نے باطنی امور میں خاص بصیرت عطا فرمائی ہے اور تربیت و تعلیم کا بھی ایک خاص سلیقہ ان کو عطا ہوا ہے' ان کی تجویز یہ ہے کہ

عیوب نفس اور اپنے باطنی گناہوں سے آگاہ ہونے کے چار طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ مرشد کامل اور اس کا اتباع ہے

سب سے بہتر اور مکمل طریقہ باطنی عیوب سے مطلع ہونے اور ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ کسی ایسے شیخ کامل کو تلاش کرے جو شریعت وطریقت کا جامع ہو، باطنی فضائل ورذائل کے پہچاننے میں اور ان کے علاج میں مہارت وبصیرت رکھتا ہو۔

ایک شیطانی فریب اور اس کا جواب

اس موقع پر عام طور سے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ مرشد کامل اس زمانے میں کہاں سے لائیں؟ ہر طرف ہر طبقے میں دھوکہ فریب اور نام ونمود اور نمائش ہے کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل ہے۔ علماء صلحاء اور درویشوں کے بیشمار تجربے اور ان کی غلط کاریوں کی طویل فہرست اس جگہ شیطان انسان کے سامنے کر کے اس کو مایوس کر دینا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت اقبال مرحوم کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی سالوسی ہے سلطانی بھی عیاری

اس فتنہ وفساد اور فسق وفجور کے زمانے کے متعلق اقبال مرحوم کا یہ شکوہ نہ غلط ہے نہ بیجا۔ مگر اس کا کوئی یہ مطلب قرار دے کہ اب اصلاح حال سے مایوسی ہے اس کا کوئی راستہ نہیں رہا اس لئے اب جو کچھ اپنے جی میں آئے وہ کرو، یہ سراسر غلط فہمی ہوگی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کا یہ شر وفساد اور کوتاہی وکمزوری صرف علماء صلحاء ہی کے طبقہ میں ہے یا تمام طبقات دنیا کا یہی حال ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ اس زمانہ میں ڈاکٹری تحقیقات اور نوایجاد آلات وادویہ کی بہتات کے باوجود وہ ڈاکٹر ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جو فن کا ماہر بھی ہو اور غور وفکر بھی پورا کرے اور اس کے ہاتھ میں شفاء بھی ہو۔

ہزاروں وکیلوں میں کوئی ایک قابل اعتماد واطمینان نظر آتا ہے، لاکھوں تاجروں میں سچائی کی تجارت کرنے والے گنے چنے چند ہوتے ہیں۔ لاکھوں صنعت کاروں میں کامل ماہر اور قابل اعتماد خاص خاص ہی ہوتے ہیں۔

مگر نہ کسی نے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر اپنے علاج میں خودرائی اختیار کی۔ نہ وکیلوں کو چھوڑ کر خود اپنے مقدمات کی پیروی کی، نہ تاجروں سے بیوپار چھوڑا، نہ صنعتکاروں سے معاملہ ختم کیا۔ انہیں میں سے انتخاب اور تلاش کر کے کام چلایا جاتا ہے۔

آج بازار میں نہ گھی خالص ملتا ہے نہ دودھ نہ آٹا نہ مسالحہ مگر اس کی وجہ سے کسی کو نہیں سنا کہ اس نے گھی، دودھ کا استعمال چھوڑ دیا ہو یا آٹے کی بجائے کچھ اور کھانا شروع کر دیا ہو۔

ہزار کوششیں کر کے اسی فریب دھوکہ کے بازار میں تلاش کرنے والے خالص اور اچھی چیزیں نکال لاتے ہیں۔

آج دین کے معاملہ میں یہی روش کیوں نہ اختیار کی جبکہ دین کے معاملہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ وعدہ بھی ہے کہ صادقین کاملین قیامت تک رہیں گے۔ اور تلاش کرنے والے ان کو پائیں گے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "**یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ و کونوا مع الصادقین**" اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ اور سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ۔

سچے لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبان، قول فعل ہر چیز کے سچے ہوں۔ اور یہی خلاصہ ہے ولی کامل کے اوصاف کا۔ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت میں فرمایا۔

یہ حکم سچے لوگوں کے ساتھی بننے کا ظاہر ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کو ہے۔ اس لئے اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ مسلمانوں کا مجمع کسی زمانے میں صادقین سے خالی نہ رہے گا۔

پھر اسی سے امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اجماع امت کے حجت ہونے پر بھی استدلال کیا ہے۔ کیونکہ جب مسلمانوں کا مجمع صادقین سے خالی نہیں ہوسکتا تو یہ ممکن نہیں کہ "سب مسلمان کسی گمراہی پر جمع ہوجائیں۔ کیونکہ صادقین گمراہی کا شکار نہیں ہوسکتے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانہ ہر چیز کے خصوصاً نیکی اور خیر کے انحطاط اور تنزل کا ہے۔ دھوکہ فریب اور نمائش ونمود بہت ہے اصلیت اور حقیقت بہت کم ہے۔ خیر القرون میں خیر اور صدق وصلاح کی کثرت تھی۔ ہر جگہ ہر گوشہ میں یہی جنس عام تھی۔ آج یہ جنس صلاح بہت تلاش سے ملتی ہے وہ بھی اس معیار نہیں ملتی جو سلف کے زمانے میں تھی۔

مگر جیسا کہ اس زمانے میں یہ جنس کمیاب ہوگئی ہے اور اس کی تلاش میں دشواریاں پیدا ہوگئیں ویسے ہی حق تعالیٰ نے اس زمانے کے لوگوں کی مزدوری اتنی بڑھادی کہ سلف کے زمانے سے اس کی کوئی نسبت نہیں۔

حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آخری زمانے میں نیک کام کرنے والے ایک شخص کو پچاس عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملے گا۔ صحابۂ کرام نے سوال کیا کہ پچاس اس زمانے کے یا ہمارے زمانے کے؟

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں تمہارے پچاس کے برابر اجر ملے گا۔ اب آپ اندازہ لگائیے اس فتنے کے زمانے میں جو شخص نیکی پر قائم رہے اس کا اجر پچاس ابوبکر وعمر اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے برابر ملے گا۔

ان کے عمل کی یہ مزدوری اسی لئے بڑھائی گئی ہے کہ اس زمانے میں نیک لوگوں کی صحبت بھی بہت مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور نیکی پر قائم رہنا بھی انگارے کو ہاتھ میں محفوظ رکھنے کی طرح مشکل ہے۔

ایک اور شیطانی فریب

مرشد کی تلاش اور شیخ کے انتخاب میں شیطان ایک اور فریب میں لوگوں کو مبتلا کرتا ہے وہ یہ کہ اسلاف امت اور اکابر اولیاء اللہ کے حالات جو کتابوں میں مدون ہیں ان کو پڑھ کر وہ اپنے زمانے میں بھی اسی معیار کے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں اور جب وہ نظر نہیں آتے تو مایوس ہو کر اصلاح کا خیال ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اس میں فریب یہ ہے کہ زمانے کا تنزل وانحطاط ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ قرآن وحدیث اس پر شاہد ہیں۔ آج نہ کوئی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوتا ہے نہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ دوسرے صحابہ۔ نہ آج جنید رحمہ اللہ تعالیٰ وشبلی واپس آئیں گے۔ نہ معروف کرخی اور ذوالنون مصری پائے جائیں گے۔ جو شخص ان بزرگوں کے بلند حالات ومقامات کا معیار لے کر تلاش کرے گا اس کے لئے محرومی ضروری ہے۔ ہونا چاہئے کہ ولی کامل کے لئے جو کم سے کم شرائط ہیں ان کو تلاش کرے تو ہر زمانے میں اور ہر جگہ انشاء اللہ تعالیٰ صادقین کاملین مل جائیں گے۔

اولیاء اللہ کی پہچان

چند چیزیں ہیں اول بقدر ضرورت علم دین جس سے احکام پر عمل کر سکے۔ اگرچہ ضابطہ کا عالم نہ ہو۔

دوسرے دوام طاعت کہ احکام شرعیہ فرائض واجبات میں کوتاہی نہ کرے اور محرمات ومکروہات سے اجتناب کرے اگر اس میں کبھی لغزش ہو تو فوراً توبہ کرے۔

تیسرے کثرت ذکر یعنی اس کے اکثر اوقات اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں خواہ وہ ذکر تسبیحات واوراد کا ہو یا خالص اللہ کی رضا جوئی کے لئے تعلیم دین اور تصنیف و تالیف اور فتویٰ وارشاد کا ہو کیونکہ یہ سب چیزیں اخلاص نیت کے ساتھ ذکر اللہ میں داخل ہیں۔

چوتھے یہ کہ وہ کسی باقاعدہ شیخ کامل سے اصلاح وارشاد کی اجازت پائے ہوئے ہو۔
پانچویں یہ کہ اس کی صحبت میں چند روز بیٹھ کر آخرت کی طرف رغبت اور دنیا کے فضول بکھیڑوں سے وحشت کے آثار ظاہر ہونے لگیں۔
بس اتنی علامات جس شخص میں پائی جائیں وہ اصلاح وارشاد کے لئے کافی ہیں۔ اگر ان اوصاف کے متعدد آدمی سامنے ہوں تو ان میں سے جس کے ساتھ عقیدت ومحبت اور طبعی مناسبت زیادہ ہو اس کو اختیار کرے۔

اصلاحِ باطن کا دوسرا طریقہ

اگر کسی شخص کو شرائط مذکورہ کے مطابق کوئی شیخ ومرشد دستیاب نہ ہو تو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو چاہیے کہ اپنے مخلص دوستوں کو اپنی اصلاح کے لئے اپنے اوپر مسلط کرلے ان سے پوچھا کرے کہ تمہیں میرے اندر کیا کیا عیب نظر آتے ہیں وہ جو کچھ بتلائیں ان کی اصلاح کی فکر میں لگ جائے۔
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معلوم کیا کہ آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ مجھے یہ بتلائیں کہ آپ نے مجھ میں کیا کیا عیب دیکھے ہیں؟ پہلے تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادب کی بناء پر بیان کرنے سے انکار کیا۔ مگر جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصرار کر کے مجبور کردیا تو فرمایا کہ میں آپ میں دو عیب دیکھتا ہوں۔
اول یہ کہ آپ کے دستر خوان پر ایک سے زیادہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ آپ کے پاس ضرورت سے زائد کپڑوں کا ایک جوڑا ہے۔ ایک آپ رات کو پہنتے ہیں دوسرا دن کو استعمال فرماتے ہیں۔
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ ان دونوں کا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ابھی علاج ہوجائے گا، آپ اس کی فکر نہ کریں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تمام اسلاف امت کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ اپنے نفس کے عیوب سے باخبر رہتے۔ اور ان کا علاج کرنے سے کبھی غفلت نہ برتتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس غیر ملکی سفراء آئے۔ ان کی وجہ سے مجلس کو آراستہ کیا گیا۔ دربار سے فارغ ہوتے ہی ایک مشکیزہ اٹھایا اور کنوئیں پر جا کر خود اس میں پانی بھرا اور پڑوس کی ایک بڑھیا کے مکان میں یہ پانی پہنچا دیا۔

لوگوں نے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ غیر ملکی سفراء کی وجہ سے جو اپنی مجلس کو ایک شان وشوکت پڑی مجھے اس سے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں میرے نفس میں تکبر نہ پیدا ہو جائے۔ اس کی اصلاح کے لئے ایسا کام کیا جس سے اپنے نفس کی حقارت واضح ہو۔

یہ بھی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اسلاف امت کی خصوصیت دوستانہ طور پر خیر خواہی و ہمدردی سے ایک دوسرے کے عیوب پر اس طرح تنبیہ کر دیتے تھے کہ اس میں مخاطب کی تحقیر وتوہین یا نقصان رسانی کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔

آج ایسے دوست ملنا بھی آسان نہیں۔ آج تو عیب دیکھ کر اس کے سامنے تو کچھ نہ کہیں گے مگر دوسروں سے کہتے پھریں گے اور تشہیر کریں گے۔ ایسے لوگ درحقیقت دوست نہیں ہوتے۔ دوست بھی صلحاء اور مخلص تلاش کرنے چاہئیں۔

تیسرا طریقہ

اپنے دشمنوں سے اپنی اصلاح کرائے وہ اس طرح کہ دشمنوں کی باتیں جو اس کی عیب جوئی میں کرتے ہیں، خوب غور سے سنے پھر اپنے حالات کا جائزہ لے کہ اس میں کتنی بات سچی ہے اور کونسا عیب واقعی مجھ میں موجود ہے؟ اس کے ازالہ کی فکر

کرے۔ بزرگان سلف کا عام طریقہ کار یہی تھا۔ اپنے زمانے کے بزرگ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک واقعہ یاد آیا۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب خانقاہ قدوسی گنگوہ میں مقام فرمایا اور وہاں درس حدیث اور اصلاح ارشاد کا سلسلہ شروع کیا تو شرک و بدعت کی رسموں پر خاص طور سے لوگوں کو تنبیہ فرماتے تھے۔ بعض رسائل بھی ان مسائل کے متعلق شائع ہوئے۔

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی جو اس زمانے میں بہت ہی بدعات کو رواج دے رہے تھے۔ انہوں نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف طرح طرح کے الزامات اور بہتان لگانے شروع کئے اور اشتہارات ورسائل میں انتہائی بدزبانی اختیار کی۔ یہ رسائل حضرت کے پاس آتے تو حضرت مولانا محمد بخش صاحب سے ان کو پورا سناتے تھے کیونکہ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ خط وکتابت کا سب کام آپ کے مرید خاص مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ انجام دیتے تھے۔

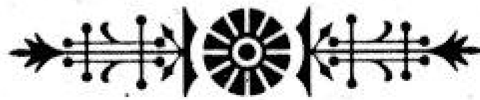
یہ رسائل چونکہ انتہائی بدزبانی اور افترا پردازی پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کا سنانا بھی مولانا کے لئے آسان نہ تھا۔ کچھ روز تک مولانا نے یہ رسائل حضرت کی خدمت میں پیش نہ کئے چند روز کے بعد دریافت فرمایا کہ مولوی یحییٰ! کیا ہمارے دوست نے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا؟ بہت دنوں سے کوئی رسالہ میرے خلاف نہیں آیا۔ اس وقت مولانا نے فرمایا کہ حضرت رسائل تو کئی آئے ہیں مگر میں نے دیکھا کہ ان میں گالیوں اور افتراء و بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے یہ خیال کیا کہ خواہ مخواہ ان کو سنا کر کیوں آپ کے قلب کو مکدر کروں؟ یہ تو مولانا کا اپنا خیال تھا۔

مگر دوسری طرف اللہ کے مقدس بندے تھے جو اپنی ہر ہوا وہوس اور عزت وجاہ کو اللہ کے لئے قربان کر چکے تھے۔ فرمایا کہ نہیں۔ ایسا نہ کرو جو رسالہ آئے مجھے ضرور

سنا دیا کرو۔ میں ان سب کو اس نظر سے سنتا ہوں کہ جو باتیں میرے عیب کی اور میرے خلاف وہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں کوئی بات سچی ہو تو میں اپنی اصلاح کرلوں۔

چوتھا طریقہ

باطنی عیوب پر مطلع ہونے اور ان کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ کو لوگوں میں جو بات بری اور قابل اعتراض نظر آئے اس کو اپنے نفس میں ٹٹولیں کہ کہیں میرے اندر تو یہ عیب نہیں اگر اس کا کچھ احساس ہو تو فوراً اس کی اصلاح کا اہتمام کریں۔ اس طرح بھی ایک انسان اپنے عیوب پر مطلع ہو کر اصلاح کرسکتا ہے اور درحقیقت تو ضرورت اس کی ہے کہ ان سبھی طریقوں سے اپنی اصلاح کی فکر جاری رکھیں۔ بالخصوص پہلے طریقہ کے لئے مقدور بھر پوری کوشش کریں۔ واللّٰہ المستعان وعلیہ التکلان۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی بحوالہ ماہانہ الصیانۃ لاہور جون ۱۹۹۸ء)



مجالس مفتیٔ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہٗ

احقر نے یہ تمام فرمودات دار العلوم کراچی؟ میں بزمانہ طالب علمی حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی آرامگاہ یا دار الافتاء میں سُنے ہیں، اور مجلس ختم ہونے کے بعد دار الافتاء میں بیٹھ کر قلمبند کیے ہیں۔

۱۔ ۱۳۹۵/۱/۲۷ھ

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے حوالہ سے ارشاد فرمایا۔ کہ اگر کسی شہر میں ضابطہ کے بزرگ اور بڑے نہ ہوں تو نیک سیرت اور صالح لوگوں کے پاس جایا کریں۔

۲۔ ۹۵/۳/۱ھ

بعد المغرب مجلس میں ارشاد فرمایا، کہ ایک شخص نے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا، " العالم ماهو؟ قال العالم، العامل، راغب الى الآخرة، زاهد فى الدنيا۔ [۱] پھر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے طلبہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمہارے آٹھ سال تک کتابیں پڑھنے کا اصل مقصد اور خلاصہ تفقہ فی الدین ہے، اصل مقصد کتابیں پڑھنا اور رٹنا نہیں ہے۔

[۱] ترجمہ: عالم کون ہے؟ آپ نے فرمایا، عالم وہ ہے جو باعمل ہو، آخرت کی طرف راغب ہو اور دنیا سے بے رغبت ہو۔

۳/۱۵/۷/۹۵ھ

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی کہ "اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین" کہ تقویٰ صادقین کی صحبت میں رہنے سے حاصل ہوگا، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے تجربہ شاہد ہے کہ تقویٰ پیدا ہوجاتا ہے، اور فرمایا کہ خلاصہ قصد السبیل، تعلیم الدین، مواعظِ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ، اور حیٰوۃ المسلمین اور کا فرصت کے وقت گھر جاکر چھٹیوں میں مطالعہ کرو اور اپنے محلّہ کی مسجد میں حیٰوۃ المسلمین کو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر سُناؤ، اور آخر میں فرمایا کہ اگر کسی نے میری اس نصیحت پر عمل کیا تو انشاء اللہ کامرانی ہی کامرانی ہے، اور ہمیشہ اعمال میں صدق کا خیال رکھو، بس طالب علموں کا سب سے پہلا عمل صدق ہے اگر انہوں نے اس پر عمل کرلیا اور اپنے تمام امور میں اس کا خیال رکھا تو گویا انہوں نے سارے دین پر عمل کرلیا۔

۴۔۲۷/۷/۹۵ھ

اساتذہ کو نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، کہ شاید میں آنے والے سال تک حیات نہ رہوں، معلوم نہیں میں کہاں ہوں گا؟ اور تم کہاں ہوگے؟ اس لئے تم سے یہ بات عرض کررہا ہوں، کہ جو آپ حضرات نے طریقہ تقاریر لکھوانے کا بنا رکھا ہے، اگر اُسے شروع سال سے آخر تک چلا سکتے ہو تو بہت ہی نافع ہے، لیکن عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا ہوتا نہیں ہے، بلکہ اساتذہ اپنا تمام زور کتاب اطہارۃ، اور زیادہ سے زیادہ کتاب الصلوٰۃ پر خرچ کردیتے ہیں، اس کے بعد نہ اُستاد کو کچھ معلوم ہوتا ہے کہ کیا پڑھا رہا ہوں اور نہ طالب علموں کو معلوم ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ بس ورق گردانی ہورہی ہے کہ کسی طرح کتاب ختم ہوجائے' کبھی بیس ۲۰ صفحے اور کبھی ۳۰ تیس صفحے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کتاب الطہارۃ کتاب الصلوٰۃ اور کچھ تھوڑا سا کتاب العلم کا محقق بن کررہ جاتا ہے، اس کے سوا اس کو کچھ نہیں آتا۔

حالانکہ ہمارا یہ مقصد نہیں اور نہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے ارشادات کا یہ مقصد ہے، اصل مقصد انسان بنانا ہے، اور یہ مقصد بالکل متروک ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الرقاق اور کتاب الأدب جیسے ابواب کی طالب علم کو ہوا تک نہیں لگتی ہے، وہ ان باتوں سے بالکل خالی الذہن ہوتا ہے، میرے عزیزو اور بزرگو! یہ انتہائی مضر اور نقصان دہ ہے، قابلِ ترک بلکہ واجب الترک ہے اور طریقہ یہ ہے جو سلف سے چلا آرہا ہے۔

پھر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتیٔ دار العلوم دیوبند سے اپنی مشکوٰۃ پڑھنے اور ان کے پڑھانے کا طریقہ بیان فرمایا۔ کہ وہ مرقاۃ اپنے سامنے رکھتے تھے، اس کے حاشیہ پر مشکوٰۃ تھی، اسی میں پڑھاتے تھے، کوئی بات سمجھانے کی ہوتی تو مرقاۃ کی عبارت پڑھ کر بیان فرمادی، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں مشکوٰۃ کی حدیث تک یاد ہوگئیں، اور الحمد للہ بعض احادیث اب تک یاد ہیں، اگر بھئی اسی طرح پڑھانا ہے جیسا اب پڑھا رہے ہو تو سارے مسائل پڑھانے کی کیا ضرورت ہے، شروع و آخر سے پڑھا کر سند دیدی جائے، اور یہ روایت کا جو چکّر چل رہا ہے، معلوم نہیں کس نے نکالا ہے، کہ روایۃً اسباق ہو رہے ہیں، سب فضول سی بات ہے۔ خدا کے لئے کچھ سوچو، سمجھو، ہمارا مقصد زندگی اور درس و تدریس کا مقصد ملازمت نہیں ہے، میں کسی ایک کو نہیں کہہ رہا ہوں سب اس میں شریک ہیں، اور میں تو سب بھول گیا، ماشاء اللہ آپ حضرات کا علم تازہ ہے، پڑھانے میں شروع سال سے لیکر سال کے آخر تک یکسانیت ہو، جو وقت شروع سال میں تھا، آخر میں اسی کا خیال رکھو، یہ نہ ہو کہ سال کے آخر میں رات کو بھی اسباق ہو رہے ہیں، دن کو بھی سبق ہو رہا ہے، طلبہ بھی پریشان ہیں، اساتذہ بھی کتاب ختم کرانے کی فکر میں ہیں۔

اور اس بات کا خاص خیال رکھو کہ مدرسہ کے اوقات کی پوری پابندی ہو کہ ادھر گھنٹہ بجا اور ادھر درسگاہ میں قدم رکھا، اس سے بڑی برکت ہوگی اور یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ تجربہ شاہد ہے اور ایسا ہوتا چلا آیا ہے، گھنٹہ لگنے کے نہ پانچ

منٹ بعد شروع کرواور نہ گھنٹہ لگنے سے پانچ منٹ پہلے ختم کرو، بس یہ چند باتیں کہنی تھیں، اپنے لئے اور دارالعلوم واساتذہ کیلئے دُعا کریں۔

۵۔ ۹۵/۱۱/۱۴ھ

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی دارالعلوم کراچی تشریف آوری کے موقع پر اپنی قیام گاہ پر بحالت استراحت حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوکر فرمایا، کہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے جیسے ہم ہیں ویسے تم ہو، ہاں ایک فرق ہے وہ یہ کہ ہم نے آدمی دیکھے ہیں اور تم نے آدمی نہیں دیکھے ہیں، کوئی بیل ہمیں آدمی کے روپ میں دھوکہ نہیں دے سکتا، ایک تم ہو کہ تم نے آدمی دیکھے نہیں اس لئے تم دھوکہ کھاؤ گے، اور پہچان نہ سکو گے، کہ یہ آدمی ہے یا بیل، حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تائید میں فرمایا، سچ فرمایا، اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ ان لوگوں نے کتاب والوں کو پڑھا تھا، اور ہم نے صرف کتابیں پڑھی ہیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نہایت تواضع کے ساتھ بار بار حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا تشریف لانے پر شکریہ ادا کر رہے تھے، اور فرما رہے تھے کہ مجھے عرصہ سے آپ کی زیارت کی تمنا تھی، اللہ تعالیٰ نے آج پوری کرادی، اس دوران میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ رو رہے تھے، عجیب عالم تھا، دونوں حضرات آمنے سامنے گاؤ تکیہ کے ساتھ سہارا لئے ہوئے تھے، اس کے بعد دونوں حضرات کی کچھ دیر تنہائی میں بات چیت ہوئی، پھر حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ دارالافتاء میں تشریف لے آئے۔

۶۔ ۱۳۹۶/۵/۱ھ

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، کہ سفر درپیش ہے اور زادِ راہ کچھ نہیں، اس ارشاد کے بعد حاضرینِ مجلس کو نصیحت فرمائی، فرمایا کہ میں نے چلتے چلتے وقت

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت مختصر سی نصیحت فرمادیجئے، آپ نے یہ حدیث نصیحۃً پڑھ کر سُنائی۔

"اذاامسیْتَ فلا تنظر الصباح، واذااصحبحت فلا تنظر المساء وَعُدَّ نفسك من اصحابِ القبور"[۱]

اور فرمایا کہ آخرت کی فکر کرو، موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، میں دل کے مرض میں مبتلا ہوں، جب تکلیف کی شدّت ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ موت کا وقت آ گیا، پھر اللہ تعالیٰ تکلیف ہلکی فرمادیتا ہے، یہ سلسلہ تقریباً پانچ سال سے چل رہا ہے، اور اس اثناء میں کئی جوان چل بسے جو بالکل تندرست وتوانا تھے، بس بھئی اللہ کو اور اپنی حقیقت کو مَت بُھولو، آج ہم ان دونوں چیزوں کو بُھول بیٹھے ہیں، پھر ایک شعر پڑھا۔

نظر آتے ہیں جو، نہیں اپنے
جو ہے اپنا، نظر نہیں آتا

۷۔۷/۶/۹۶ھ

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مجلس میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا، اور مجلس میں پڑھی جانے والی ملفوظات کی کتاب کو روک کر فرمایا، کہ کام تو سب ہی کرتے ہیں، کوئی دُنیا کا کام کرتا ہے اور کوئی دین کا، اصل بات یہ کہنا ہے کہ کام خالص دُنیاوی ہو، خواہ دفتری ہو، یا ملازمت ہو، اگر اُسے ڈیوٹی سمجھ کر انجام دے رہا ہے تو یہ سمجھو کہ وہ بڑا ولی اللہ ہے، جس چیز میں جس قدر خلوص ہوگا، اسی قدر اس میں وزن ہوگا، نوافل اور عبادت میں تو عدمِ خلوص اور ریا کا احتمال زیادہ ہے لیکن جو ایسے کام ہیں، جیسے ڈیوٹی، ملازمت، فتویٰ نویسی وغیرہ، لوگ اُسے دیکھ کر ولی اللہ نہیں سمجھتے،

[۱] ترجمہ: جب آپ شام کریں تو صبح کا انتظار نہ کریں اور جب صبح کریں تو شام کا انتظار نہ کریں، اور اپنے آپ کو اہلِ قبور میں سے شمار کریں۔

میں نے رات ایک بجے تک فتویٰ لکھا، اس پر غور وخوض کیا، بڑی بڑی کتابوں کو چھانا، اب کسے معلوم ہے اور نہ اس شخص کو معلوم ہے جس کو یہ فتویٰ ملے گا اگر کسی نے رات کو اُٹھ کر دیکھ بھی لیا، تو یہ دیکھ کر کہ کاغذ کالے کر رہا ہے، ولی اللہ نہیں سمجھے گا، غرض خلوص جس قدر ہوگا، قیمتی ہوگا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سُنایا کہ انہوں نے سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی تھی، اور ساری زندگی فقیری میں گذاری، آپ کا ایک لوہار پڑوسی تھا، وہ روزانہ لوہا کوٹا کرتا تھا، مرنے کے بعد کسی نے دیکھا کہ لوہار کا مرتبہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ بڑا ہے، اور وہ اونچے مقام پر ہے، اس سے اس کی حقیقت پوچھی، اس نے بتایا کہ میں ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نوافل کو دیکھ کر حسرت کیا کرتا تھا، کہ آہ کاش مجھے بھی فرصت ہوتی، تو میں بھی اسی طرح عبادت کرتا، اور یہ راز میرے اور اللہ کے درمیان تھا، چونکہ یہ حسرت پُر خلوص تھی، جس کو کوئی نہیں جانتا تھا، بس اسی پر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمادیا اور چونکہ ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ کو سب ولی اللہ اور بڑا عبادت گذار سمجھتے اور جانتے تھے۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ سُنایا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ یہ پیسے کہاں خرچ کردوں؟ انہوں نے فرمایا، کہ کسی غریب مسکین کو تلاش کر کے دیدو چنانچہ اس نے ایک فقیر کو جو مری ہوئی چال چل رہا تھا، یہ رقم دیدی، اور دوسرے دن جہاں فقیروں کا اڈہ تھا جا کر دیکھا کہ وہ فقیر دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ کل ایک اچھا آدمی ملا کہ اس نے اچھی خاصی رقم تھمادی، خوب شراب پی، اور مزے لئے، اس شخص نے یہ ماجرا بزرگ سے آکر سنایا، انہوں نے کہا کہ دوبارہ کسی فقیر کو دیکھ کر دیدو اس نے پھر ایک فقیر کو تلاش کر کے رقم دیدی۔ اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس نے بھی اسی طرح عیاشی میں ختم

کر دیئے، پھر وہ بزرگ کے پاس پہنچا، بزرگ نے کہا یہ پیسے لو اور جو شخص سب سے پہلے ملے اس کو یہ رقم دیدینا، اس نے سب سے پہلے جو شخص ملا اس کو رقم دیدی وہ اپنے جسم پر ایک سفید چادر لپیٹے ہوئے تھا، اس شخص نے اس کا بھی پیچھا کیا' اس خیال سے کہ دیکھیں یہ اس رقم کا کیا کرتا ہے، ابھی تھوڑی دُور چلے تھے کہ اس نے ایک مرا ہوا کبوتر اپنی چادر سے نکال کر ایک طرف ڈالا، اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں کئی روز سے فاقہ سے ہوں' اور قریب الموت ہوں، میرے لئے اس کا مجبوری کی وجہ سے کھانا حلال ہو گیا تھا، اس لئے اسے لے جا رہا تھا کہ بُھون کر کھالوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ رقم دلوادی، اب اس سے اپنا پیٹ بھر لوں گا، تو بھئی آدمی کی جیسی نیت ہوتی ہے ویسے ہی اس کا مال خرچ ہوتا ہے۔

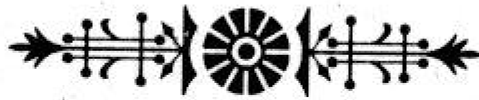
اور فرمایا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنا تمام مال میدان جہاد میں دیدیا حتّٰی خود بھی نکل کھڑا ہوا، اور پھر جان بھی دیدی، بڑی فضیلت کا کام کیا، لیکن ذکر اللہ اس سے بھی افضل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اللہ کرنے والا اپنے گھر میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے اس کو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے، اور جہاد میں مال وقت، اور اپنی جان کی بازی لگانے والے کو بہت بہادر سمجھتے ہیں جس میں ریا کا احتمال ہے، خلوص کم ہونے کی بناء پر اجر کم ہے، آپ لوگ یہاں کسی ذاتی غرض کے واسطے نہیں آتے، مجھے معلوم ہے کہ کہاں کہاں سے مشقت برداشت کر کے آپ لوگ چل کر آئے ہیں یہاں آپ کا جمع ہونا خالصۃً اللہ کیلئے ہوتا ہے، اس کا نفع مجھے تو محسوس ہوتا ہے آپ کو معلوم نہیں محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟

پھر ارشاد فرمایا کہ رات کو دین کی کتابیں پڑھنا ساری رات عبادت کرنے سے افضل ہے اس میں بھی یہی بات ہے کہ عبادت کو پڑھنے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ پڑھنے والے کو کوئی ولی نہیں سمجھے گا، اور نوافل اور تہجد پڑھنے والے کو بڑا عابد اور ولی اللہ سمجھتے ہیں، تو بھئی حاصل یہی ہے کہ خلوص پیدا

کرنے کی فکر کرو، اعمال گنے نہیں جائیں گے، تولے جائیں گے، عبادتیں کثرت سے کی ہوں گی، لیکن خلوص کم ہونے کی بناء پر ان کا وزن معمولی ہوگا، اور بعض امور ایسے ہوں گے، جو دیکھنے میں تھوڑے ہوں گے، لیکن خلوص کی بناء پر بڑے وزنی ہوں گے دنیاوی کام بھی کرو تو اسی ذمہ داری کے ساتھ کرو، انشاء اللہ خلوص کی بناء پر یہ کام بڑے وزنی ہوں گے۔

۸۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۲۶ شعبان ۹۶ھ کو جبکہ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ صاحب مدظلہم بھی دارالعلوم کراچی میں تشریف لائے ہوئے تھے، حضرت موصوف مدظلہٗ کی موجودگی میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا عبدالغفور صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ملفوظ سُنایا کہ الاخلاص، ماالاخلاص، عدم رویۃ الاخلاص فی الاخلاص [1]

اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الملّت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول نقل فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، مکمل مثنوی کا خلاصہ صرف ۲ دو چیزیں ہیں، توحید اور حبّ شیخ، اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا حال اب وہی ہے جو ہمارے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ موت محبوب ہوگئی ہے، لیکن زندگی مبغوض ہوگئی ہے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی)



[1] ترجمہ: اخلاص کیا ہے اخلاص، اخلاص میں اخلاص کو نہ دیکھنا (یعنی محسوس نہ کرنا اخلاص ہے)۔

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہ

مسجد کا پیغام

مملکت سعودیہ عربیہ کے مرحوم فرماں روا خالد بن عبد العزیز مرحوم کے دور میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ''رسالۃ المسجد'' کے نام سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا، زیر نظر بصیرت افروز مضمون حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اُس مقالے کا مترجم خلاصہ ہے جو اس موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ (ادارہ)

یہ بات کسی بھی مسلمان سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ مساجد در حقیقت روئے زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور ان میں نمازیں ادا کی جاتی ہیں لیکن جب ہم قرآن کریم، سنتِ نبویہ، خیر القرون کے تعامل اور سلف صالحین کے طرز عمل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اس دور کی مسجدیں در حقیقت مسلمانوں کے روحانی مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں، ان ہی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا تھا، ان ہی میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں، ان ہی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا ہوتا تھا، ان ہی میں قرآن اور سنت کی تعلیم دی جاتی تھی، ان ہی میں اسلام کی طرف دعوت کا اہتمام ہوتا تھا، ان ہی میں نوخیز نسل کو صحیح اسلامی تربیت دی جاتی تھی، یہیں سے جان و مال سے بے پروا ہو کر کلمۂ حق کہا جاتا تھا، یہیں پر مسلمانوں کے باطنی تزکیہ کا انتظام ہوتا تھا، یہیں ان کے اخلاق سنوارے جاتے تھے، یہیں پر ذہنوں کو دینی خطوط پر استوار کیا جاتا تھا اور یہیں سے دعوت اسلامی کے وہ سپاہی نمودار ہوتے تھے جو صرف زبان اور باتوں سے نہیں بلکہ اپنی ایک ایک نقل و حرکت اور ایک ایک ادا سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

یہ سارے کام مسجد میں اس سرگرمی سے سرانجام دیئے جاتے تھے کہ ہر مسجد اپنے

محلّہ کے لیے ہر بھلائی کا منبع اور ہدایت کا سر چشمہ بن گئی تھی جو مسلمانوں میں خالص دینی روح پھونکتی تھی اور ان میں ایسی دینی غیرت وحمیت بیدار کرتی تھی کہ وہ نہ کبھی کسی بیرونی ترغیب وترہیب کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے اور نہ کسی باطل نظریہ وعمل کو اپنانے کا خیال ان کے دل میں آسکتا تھا خواہ اس باطل نظریہ کا ظاہر کتنا دلکش ہو اور خواہ ساری دنیا اس کی شہرت اور رواج سے کتنی گونج رہی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم مختصر لفظوں میں "مسجد کے پیغام" کو تعبیر کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے:

دعوت الی اللہ، کلمۂ حق کی نشر واشاعت، خالص اسلامی ذہن کی تعمیر، اور ایک ایسی عام دینی اور روحانی فضاء کا قیام جس میں نیکیوں کو خود بخود فروغ ہو اور برائیاں اپنی موت آپ مر جائیں۔

ہوسکتا ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ سارے کام تو آج بھی مسجدوں میں ہو رہے ہیں، یہاں نمازیں بھی پابندی سے ہوتی ہیں، ہر جمعہ کو ان کے ممبروں سے وعظ ونصیحت بھی کی جاتی ہے اور یہاں عموماً بچوں کی تعلیم کے مراکز بھی موجود ہیں اور یہ سارے کام ماضی کی طرح اب بھی مسلسل انجام پا رہے ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل مساجد کے اصحابِ حل وعقد اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے ہیں؟ اس سوال کا جواب کلی طور سے نفی میں ہے اول تو اس لئے کہ جن مساجد میں یہ سارے کام قابل ذکر اہتمام کے ساتھ ہوتے ہوں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جو حضرات اپنی مسجدوں میں ان دینی خدمات کا اہتمام کرتے ہیں عام طور سے وہ یہ سارے کام رسمی طور پر انجام دیتے ہیں جو عموماً اپنی حقیقت اور روح سے خالی ہوتے ہیں یہاں سے عموماً چند بے اثر کلمات سنائی دیتے ہیں جو صرف کانوں تک پہنچتے ہیں دل میں داخل نہیں ہوتے۔

اور اس صورت حال کے دو اسباب ہیں: پہلا سبب یہ ہے کہ جو حضرات آج کل

کی مساجد سے دعوت وتبلیغ یا تعلیم وتدریس کا کام کرتے ہیں ان کی بھاری تعداد، الا ماشاء اللہ یہ کام سچے دینی جذبے سے انجام نہیں دیتی بلکہ بسا اوقات ان حضرات میں دین کے صحیح علم اور ٹھیٹھ اسلامی تربیت کا بھی فقدان ہے۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ مسجدوں کی دعوت اس وقت ٹھیک ٹھیک اثر انداز ہو سکتی ہے جب مسجدوں اور عوام کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اور متواتر رابطہ قائم ہو۔ خیر القرون میں ائمہ کے وعظ ونصیحت کے مؤثر ہونے کا ایک بڑا راز یہ بھی تھا جو آج کلیۃً مفقود ہے۔ آج ہمارے ائمہ مساجد اور محلے کے عوام کے درمیان کوئی ایسا رابطہ باقی نہیں رہا جو دعوت اسلامی کی راہ ہموار کر سکے، جو کچھ رابطہ ہے وہ انتہائی کمزور رابطہ ہے جو دن بھر میں چند منٹ سے زیادہ قائم نہیں رہتا اور یہ چند منٹ کا رابطہ بھی محلے کی اقلیت کے ساتھ قائم کرے اور جب تک یہ صورت حال تبدیل نہ ہو اس وقت تک مساجد کی دعوت مؤثر ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی اور نہ مساجد کے وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو ماضی میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ''مسجد کے پیغام'' کو زندہ کرنے کیلئے مندرجہ ذیل تجویزیں احقر کے ذہن میں ہیں۔

❶ ائمہ مساجد ایسے علماء میں سے منتخب کئے جائیں جنہوں نے اسلامی علوم کو ماہر اساتذہ حاصل کیا ہو یا وہ ایسی دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوں جن کے معیار تعلیم وتربیت پر عام طور سے اعتماد کی جاتا ہے۔

❷ ہر مسجد میں ایک ایسی انجمن ہونی چاہئے جو امامِ مسجد اور محلے کی عوام پر مشتمل ہو۔ یہ انجمن دعوت وتبلیغ کے لیے ایک عملی نظام بنائے۔ اس نظام کے تحت یہ سب لوگ ہر روز یا ہر ہفتے محلے کے عوام کے پاس جا کر ان سے شخصی ملاقاتیں کریں۔ انہیں نمازوں کی پابندی اور مسجدوں میں حاضری کی دعوت دیں۔ نیکیوں کی ترغیب دیں اور برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کریں لیکن یہ سارا کام نرمی، شفقت

اور حکمت وموعظمت حسنہ کے اصول پر ہونا چاہیے۔

نیز اس انجمن کے افراد کو چاہیے کہ وہ محلے کے عوام کی مشکلات ومسائل سے باخبر ہوں اور ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا کام کریں اور سب سے بڑھ کر اس کام کے لیے اس سچی دینی لگن اور حقیقی تڑپ کی ضرورت ہے جو کسی بھی مرحلے پر اکتاہٹ، تھکن اور سستی سے آشنا نہ ہو۔ انبیاء علیہم السلام کی سنت یہی ہے کہ انہوں نے اس کام میں اپنی پوری عمریں خرچ کردیں، نہ کبھی اس سے اکتائے اور نہ مایوس ہوئے، نہ انہوں نے مذاق اڑانے والوں کی پرواہ کی، نہ برا بھلا کہنے والوں کو خاطر میں لائے بلکہ مسلسل اپنے کام میں لگے رہے۔ دراصل یہی وہ دعوت ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور نصیحت کرو کیونکہ نصیحت مؤمنین کو نفع پہنچاتی ہے۔

❸ ہر مسجد میں روزانہ مختصر درس قرآن ہونا چاہیے جس میں عام مسلمان شریک ہوں اس درس میں قرآن کریم کی تعلیمات سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کی جائیں اور اس میں طویل فنی بحثیں یا علمی اختلافات نہ چھیڑے جائیں۔

❹ امام مسجد کو چاہیے کہ وہ ایک دن عورتوں کی تعلیم کے لیے مقرر کرلے خواتین محلے کے کسی گھر میں جمع ہوں اور امام ان کو نصیحت کرے۔ اور انہیں دین کے ضروری احکام سکھائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے حالات اور تاریخ اسلام کے چیدہ چیدہ واقعات سنائے۔

❺ ائمہ مساجد کو تمام مسلمان حکومتوں کی طرف سے مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مواعظ، خطبوں اور درس قرآن وغیرہ میں کسی خوف وخطر کے بغیر دین کی صحیح تعلیمات بیان کریں خواہ وہ کسی فرد یا جماعت کے خلاف پڑتی ہوں۔

❻ ہر مسجد میں ایک مختصر دار المطالعہ ہونا چاہیے جس میں مقامی زبان میں لکھی ہوئی دینی کتابوں کا مستند ذخیرہ موجود ہو اور عام مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اگر ہم ان تجاویز پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو امید یہ ہے کہ انشاء اللہ مساجد میں وہ فوائد دوبارہ حاصل ہوسکیں گے جو ماضی میں حاصل ہوئے ہیں لیکن ان سے محروم ہیں۔

آخر میں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے بعض حلقے بسا اوقات پورے اخلاص سے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ مسجدوں کو مختلف اجتماعی اور معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز بنا دینا چاہئے۔ مثلاً تجویز یہ کہ مسجدوں میں ہسپتال ہو، شادی گھر ہو، ان میں بعض کھیلوں کا انتظام ہو، یا ان میں کچھ میونسپل ادارے قائم کیے جائیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ تجویز خواہ کتنے اخلاص اور خیر طبی کے جذبے سے پیش کی گئی ہو۔ اسلام کے مزاج و مذاق اور مساجد کی حرمت سے کسی طرح میل کھانے والی نہیں ہے بلکہ مساجد کے اصل مقصد تعمیر کو مجروح کرنے کا باعث ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کی دنیا بھی دین ہوتی ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسلام رہبانیت کا دین نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام صرف عبادات ہی نہیں سکھاتا بلکہ اس میں معاملات کی بھی تعلیم و تلقین ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک موضوع کو دوسرے موضوع میں خلط ملط کر دیا جائے۔ باہم تقسیم کار کے اصول کا انکار کر بیٹھیں یا ہم ایک چیز کے وظائف و فرائض کو کسی دوسری چیز کے سر ڈال دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مساجد کا موضوع اور ان کا مقصد تعمیر وہی ہے جو ہم نے شروع میں بیان کیا اور مسجدیں کسی دوسرے کام کے لیے وضع نہیں ہوئیں خواہ وہ عمل فی نفسہ مباح یا مستحسن ہو۔ مشہور و معروف حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں کسی گمشدہ چیز کی تلاش کا اعلان کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ایسے شخص سے کہہ دو:

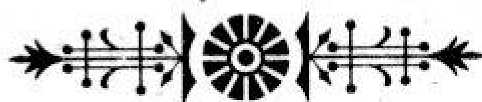
لا ردّها الله عليك فان المساجد لم تبن لهذا

"اللہ یہ چیز تمہیں واپس نہ کرے اس لیے کہ مسجدیں اس کام کے لیے وضع نہیں ہوئیں"۔

ظاہر ہے کہ اپنی کسی گمشدہ چیز کو تلاش کرنا کوئی حرام یا مکروہ نہیں مباح کام ہے بلکہ بسا اوقات مستحب ہے۔ لیکن ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ مسجدیں اس کام کے لیے نہیں بنائی گئیں۔ بعض حضرات ان واقعات سے استدلال کرتے ہیں کہ بعض اوقات مسجدوں میں مریضوں کا علاج بھی کیا گیا ہے وہاں سے لشکر بھی تیار کر کے بھیجے گئے ہیں۔ وہاں مقدمات کے فیصلے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سارے کام مسجدوں میں جب بھی کیے گئے وقتی اور ہنگامی ضرورت کے لیے کیے گئے۔ ان کو عام معمول بنانے کے لیے نہیں، جو مسجد کو مستقل طور سے ہسپتال یا عدالت بنانے کی گنجائش پیدا کر سکے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ وقتی ضرورت کے تحت حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ کر گرفتار بھی رکھا گیا ہے۔

دراصل یہ سارے کام وقتی اور ہنگامی ضروریات کے تحت انجام دیئے گئے ہیں اور آج بھی ایسی ہنگامی صورت حال میں مسجدوں سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کاموں کو مساجد کے مستقل وظائف و مقاصد میں شامل کر لینا مغالطہ انگیز خلطِ مبحث ہے اور دین و شریعت کے لحاظ سے کسی طرح درست نہیں۔

واٰخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

نظامِ مساجد اور دعوتِ اسلامی

ذیل میں ہم اس عربی مقالے کی مترجم تلخیص پیش کررہے ہیں جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس ''رسالۃ المسجد'' میں پیش کیا تھا۔ **﴿مرتب﴾ ادارہ**

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی
خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

امّا بعد!

سب سے پہلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکرادا کرتا ہوں جس نے ہمیں ایسے مقدّس خطّے میں جمع ہونے کی توفیق بخشی جو پوری دنیا کے لئے انوارِ ہدایت ومعرفت کا سرچشمہ ہے۔اور ہمیں یہاں اس مبارک مہینے میں جمع فرمایا جس میں قرآن کریم نازل ہوا اور جس میں انسانیت کو علم وہدایت کی روشنی عطا ہوئی۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس نعمت کا ہم جتنا شکرادا کریں کم ہے۔جلالۃ الملک خالد بن عبدالعزیز خادم حرمین شریفین اور رابطۂ عالمِ اسلامی کا ادارہ قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے ایسے مقدّس مقام اور ایسے مبارک ایاّم کا انتخاب کیا اور اس غرض کے لئے مشرق ومغرب کے ممتاز مسلمانوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے کا موقع فراہم فرمایا۔

ہم پر واجب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس نعمت کا شکرادا کریں اور اس موقعہ پر

شکر کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنی نیتوں اور ارادوں کا محاسبہ کر کے یہ دیکھیں کہ ان میں کس قدر اخلاص ہے؟ اس عظیم اجتماع سے ہمارا مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہ ہونا چاہیئے۔ پھر ہمارا فریضہ ہے کہ جس موضوع پر غور وفکر کے لئے ہم جمع ہوئے ہیں اس پر غور وفکر کا حق ادا کریں، اور اس کے لئے ایسا طریق کار تشکیل دیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کا باعث ہو، اور جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں خیر وصلاح کا دور دورہ ہو سکے۔

اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ موجودہ دور میں ہم مسلمانوں پر شدید قسم کی غفلت اور بے عملی مسلّط ہوگئی ہے، اور اس بے عملی کا تعلق کسی خاص شعبۂ حیات سے نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہم اپنے فرائض سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں ہم میں دین ودیانت کا داعیہ کمزور ہو چکا ہے، اسلام کا پرچم سر بلند کرنے کے لئے ہماری ہمتیں پست ہوگئی ہیں، ہمارے دلوں میں اللہ کی اطاعت وبندگی کے انوار مدّھم ہوگئے ہیں اور ہم تبلیغِ اسلام کا وہ جذبۂ بیتاب کھو چکے ہیں جس نے روئے زمین کے ہر گوشے پر اسلام کا جھنڈا لہرا کر چھوڑا تھا۔

اسی عمومی دینی انحطاط کا ایک چھوٹا سا شعبہ یہ بھی ہے کہ ہم نے مساجد کا حق ادا کرنے اور اس کے پیغام کی نشر واشاعت میں اس حد تک غفلت سے کام لیا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں ہم پر رسولِ کریم ﷺ کا یہ ارشاد صادق نہ آ رہا ہو کہ:۔

مساجدھم عامرۃ وھی خراب

ان کی مسجدیں (ظاہری طور پر) آباد ہوں گی، لیکن در حقیقت ویران

لہٰذا یہ کانفرنس، اگر واقعۃً یہ عزم لیکر بیٹھی ہے کہ مسجد کے حقیقی پیغام کو زندہ کرنے کی کوشش کرے گی، مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلے میں مسجد کے کردار کو دوبارہ فعّال اور مؤثر بنائے گی اور اس کے ذریعے تقویٰ، تعلق باللہ، صفائی قلب اور پاکیزگی روح کی بنیاد پر مسلم معاشرے کی تعمیر نو کرے گی تو یہ کانفرنس بلاشبہ قابل صد مبارک

باد ہے۔ لیکن اس غرض کے لئے ہمیں پہلے یہ طے کرلینا چاہئیے کہ مسجد کیا چیز ہے؟ اس کا پیغام کیا ہے؟ اور اس پیغام کا حق کیونکر ادا ہوسکتا ہے؟

یہ بات کسی بھی مسلمان سے مخفی نہیں ہوسکتی کہ مساجد درحقیقت روئے زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور ان میں نمازیں ادا کی جاتی ہیں' لیکن جب ہم قرآنِ کریم' سنّتِ نبویہ، خیر القرون کے تعامل اور سلفِ صالحین کے طرز عمل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اس دور کی مسجدیں درحقیقت مسلمانوں کے روحانی مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں، انہی مسجدوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر ہوتا تھا' انہی میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں، انہی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا ہوتا تھا' انہی میں قرآن وسنّت کی تعلیم دی جاتی تھی' انہی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا ہوتا تھا' انہی میں قرآن وسنّت کی تعلیم دی جاتی تھی' انہی میں اسلام کی طرف دعوت کا اہتمام ہوتا تھا' انہی میں نوخیز نسل کو صحیح اسلامی تربیت دی جاتی تھی، یہیں سے جان ومال سے بے پروا ہوکر کلمۂ حق کہا جاتا تھا' یہیں پر مسلمانوں کے باطنی تزکیہ کا انتظام ہوتا تھا' یہیں ان کے اخلاق سنوارے جاتے تھے' یہیں پر ذہنوں کو دینی خطوط پر استوار کیا جاتا تھا' اور یہیں سے دعوتِ اسلامی کے وہ سپاہی نمودار ہوتے تھے جو صرف زبان اور باتوں سے نہیں' بلکہ اپنی ایک ایک نقل وحرکت اور ایک ایک ادا سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

یہ سارے کام مسجد میں اس سرگرمی سے انجام دئے جاتے تھے کہ ہر مسجد اپنے محلّہ کے لئے ہر بھلائی کا منبع اور ہر ہدایت کا سرچشمہ بن گئی تھی جو مسلمانوں میں خالص دینی روح پھونکتی تھی اور ان میں ایسی دینی غیرت وحمیّت پیدا کردیتی تھی کہ وہ نہ کبھی کسی بیرونی ترغیب وترہیب کے آگے سر جُھکانے کے لئے تیار تھے' اور نہ کسی باطل نظریہ وعمل کو اپنانے کا خیال ان کے دل میں آسکتا تھا' خواہ اس باطل نظریہ وعمل کا ظاہری روکار کتنا دلکش ہو۔ اور خواہ ساری دنیا اس کی شہرت اور رواج سے کتنی گونج رہی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم مختصر لفظوں میں ''مسجد کے پیغام'' کو تعبیر کرنا چاہیں تو وہ ہے: دعوت الی اللہ، کلمۂ حق کی نشر واشاعت، خالص اسلامی ذہنیت کی تعمیر اور ایک ایسی عام دینی اور روحانی فضا کا قیام جس میں نیکیوں کو خود بخود فروغ ہو اور برائیاں اپنی موت آپ مرجائیں۔

ہوسکتا ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ سارے کام تو آج بھی مسجدوں میں ہورہے ہیں یہاں نمازیں بھی پابندی سے ہوتی ہیں۔ ہر جمعہ کو ان کے منبروں سے وعظ ونصیحت کی جاتی ہے، اور یہاں عموماً بچوں کی تعلیم کے مراکز بھی موجود ہیں اور یہ سارے کام ماضی کی طرح اب بھی مسلسل انجام پارہے ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آجکل مساجد کے اصحابِ حل وعقد اپنی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے ہیں؟

اس سوال کا جواب کلّی طور سے نفی میں ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ جن مساجد میں یہ سارے کام قابل ذکر اہتمام کے ساتھ ہوتے ہوں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جو حضرات اپنی مسجدوں میں ان دینی خدمات کا اہتمام کرتے ہیں، عام طور سے وہ یہ سارے کام رسمی طور پر انجام دیتے ہیں جو عموماً اپنی حقیقت اور روح سے خالی ہوتے ہیں۔ یہاں سے عموماً چند بے اثر کلمات سُنائی دیتے ہیں جو صرف کانوں تک پہنچتے ہیں، دل میں داخل نہیں ہوتے۔ اور اس صورت حال کے دو اسباب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ جو حضرات آجکل کی مساجد سے دعوت وتبلیغ یا تعلیم وتدریس کا کام کرتے ہیں ان کی بھاری تعداد الّا ماشاء اللہ یہ کام سچّے دینی جذبے سے انجام نہیں دیتی، بلکہ بسا اوقات ان حضرات میں دین کے صحیح علم اور ٹھیٹھ اسلامی تربیت کا بھی فقدان ہوتا ہے۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ مسجدوں کی دعوت اس وقت ٹھیک اثر انداز ہوسکتی

ہے جب مسجدوں اور عوام کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اور متواتر رابطہ قائم ہو، خیر القرون میں ائمہ کے وعظ و نصیحت کے مؤثر ہونے کا ایک بہت بڑا راز یہ بھی تھا جو آج کلیۃً مفقود ہے۔ آج ہمارے ائمۂ مساجد اور محلّے کے عوام کے درمیان کوئی ایسا رابطہ باقی نہیں رہا جو دعوتِ اسلامی کی راہ ہموار کر سکے، جو کچھ رابطہ ہے وہ انتہائی کمزور رابطہ ہے جو دن بھر میں چند منٹ سے زیادہ قائم نہیں رہتا' اور یہ چند منٹ کا رابطہ بھی محلے کی اقلّیت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ رہی محلّے کی اکثر آبادی، سو وہ اپنے امام کی صورت بھی نہیں پہچانتی، چہ جائیکہ اس کے ساتھ کوئی تعلّق قائم کرے۔ اور جب تک یہ صورت حال تبدیل نہ ہو اس وقت تک مساجد کی دعوت کے مؤثر ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی، اور نہ مساجد کے وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو ماضی میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ''مسجد کے پیغام'' کو زندہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجویزیں احقر کے ذہن میں ہیں:۔

❶ ائمہ مساجد ایسے علماء میں سے منتخب کئے جائیں جنہوں نے اسلامی علوم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کیا ہو یا وہ ایسی دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوں جن کے معیارِ تعلیم و تربیت پر عام طور سے اعتماد کیا جاتا ہے۔

❷ ہر مسجد میں ایک ایسی انجمن ہونی چاہئے جو امامِ مسجد اور محلّے کے عوام پر مشتمل ہو۔ یہ انجمن دعوت و تبلیغ کے لئے ایک عملی نظام بنائے۔ اس نظام کے تحت یہ سب لوگ ہر روز یا ہر ہفتے محلّے کے عوام کے پاس جا کر ان سے شخصی ملاقاتیں کریں' انہیں نمازوں کی پابندی اور مسجدوں کی حاضری کی دعوت دیں' نیکیوں کی ترغیب دیں۔ اور برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کریں' لیکن یہ سارا کام نرمی' محبت و شفقت اور حکمت و موعظۂ حسنہ کے اصول پر ہونا چاہئے۔ نیز اس انجمن کے افراد کو چاہیئے کہ وہ محلّے کے عوام کی مشکلات و مسائل سے باخبر ہوں' اور ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے

اپنا کام کریں۔ اور سب سے بڑھ کر اس کام کے لئے اس سچّی دینی لگن اور حقیقی تڑپ کی ضرورت ہے جو کسی بھی مرحلہ پر اکتاہٹ، تھکن اور سُستی سے آشنا نہ ہو، انبیاء علیہم السلام کی سنّت یہی ہے کہ انہوں نے اس کام میں اپنی پوری پوری عمریں خرچ کر دیں۔

نہ کبھی اس سے اکتائے اور نہ مایوس ہوئے، نہ انھوں نے مذاق اُڑانے والوں کی پروا کی، نہ بُرا بھلا کہنے والوں کو خاطر میں لائے، بلکہ مسلسل اپنے کام میں لگے رہے، دراصل یہی وہ دعوت ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

"وذكّر فانّ الذكرىٰ تنفع المؤمنين"

اور نصیحت کرو، کیونکہ نصیحت مؤمنین کو نفع پہنچاتی ہے

❸ ہر مسجد میں روزانہ مختصر درسِ قرآن ہونا چاہیئے جس میں عام مسلمان شریک ہوں۔ اس درس میں قرآن کریم کی تعلیمات سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کی جائیں، اور اس میں طویل فنی بحثیں یا علمی اختلافات نہ چھیڑے جائیں۔

❹ امام مسجد کو چاہیئے کہ وہ ایک دن عورتوں کی تعلیم کے لئے مقرر کرلے۔ خواتین محلّے کے کسی گھر میں جمع ہوں اور امام ان کو نصیحت کرے، انھیں دین کے ضروری احکام سکھائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کے حالات اور تاریخِ اسلام کے چیدہ واقعات سُنائے۔

❺ ائمہ مساجد کو تمام مسلمان حکومتوں کی طرف سے مکمل آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے مواعظ، خطبوں اور درس قرآن وغیرہ میں کسی خوف وخطر کے بغیر دین کی صحیح تعلیمات بیان کریں۔ خواہ وہ کسی فرد یا جماعت کے خلاف پڑتی ہوں۔

❻ ہر مسجد میں ایک مختصر دار المطالعہ ہونا چاہیئے جس میں مقامی زبان میں لکھی ہوئی دینی کتابوں کا مستند ذخیرہ موجود ہو، اور عام مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اگر ہم ان تجاویز پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو امید یہ ہے کہ

انشاء اللہ مساجد کے وہ فوائد دوبارہ حاصل ہوسکیں گے جو ماضی میں حاصل ہوئے ہیں، لیکن ہم ان سے محروم ہیں۔

آخر میں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے بعض حلقے بسا اوقات پورے اخلاص سے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ مسجدوں کو مختلف اجتماعی اور معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز بنا دینا چاہیئے، مثلاً تجویز یہ ہے کہ مسجدوں میں ہسپتال ہو، شادی گھر ہو ان میں بعض کھیلوں کا انتظام ہو یا ان میں کچھ میونسپل ادارے قائم کئے جائیں۔

لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ تجویز خواہ کتنے اخلاص اور خیر طلبی کے جذبے سے پیش کی گئی ہو، اسلام کے مزاج و مذاق اور مساجد کی حرمت سے کسی طرح میل کھانے والی نہیں ہے، بلکہ مساجد کے اصل مقصدِ تعمیر کو مجروح کرنے کا باعث ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کی دنیا بھی دین ہوتی ہے، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسلام رہبانیت کا دین نہیں، یہ بھی سچ ہے کہ اسلام صرف عبادات ہی نہیں سکھاتا، بلکہ اس میں معاملات کی بھی تعلیم و تلقین ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایک موضوع کو دوسرے موضوع میں خلط ملط کر دیا جائے، باہم تقسیم کار کے اصول کا انکار کر بیٹھیں، یا ہم ایک چیز کے وظائف و فرائض کو کسی دوسری چیز کے سر ڈال دیں۔

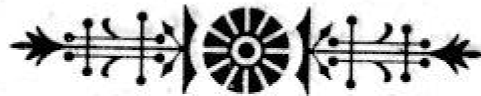
واقعہ یہ ہے کہ مساجد کا موضوع اور ان کا مقصد تعمیر وہی ہے جو ہم نے شروع میں بیان کیا، اور مسجدیں کسی دوسرے کام کے لئے وضع نہیں ہوئیں، خواہ وہ عمل فی نفسہ مباح یا مستحسن ہوں۔ مشہور و معروف حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں کسی گمشدہ چیز کی تلاش کا اعلان کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ایسے شخص سے کہدو:۔

" لا ردّھا اللّٰہ علیك، فانّ المساجد لم تُبن لھٰذا"

اللہ یہ چیز تمہیں واپس نہ کرے، اس لئے کہ مسجدیں اس کام کے لئے وضع نہیں ہوئیں ظاہر ہے کہ اپنی کسی گمشدہ چیز کو تلاش کرنا کوئی حرام یا مکروہ نہیں، مباح کام ہے، بلکہ بسا اوقات مستحب ہے، لیکن ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں۔

بعض حضرات ان واقعات سے استدلال کرتے ہیں کہ بعض اوقات مسجدوں میں مریضوں کا علاج بھی کیا گیا ہے، وہاں سے لشکر بھی تیار کر کے بھیجے گئے ہیں، وہاں مقدمات کے فیصلے بھی ہوئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ سارے کام مسجدوں میں جب بھی کئے گئے وقتی اور ہنگامی ضرورت کے لئے کئے گئے، ان کو عام معمول بنانے کے لئے نہیں جو مسجد کو مستقل طور سے ہسپتال یا عدالت بنانے کی گنجائش پیدا کر سکے، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ وقتی ضرورت کے تحت حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھکر گرفتار بھی رکھا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب کون نکال سکتا ہے کہ آئندہ مسجدوں کو مستقل جیل یا قید خانہ بنا دینا چاہیئے۔ دراصل یہ سارے کام وقتی اور ہنگامی ضروریات کے تحت انجام دیئے گئے ہیں، اور آج بھی ایسی ہنگامی صورتِ حال میں مسجدوں سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کاموں کو مساجد کے مستقل وظائف و مقاصد میں شامل کر لینا مغالطہ انگیز خلطِ مبحث ہے اور دین و شریعت کے لحاظ سے کسی طرح درست نہیں۔

و آخر دعونا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی دسمبر ۱۹۷۵ء)



مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

طالب علم کا نصابِ زندگی

قرآن کریم کی ایک آیت ہے ﴿فلو لانفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين﴾ یہ آیت تو مختصر سی ہے لیکن درحقیقت یہ اہل علم کا پورا نصاب تعلیم ہے۔ صرف نصاب تعلیم ہی نہیں بلکہ نصاب زندگی ہے۔ طالب علم کو، اہل علم کو کیا کرنا ہے؟ ليتفقهوا في الدين تک یہ بات بتائی گئی کہ جو طائفہ علم دین حاصل کرنے کے نام پر جمع ہوا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے۔ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی تفسیر بار بار کرتا آیا ہوں کہ محض تعلیم حاصل کرنا مقصود نہیں، دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے اور سمجھ بوجھ اس کو کہا جائے گا جب کہ علم کے ساتھ عمل بھی ہو۔

جہل کی حقیقت: جس علم کے ساتھ عمل نہ ہو وہ سمجھ بوجھ نہیں کہلاتا۔ ایسا علم تو شیطان کو بھی ہے۔ ابوجہل اور ابولہب کو بھی تھا ﴿وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلماً وعلواً﴾ ۔ قرآن کا اعلان ہے کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر جحود (انکار) کیا تھا، ابولہب، ابوجہل یہ سب حضور سرور عالم ﷺ کی نبوت سے رسالت سے، آپ ﷺ کی شان سے واقف تھے، ناواقف نہیں تھے، جانتے بوجھتے یہ (تکذیب) کرتے تھے۔

ابوجہل کا تو مشہور قصہ ہے کہ بہت سی چیزوں میں اس کا اعتراف پایا گیا، مگر جب اس کو کہا گیا کہ کمبخت تو جانتا اور مانتا ہے اور قرآن کی عظمت کو بھی پہچانتا ہے،

تجھ کو رسول کریم ﷺ (کی صداقت) کا قوی اعتراف ہے تو پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس نے کہا کہ بات ساری یہ ہے کہ قبیلوں کی جنگ جیسے ہوتی ہے اسی طرح بنو ہاشم کا اور ہمارا مقابلہ ہے۔ سب کاموں میں تو یہ ہوتا ہے کہ بنو ہاشم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کام کیا تو وہ ہم بھی کرتے ہیں۔ جتنے کام اچھے سمجھے جاتے ہیں، دنیا میں سخاوت کے، شجاعت کے، بہادری کے، جو عرب میں مشہور تھے۔ نیک کام، ان سب نیک کاموں میں جو کام بنی ہاشم کہتے ہیں کہ ہم کرتے ہیں تو ہم بھی ان کا جواب دے دیتے ہیں۔ لیکن اب انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہمارے میں ایک رسول آیا ہے اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟ اس واسطے ہم انہیں رسول نہیں مانتے، نہ ماننے کا سبب یہ ہے کہ بنی ہاشم کی برتری ہمارے اوپر ثابت ہو جائے گی اور ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ تو بہر حال کہنا میرا یہ ہے کہ جیسے ابلیس حضور ﷺ کو بھی جانتا ہے اور اللہ کی توحید کو بھی، لیکن ان تمام چیزوں کو جاننے کے باوجود جحود کرتا ہے۔ قریب قریب یہ حال تھا ابولہب اور ابوجہل کا اور دوسرے ان کافروں کا جو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ رہے ہیں جنہوں نے آپ کو پرکھا ہے، دیکھا ہے۔ آنکھوں سے مشاہدات کئے ہیں سب کو یقین تھا آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا، اس کے باوجود اپنے اغراض دنیوی اور خواہشات کی بنا پر جحود کیا کرتے تھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تفقہ فی الدین اس کا نام نہیں کہ کسی چیز کو جان لے، یا کسی مسئلہ کو جان لے کہ یہ چیز حلال ہے یا حرام ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز ہے، مکروہ ہے یا مستحب ہے۔ اتنا جان لینے کا نام علم نہیں ہے۔ اتنا جان لینے کے بعد فقہ نہیں ہے۔ فقہ دین کی سمجھ بوجھ کا نام ہے، جس کے پیچھے عمل ہونا چاہیے۔ جس کے علم کے ساتھ عمل نہ آیا، جس علم پر عمل مرتب نہ ہوا وہ علم کہلانے کا مستحق نہیں۔ حدیث کے الفاظ میں اس کو جہل کہا گیا ہے "ان من العلم لجھلا"، یعنی بعض علم جہل ہوتے ہیں۔ یہ علم کہ جس کے پیچھے عمل نہ ہو وہ علم جہل ہوتے ہیں۔ یہ علم کہ جس کے پیچھے

عمل نہ ہو وہ علم شریعت کی اصطلاح میں، حدیث کی اصطلاح میں علم کہلانے کا مستحق نہیں، وہ جہل ہے۔ علم کا مقصود اور ہماری کیفیت تفقہ فی الدین کا لفظ قرآن میں اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ علم کے ساتھ اور اس کے پیچھے پیچھے عمل آئے اور آپ کو یہ محسوس ہو کہ اگر ہم نے ہدایہ پڑھی، قدوری پڑھی، کنز پڑھی، ان معاملات کا باب پڑھا کہ فلاں معاملہ جائز ہے، فلاں ناجائز ہے۔ یہ حرام ہے، یہ مکروہ ہے، یہ مستحب ہے۔ اگر ہم بازار میں جا کر وہ اپنے اسباق یاد نہیں کرتے تو ہمارا پڑھا لکھا بیکار ہے۔ اب تو ہمارا حال یہ ہے کہ کتاب مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے، آگے مدرسہ سے باہر اس کتاب کا کوئی اثر ہمارے وجود میں نہیں ہوتا۔ معاملات کرنے کے لیے چلیں تو ہمیں کچھ فکر نہیں ہوتی کہ ہم سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو جی چاہتا ہے کہہ دیتے ہیں، تجارت کرنا ہو، بیچنا ہو یا خریدنا ہو جو جی میں آیا کہہ دیا اور کچھ فکر نہیں کرتے کہ ہم یہ غلط کر رہے ہیں یا صحیح کر رہے ہیں۔

غرض یہ کہ جس علم کے ساتھ معاملات اگر پڑھیں تو آپ کے معاملات کی درستگی ہونی چاہیے۔ محاسبہ کرو اپنے معاملات کا، آداب اور اخلاق پڑھیں، قرآن و حدیث سارا بھرا ہوا ہے ان آداب واخلاق سے، عادات اور معاشرت سے، سارے قرآن وحدیث میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، جو کچھ بھی پڑھا ہے اس کا اثر آپ کے اعمال پر ہونا چاہیئے۔ اپنے دل پر ہونا چاہیے۔ وہ آدمی پہچانا جانا چاہیئے اس چیز سے کہ یہ علم دین پڑھتا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو، اس کے عمل سے معلوم ہو۔ پہلے تو عام مسلمانوں کا یہ رنگ تھا کہ محض ان کو دیکھ کر لوگ ان کو پہچانا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہیں ''الذین اذارؤو اذکر اللہ'' جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کرنے کا کام تفقہ فی الدین ہے۔ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے، یہ ساری کائنات کا حاصل ہے۔ آٹھ برس جو آپ مدرسے میں رہ کر کچھ سیکھیں گے، پڑھیں گے ان سب کا حاصل یہی دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے

اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل ہو۔ آپ کے اعمال پر، آپ کی چال ڈھال پر اور آپ کی حرکت وسکون پر اپنے علم کا اثر ہو۔ یہ ہے تفقہ فی الدین ۔ یہاں تک کی بحث پہلے مفصل آچکی ہے۔ اس کا تھوڑا سا خلاصہ اعادہ کیا گیا۔

تدبر فی القرآن کی اہمیت: آگے اس کے بعد دوسرا نمبر یہ بتایا گیا کہ علم دین پڑھنے کے بعد کیا کرنا ہے؟ قرآن کریم کے الفاظ کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا غور وفکر کرنا، اہل علم نے چھوڑ دیا ہے۔ عوام تو بے چارے کیا کریں؟ الفاظ قرآن کو دیکھتے ہی نہیں، بلکہ قرآن کیا چاہتا ہے۔ اگر غور کریں تو قرآن کے ایک ایک لفظ میں عجیب عجیب ہدایتیں ہیں۔ ابھی جیسے میں نے کہا کہ قرآن نے **لیتعلموا الدین** نہیں کہا "**لیتفقھوا فی الدین**" کہا ہے۔ یہ الفاظ بدل دیں۔ اتنے سے الفاظ بدلنے سے معانی میں ایک بڑا انقلاب آجائے گا۔ یہاں تک تو تفسیر یہ بتلائی کہ طالب علمی کے زمانہ میں جو آپ چل کر آئے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے، اس کا حاصل **تفقہ فی الدین** ہے اور اسے آپ کو حاصل کرنا ہے جس قیمت پر بھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا جیسے میں نے پہلے کہا تھا کہ جب تک پورا کا پورا اپنا وجود اور اپنی توانائی اس علم کے پیچھے نہیں خرچ کرو گے تفقہ فی الدین نہیں آئے گا۔

دینی طلبا کی کوتاہ نظری: آگے فرمایا جاتا ہے کہ تفقہ فی الدین حاصل ہو گیا۔ آپ مدرسے سے پڑھ کر فارغ ہو گئے اور فرض کرو جیسا ہونا چاہئے ویسے ہو گئے۔ دین کی سمجھ بوجھ بھی حاصل ہو گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل بھی دے دیا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ آپ کے پیش نظر کیا ہو گا؟ آج کل کی دنیا میں کالج اور یونی ورسٹی اور اسکولوں کے طالب علم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ڈگری ملے گی، سرکاری دفتروں میں، آپ کے یہاں تو یہ قصہ نہیں، آپ کی مسند پر تو کوئی نوکری نہیں۔ لیکن بدقسمتی

سے کھویا خوش قسمتی سے، کچھ نوکریاں یہاں بھی ملنے لگیں۔ ہماری مسند پر اور ہمارے اس فارغ ہونے پر کہیں مدرسہ کی مدرسی اور کہیں کسی مسجد کی امامت و خطابت وغیرہ۔

علما کا منصبِ جلیلہ: قرآن سے پوچھیئے، قرآن کیا چاہتا ہے؟ آپ کو کیا کرنا چاہیئے؟ آپ کی اور ہر ایک کی نظر اس پر جاتی ہے کہ پڑھنے کے بعد ہمیں کہیں ملازمت کرنی ہے۔ معاش کی فکر اپنی جگہ ہے وہ بھی شریعت کے احکام کے تابع ہے، وہ کوئی گناہ نہیں، عیب نہیں "**کسب المعاش فریضة بعد الفريضة**" حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسب معاش بھی فریضہ ہے دوسرے فرائض کے بعد، لیکن علم پڑھنے کے نتیجے میں کسب معاش اس پر مرتب کرنا یہ قرآن کے الفاظ کو دیکھو معلوم ہوگا کہ اس سے یہاں کوئی تعلق ہی نہیں، علم پڑھنے کے بعد آپ کی معاش کیا ہوگی؟ قرآن اس کی طرف بھی اشارہ نہیں کرتا، علم پڑھنے کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے؟

﴿**ولینذر واقومهم اذار جعوا الیهم**﴾ تو دو طبقے ہو گئے، اوپر کی آیت میں دو طبقہ کر دیئے گئے تھے۔ ایک طبقہ وہ جو جہاد میں جاتا ہے، اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے۔ جانیں اپنی قربان کرتا ہے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیئے، یہ ایک طبقہ ہے۔ رہ گیا دوسرا طبقہ جو علم دین حاصل کرے۔ تو اس طبقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ جس نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں رہ کر علم دین اور تفقہ فی الدین حاصل کیا ہے۔ ﴿**ولینذروا قومهم اذار جعوا الیهم**﴾ یعنی جب وہ لوگ واپس آئیں جو جہاد میں گئے ہوئے ہیں ان کو انذار کرو۔ ﴿**لعلهم یحذرون**﴾ اگر تم ان کو انذار کرو گے، ان میں حذر (ڈر) پیدا ہوگا۔ آخرت کی فکر پیدا ہو جائے گی۔

عزیزو! قرآن کے الفاظ میں تو غور کرو۔ بہر حال قرآن کریم اور حضور ﷺ کی تعلیمات کسب معاش کے منافی تو نہیں؟ اور کسب معاش کو حرام قرار نہیں دیتے، بلکہ فریضۃ بعد الفریضۃ کہتے ہیں، لیکن تعلیم دین پر مرتب نہیں کرتے۔ تعلیم دین کے

بعد تمہاری نوکری کیا ہوگی؟ کیا کہیں مدرسہ میں مدرس بنو گے؟ یا مسجد کے امام و خطیب بنو گے؟ قرآن نے نہ یہاں امامت کا ذکر کیا اور نہ کسی مدرسی کا۔ قرآن نے ذکر یہ کیا ﴿ولینذر واقومھم﴾ انذار کرو اپنی قوم کو، وہ قوم کہ جو دوسرے کام میں لگی ہوئی تھی اور اسے علم دین سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کو انذار کرو۔ تمہیں جو کچھ علم دین حاصل ہوا ہے امانت ہے وہ ان تک پہنچاؤ۔ یہ کام کرنا ﴿لعلھم یحذرون﴾

غرض کہ عمر بھر کی خدمت اور عمر بھر کی ڈیوٹی اور ذمہ داری تمہارے عالم ہونے کی صرف اتنی ہے کہ جو کچھ امانت علم دین کی تمہیں حاصل ہوئی ہے، یہ ان لوگوں کو پہنچا دو جنہیں علم دین حاصل نہیں۔

انذار و تبلیغ کی عمومیت: اور اس جگہ قرآن نے ﴿لینذر واقومھم﴾ کہا ہے۔ مقصد کے اعتبار سے غور کرو۔ تو یہ مفہوم عام ہو جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ علم دین حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اس واسطے کہ ان کو جہاد کرنا تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں گے جو اور دوسرے جائز چیزوں کی وجہ سے قاصر رہ گئے جیسے تجارت پیشہ لوگ ہیں، زراعت پیشہ لوگ ہیں، کاشت کاری اور مزدوری کرنے والے لوگ ہیں یہ لوگ کوئی دین کا فریضہ تو ادا نہیں کر رہے۔ ظاہر ہے کہ جیسے جہاد کرنا فرض ہے اس طرح مزدوری کرنا یا تجارت کرنا دین کے فرائض میں سے تو نہیں ہے۔ اپنی دنیاوی ضروریات اور جائز ضرورت حلال ضرورت کے مطابق لگ کر تجارت میں لگ گئے۔ مزدوری میں لگ گئے، صنعت میں لگ گئے یا کسی اور کام میں لگ گئے اور اس واسطے ان کو علم دین حاصل کرنے کی فرصت نہ مل سکی تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ ان کو پہنچاؤ۔ جن لوگوں نے علم دین پڑھا ہے، تفقہ فی الدین حاصل کیا ہے ان کی ذمہ داری لگا دی کہ ان لوگوں کو علم دین پہنچاؤ جنہیں کسی جائز وجہ سے علم دین حاصل نہیں ہو سکا۔ خواہ جہاد وجہ ہو یا اور دوسری وجوہ ہوں، جن کو شریعت میں جائز قرار دیا ہے۔

تبلیغ و تعلیم کا فرق: پہنچانا کیا ہے؟ پہنچانے کی دو قسمیں ہیں۔قرآن نے اس جگہ اس کی تفصیل نہیں کی۔ جو امانت علم دین کی آپ نے حاصل کی ہے وہ دوسروں تک پہنچانے کی دو قسمیں ہیں۔ایک تعلیم، دوسری تبلیغ۔ تعلیم و تبلیغ میں فرق سمجھتے ہو یا نہیں؟ تبلیغ کے معنی ایک کلمہ کو پہنچا دینے کے ہیں۔ایک بے علم کو واقف کر دینا، ایک شخص کو علم نہیں ہے مسلہ کا اس کو مسلہ بتا دینا، یہ تبلیغ ہوگئی۔ ایک شخص کو ایمان کی حقیقت معلوم نہیں، اس کو بتا دیا کہ اللہ ایک ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا حرام ہے، تبلیغ ہوگئی۔

تعلیم کہتے ہیں دین کو تھوڑا تھوڑا ترتیب کے ساتھ پورا بتانا۔تبلیغ میں یہ تو کہہ دیا کہ نماز پڑھا کرو۔اب جا کر تم نماز پڑھو۔ تعلیم میں اسے تمام آداب وقواعد سکھانے پڑیں گے۔ تعلیم کا لفظ عربی لغت کے اعتبار سے بھی آتا ہے۔تھوڑا تھوڑا آہستہ آہستہ سکھانا، تعلیم کا ترجمہ سکھانا ہے اور تبلیغ کا ترجمہ پہنچانا ہے۔ان دونوں لفظوں میں اردو زبان کے اعتبار سے بھی فرق ہے، سکھانا اور پہنچانا کسی کو ایک بات پہنچا دی یہ اور چیز ہے اور کسی کو کام سکھانا اور چیز ہے۔تبلیغ و تعلیم علما کے فرائض ہیں: دونوں فرائض علما کے ہیں، تعلیم بھی، تبلیغ بھی۔ تعلیم دینے کی بھی ضرورت ہے۔رسول اکرم ﷺ میں دونوں شانیں تھیں، ﴿بلغ ماانزل الیك من ربك﴾۔تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا اور ایسے ہی ''انما بعثت معلماً'' اور قرآن مجید میں فرمایا گیا ﴿یعلمهم الکتاب والحکمة﴾، تعلیم کتاب وحکمت رسول کریم ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔تو تعلیم بھی رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں ہے اور تبلیغ بھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں چیزوں کے متعلق ہدایتیں کی ہیں، معلمین کے لیے الگ ہدایتیں کی ہیں اور مبلغین کے لیے الگ اور حضور اکرم ﷺ نے دونوں کام کیئے ہیں، تعلیم کا بھی، تبلیغ کا بھی۔

تبلیغ کی فوقیت: لیکن اس جگہ قران عظیم نے تعلیم سے بھی آگے تبلیغ کو ذکر فرمایا:﴿ولینذور اقومهم اذار جعوا الیهم﴾ ا نذار کریں اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کر آئیں۔ انذار ایک قسم کی تبلیغ ہے، تعلیم نہیں، تبلیغ کو اس جگہ ساری چیزوں سے مقدم رکھا ہے۔اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا حاصل بھی تبلیغ ہی ہے۔

غور کرو جتنے طلبہ کو ہم یہاں تعلیم دے رہے ہیں اس کا منشاء کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ کے اور اللہ کے احکام پہنچانا تبلیغ کا مفہوم ہے، اس کے ایک مکمل صورت یہ ہے کہ دین کے احکام خواہ ان کو اس کی ضرورت ہے یا نہیں، ہم نے ان کو سارے سکھا دیئے، پڑھا دیئے، تا کہ آگے جا کر یہ اور لوگوں تک پہنچائیں۔ تعلیم کا بھی اصل مقصود تبلیغ ہے۔ اگر تعلیم تعلیم ہی کے درجہ میں رہے اور تبلیغ تک نہ پہنچ سکے تو اس کا حاصل پھر یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کو پہنچا نہیں۔ اگر ہماری تعلیم یہ رہے کہ ہم نے جو کتاب پڑھی وہ دوسروں کو پڑھا دیں صرف اتنا کام نہیں بلکہ کتاب پڑھانے کے پیچھے یہ بھی ہے کہ اس کو دین سکھا دیں اور اسے دوسروں تک پہنچا دیں۔

انذار کا مفہوم: قرآن مجید نے اس آیت میں اہل علم کا مقصد زندگی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بتایا، انذار اب غور کرو قرآن کے الفاظ میں کہ قرآن نے تبلیغ نہیں کہا بلکہ لیبلغوا قومھم نہیں کہا بلکہ لینذروا قومھم فرمایا۔ قرآن کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ میں عجیب وغریب نکات ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ قرآن کو کوئی اس نیت سے پڑھتا ہے عوام کے کہنے کہا ہیں۔ عالموں کو فکر نہیں، ہر بات میں ذرا ذرا سے ردوبدل سے بڑا فرق اور بڑے دوررس فوائد، پیدا ہو جاتے ہیں۔

انذار کا مفہوم سمجھیں، انذار کے لفظی معنی ڈرانے کے ہیں اور اسی لیے نذیر ڈرانے والے کو کہا جاتا ہے۔ انبیا کی شان میں بشیر ونذیر دونوں صفت آتی ہے، بشیر اس واسطے کہ وہ نیک کام کرنے والوں کو خوش خبری سنانے والے ہیں اور نذیر (ڈرانے والے) اس لیئے کہ وہ جہنم سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں، لیکن

مطلق ڈرانے کے معنی نہیں۔عربی لغت کو اللہ تعالی نے عجیب خوبی عطا فرمائی ہے۔ اس کے عجیب خواص ہیں۔ڈرنے کے معنی میں خوف کا لفظ بھی آتا ہے۔نذیر کا مادہ بھی خوف کے معنی میں آتا ہے۔خوف تو ہے ہی اور بہت سے الفاظ آتے ہیں خوف کے معنی میں۔حذر بھی خوف کے معنی میں آتا ہے۔

انذار و تخویف کا امتیاز اور ان کے نتائج: لیکن انبیا علیہم السلام کے لیئے جو صفت بتائی ہے وہ نذیر بتائی اور اہل علم کو حکم دیا تو وہ انذار کا حکم دیا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ انذار کے معنی مطلق ڈرانے کے نہیں۔جہاں تک ڈرانے کا تعلق ہے تو بلی، شیر اور بھیڑیا بھی ڈراتا ہے اور انسان اس سے ڈرتا ہے کہ پھاڑ کھائے گا۔ایک چور، ڈاکو ڈراتے ہیں کہ ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ایک حاکم افسر ڈراتا ہے، غرض ایک ڈرانا تو وہ ہے جو تکلیف سے ڈرایا جاتا ہے، اپنی قوت قاہرہ کی بنا پر، اس کا نام انذار نہیں، اس کو تخویف کہیں گے۔انذار اس ڈرانے کو کہیں گے جو شفقت کی بنا پر ہو۔شفقت ومحبت کے داعیہ سے انذار پیدا ہو، اس ڈرانے کا نام انذار ہے، جیسے باپ ڈراتا ہے بیٹے کو بچھو سے، سانپ سے، آگ سے۔باپ کہتا ہے کہ بیٹا آگ کے قریب ہاتھ نہ کرو، ہاتھ جل جائے گا اور تمام مضر چیزوں سے ڈراتا ہے، یہ ڈرانا ایسا نہیں جیسے چور ڈراتا ہے۔ چور بھی ڈراتا ہے، ڈاکو بھی ڈراتا ہے اور باپ بھی ڈراتا ہے۔ان میں بڑا فرق ہے یا نہیں؟ چور ڈاکو کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔وہ تو اس کا مال چھیننے کے لیے ڈراتا ہے اور انذار کہتے ہیں اس کو جو ہمدردی پیدا ہو۔جیسے استاد ڈراتا ہے شاگرد کو کہ دیکھو! اگر ایسا کرو گے تو تمہارا نقصان ہو جائے گا۔پیر ڈراتا ہے اپنے مرید کو، باپ ڈراتا ہے اپنی اولاد کو، الغرض جو ہمدردی و شفقت سے پیدا ہو اس کا نام ہے انذار۔اسی واسطے انبیا علیہم السلام کی شان میں نذیر کا لفظ آیا؟ بشیراً ونذیراً۔کیوں کہ انبیا علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ وہ دشمنوں کو بھی اگر کوئی ڈر کی بات سناتے ہیں تو وہ ہمدردی سے پیدا ہوتی ہے اور ان دونوں کا بڑا فرق ہے کہ جو تخویف چور ڈاکو کرتا ہے

اور وہ تخویف جو باپ اور استاد کرتا ہے وہ انذار اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اثرات کا بھی فرق ہے ظاہر ہے کہ چور، ڈاکو ڈراتا ہے (انسان) اس سے ڈرتا بھی ہے اور عمر بھر کے لیئے اس کا دشمن ہو جاتا ہے، اس کی شکل دیکھنے سے بھی بھاگتا ہے، آج تو اتفاق سے مل گیا۔ لیکن آئندہ ایسی کوشش کرے گا کہ اس کی شکل نظر نہ آئے۔ اس تخویف کا اثر تو یہ ہوتا ہے۔ اور انذار کا کیا اثر ہوتا ہے؟ جتنا وہ ڈراتا ہے اتنی ہی اس سے محبت بڑھتی ہے۔ جس اولاد کو تربیت کرنے کے لیے شفقت کے ساتھ باپ زیادہ ڈرائے گا اور مار پیٹ بھی تھوڑی سی کرے گا اس سے زیادہ محبت ہوگی۔ ایسے ہی استادوں کا قصہ ہے۔ استاد اگر محبت و شفقت سے اپنے شاگرد کو اس کی اصلاح کی خاطر ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے، برا بھلا کہتا ہے، ڈانٹتا ہے، مارتا ہے، نکال دیتا ہے تجربہ شاہد ہے، کہ جتنا ایسا معاملہ استاد کرے گا اسی استاد سے زیادہ محبت ہوگی۔

میرا تو خود اپنا تجربہ ہے کہ جس اولاد کو زیادہ مارا پیٹا ہے اور اس پر تنبیہات کا سلسلہ جاری رکھا ہے اسی کو مجھ سے زیادہ محبت ہوئی۔ میری اولاد میں جس کے ساتھ یہ سلسلہ کم رہا ان کے ساتھ کم محبت ہوئی اور جن کے ساتھ زیادہ رہا ان سے زیادہ محبت ہوئی۔ شاگردوں کا بھی یہی حال ہے۔

جدید وقدیم طلباء واساتذہ کا طرز عمل: ہمارے آج کل کے جو شاگرد ہیں، خدا بچائے ان شاگردوں سے، ان سے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری ٹوپی نہ اتار لیں۔ ہم یہاں سے اٹھ کر جاویں تو ہماری قیمت نہ چلی جاوے۔ جن طالب علموں کو ہم نے پڑھایا تھا۔ ان کو ہم تو مارا پیٹا کرتے تھے، برا بھلا کہنا، ڈانٹ دینا، نکال دینا، یہ تو روزمرہ کا دھندہ تھا، ذرا سی بات پر بھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ استاد کے خلاف کوئی بات کہے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں تو اچھا خاصا یہ معمول تھا کہ پیٹا جاتا تھا۔ ہمارے ادب کے استاذ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب

رحمہ اللہ تعالیٰ کا قصہ یاد آیا۔ ہم نے ادب کی ساری کتابیں مفید الطالبین سے لے کر حماسہ تک اتفاق سے ان سے پڑھی ہیں۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ ایک فن کی ساری کتابیں ایک استاذ سے آدمی پڑھے مگر ہماری کچھ رعایت بھی کی جاتی تھی۔ دارالعلوم میں اللہ کے فضل سے سب اساتذہ خوش تھے۔ اس واسطے ہماری رعایت کرتے تھے۔ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ہماری ادب کی ساری کتابیں مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہوں۔

''مفید الطالبین'' ہم نے شروع کی۔ مفید الطالبین کے پڑھاتے پڑھاتے ہماری ''صرف نحو'' انہوں نے پکی کرادی۔ ''الباب الاول'' پر پہنچے، جو کہ مفید الطالبین کا پہلے باب کا عنوان ہے۔ الباب یہ فعل ہے۔ اسم ہے، یا حرف؟ اب ہم بغلیں جھانکنے لگے۔ اس واسطے کہ نحو میر یاد نہیں تھی، کسی نے کہہ دیا چوں کہ الف لام لگا ہوا ہے، اسم کی علامت ہے اسم ہے۔ آپ نے فرمایا کون سا اسم ہے؟ ساری نحو میر کا اجراء کرایا۔ نہ بتانے پر فقط یہ نہیں کہ تنبیہات ہوں۔ ''تنبیہ الغافلین'' ساتھ رہتی تھی اور جہاں غلطی کی وہ آیا۔ ہم چودہ پندرہ آدمیوں کی جماعت تھی، کوئی بڑی جماعت نہیں تھی، چھوٹی جماعت تھی۔ ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا کہ اب پڑی۔ یہ اللہ کا انعام وکرم ہے کہ چودہ آدمی تھے سب پر برسی، مجھ پر نہ برسی، مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا تھا۔ استاذ بھی خوش تھے اور ڈرتا بھی بہت تھا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے محفوظ رکھا۔ کبھی مار نہیں پڑی۔

بس عنایتیں رہیں۔ البتہ کبھی کبھی خفا ہو گئے، تیز نگاہ سے دیکھ لیا۔ بس یہی میرے لیے مار تھی۔ مار پڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ ہم نے اس طرح پڑھا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ''نفحۃ الیمن'' پڑھنے کے زمانے میں ہم نے عربی نظم کا امتحان دیا۔ عربی تحریر فقط نہیں، عربی نظم اشعار اور مفتی کفایت اللہ صاحب جو ادیب بہت اچھے تھے، ان کو ہمارے امتحانِ کے لیے دہلی سے بلایا گیا تھا۔ چنانچہ

انہوں نے ہمارا امتحان لیا اور ایک مصرعہ دیا کہ اس پر نظم لکھو تین چار گھنٹے امتحان کا وقت تھا۔ ان چار گھنٹوں میں دس شعروں کی ایک نظم لکھ کر پیش کر دی۔ یہ نفحۃ الیمن کا زمانہ تھا۔ آج تو حماسہ پڑھ کر بھی کوئی نہیں کر سکتا۔

وجہ اس کی تعلیم و تربیت کا ایک ڈھنگ تھا۔ استاد کا خوف، استاد کی عظمت و محبت اور چوں کہ ان کی روش یہ تھی جس پر یہ بات کرنے کی نوبت آئی۔ وہ مار پیٹ کرتے تھے اس لیے اتنی محبت ان کی ہمارے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ کسی استاد کی اتنی محبت ہمارے دلوں میں نہیں تھی جتنی محبت ان کی ہمارے دلوں میں تھی۔ اگرچہ مجھ پر مار کی نوبت نہیں آئی، البتہ ایک دو دفعہ خفا ہونے کا معاملہ ہوا۔ بس مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری جان نکل گئی۔ اس طرح سے استادوں سے پڑھا تھا اور ان سے تعلق رکھا تھا۔ اس سے کچھ آجایا کرتا تھا۔ آج کا طالب علم؟ استاد کہیں، شاگرد کہیں؟ اور مجال ہے استاد کی کہ شاگرد کو ایک لفظ بھی کہہ دے۔ اللہ اللہ! کہاں بات چلی گئی؟

میں اس پر کہہ رہا تھا کہ انذار کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اصل چیز تبلیغ ہے اور تعلیم کا بھی انجام پھر تبلیغ ہے اور اس کے لیے قرآن نے لفظ انذار تیار کیا ہے، جس پر یہ ساری باتیں۔ ہمدردی و شفقت سے جو ڈراتا ہے اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ الحمدللہ اب کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ اتنی عمر ہوگئی کہ اپنے ان استاذ کو ایصالِ ثواب کرتا ہوں اور مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔ انہوں نے مجھ پر شفقت کی اور مار پیٹ بھی ہوئی۔ تنبیہات بھی ہوئیں۔ ان کی محبت رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

قصور کس کا ہے؟: تجربہ شاہد ہے لوگ کر کے نہیں دیکھتے۔ آج بھی الحمدللہ طلبہ میں تنفر نہیں ہے۔ طلبا کا بھی قصور ہے، استادوں کا بھی۔ استاد اگر ہمدردی اور محبت سے طلبا کی اصلاح کے لیئے یہ چاہیں کہ ہمارے طالب علم کے اخلاق درست ہو جائیں، ان کی تعلیم ٹھیک ہو جائے، اس پر مار پیٹ بھی کریں۔ تنبیہات بھی کریں۔

ممکن ہے کہ ایک آدھ دفعہ کسی کو ناگوار بھی ہو جائے۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوگا کہ اس کو کوئی غرض نہیں، ہماری محبت میں کرتا ہے تو پھر وہی عاشق ہو جاتے ہیں اور محبت ان کے دل میں سما جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ طریقہ جاتا رہا۔ کالجوں اور اسکولوں کا سا طرز ہو گیا۔ مدرس نے پڑھایا اپنے گھر چلا گیا اور طالب علم نے پڑھا اپنے حجرہ میں چلا گیا۔ کسی کو دوسرے سے واسطہ نہیں۔

غرض یہ ہے کہ انذار وہ چیز ہے جس سے ہمدردی اور شفقت اور بڑھتی ہے۔ قرآن نے اس کو اختیار کیا ﴿ولینذروا قومھم﴾ انذار کرو اپنی قوم کو، ان کو تبلیغ کرو۔ تبلیغ بھی بشکل انذار، یعنی ہمدردی اور شفقت کے ساتھ۔ ان کو دین کے مسائل پہنچاؤ۔

تعلیم کی صحیح ترتیب: ہمارا اپنا اصول یہ تھا کہ بچپن سے پہلے قرآن مجید پڑھایا۔ بچہ قرآن پڑھ کر فارغ ہوا تو فارسی درجہ میں داخل ہوا۔ فارسی، ریاضی، حساب و کتاب اقلیدس۔ یہ ساری چیزیں جو میٹرک تک کی تعلیم ہے وہ ہمارے درجہ فارسی تک میں پڑھائی جاتی تھیں۔ میٹرک تک کی تعلیم میں نے خود سیکھی ہے۔ حساب جو آج بی اے تک حساب ہے وہ میں نے پڑھا ہے۔ اقلیدس میں نے پڑھی ہے، اس طرح مساحت کا کام جس کا آج کل بہت بڑا محکمہ بنا ہوا ہے وہ میں نے سیکھا ہے اور سب فارسی پڑھنے کے زمانے میں سیکھا۔ پانچ سال کا کورس تھا، اس پانچ سال کے کورس میں سب چیزیں سیکھیں۔ عربی کا ابھی نام تک نہیں پڑھا تھا۔ اس کے بعد جا کر عربی میں داخلہ ہوا۔

پیغمبرانہ طریقِ اصلاح اور ہم: کرنے کا کام تو یہ ہے جو قرآن نے بتایا ﴿ولینذروا قومھم﴾۔ مقصد زندگی بنانا ہے اس بات کو کہ یہ امانت اللہ کے رسول کی ہم تک پہنچی ہے، جس کا نام وراثت نبوت ہے۔ العلماء ورثۃ الانبیاء علماء انبیاء کی وراثت ہیں۔ یہ انبیاء کی وراثت آپ کو ملی ہے۔ یہ امت کو پہنچانی ہے اور

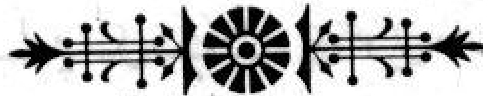
پہنچائی بھی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ۔انذار کے لفظ سے اشارہ کر دیا،اس بات کی طرف کہ شفقت و ہمدردی کے ساتھ یہ امت کو پہنچائی ہیں۔

اب ہمارے ہاں تو معاملہ روکھا ہے۔انذار کرنے والے کہاں سے لاویں؟ اول تو جیسا میں عرض کر رہا ہوں ادھر دھیان ہی نہیں ہوتا تبلیغ کی طرف،نہ دوسروں کو سکھانے کی طرف دھیان ہوتا ہے۔سینکڑوں میں کوئی ایک ایسا نکلتا ہے جسے دوسروں کی تعلیم و تبلیغ و اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس میں ایک اور روک شیطان نے لگادی،وہ یہ کہ جو انذار کا لفظ قرآن کریم نے اختیار کیا تھا،اس کی طرف دھیان نہیں کرتا،قرآن کی تعلیم کا حاصل انذار کے لفظ سے یہ ہے کہ لوگوں کو پیغمبرانہ تعلیم دو،پیغمبروں کی طرح سے،تشدد کے الفاظ نہ بولو،برا نہ مناؤ،اشتعال نہ پیدا کرو، تمہارا جو مخالف ہے،مخالف عقیدہ رکھتا ہے،مخالف رائے رکھتا ہے،تمہارے خلاف ہے،اس کو دعوت دو قریب کر کے،انذار کے طریقے پر۔اور انذار اس کا نام ہے کہ شفقت و ہمدردی کے ساتھ یہ بات کہ کسی طرح سے یہ درست ہو جائے۔صحیح عقیدہ کو مان کے،اس طرح سے پہنچاؤ،اس کا تو دنیا میں بالکل قحط ہے۔سارا قرآن پیغمبروں کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔حضرت ہود علیہ الصلاۃ والسلام کا غالباً واقعہ ہے۔

﴿انا لنرٰك فی سفاهة و انا لنظنك من الکاذبین ﴾''ہم تو تم کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور جھوٹا بھی سمجھتے ہیں''اس سے بڑی گالی اور کون سی ہوگی۔مہذب گالی اس سے بڑی اور کون سی ہوگی کہ تم بے وقوف بھی ہو اور جھوٹ بولنے والے بھی ہو۔ پیغمبر کیا جواب دیتے ہیں؟ اگر تمہیں کوئی دوسرے فرقہ کا آدمی کہہ دے تو کیا جواب دو گے؟ باپ دادا تک کی خبر لے لو گے۔لیکن پیغمبر نے کیا جواب دیا؟ قرآن کے الفاظ دیکھو وہ تو کہہ رہے ہیں:﴿انا لنرٰك فی سفاهة و انا لنظنك من الکاذبین﴾پیغمبر نے جواب دیا﴿یاقوم لیس بی سفاهة و لکنی رسول من رب العالمین ﴾اے میری برادری!ان کو خطاب کرتے ہیں اپنی شرکت کے

ساتھ کہ میں تم ہی میں سے ایک ہوں، تم میری برادری ہو اور میرے بھائی ہو۔ یاقوم
''اے میری برادری! لیس بی سفاھة اسے سمجھو! میں بے وقوف نہیں ہوں۔
ولکنی رسول من رب العالمین ۔ یہ ہے سیدھا سادا جواب، گالی کا۔ سارا
قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے والد کو تلقین فرمائی۔ انہوں نے کہا لارجمنك ہم تمہیں سنگسار کردیں گے۔ تم ہمارے الٰہ کا انکار کرتے ہو اور ہمارے معبودوں کا اور بتوں کا انکار کرتے ہو۔ لئن لم تنته۔ اگر تو ہمارے بتوں کو برا کہنے سے باز نہیں آئے گا تو ہم تمہیں سنگسار کردیں گے۔ اور چلے جاؤ نکل جاؤ۔ واھجرنی ملیاً اور زمانہ دراز کے لیے یہاں سے نکل جاؤ۔ باپ نے یہ کہا اور حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام مشرک باپ کو کیا جواب دیتے ہیں۔ ﴿سلام علیك ساستغفر لك ربی انه کان بی حفیا﴾: ''کہ میں اللہ سے آپ کے لیے استغفار کروں گا، وہ مجھ پر مہربان ہے''۔ یہ طریقہ اختیار کرو۔ یہ ہے پیغمبرانہ طریق دعوت جو علم دین کے حاملین کا شعار ہونا چاہیے۔ (ماہنامہ ''وفاق المدارس'' ۲۰۰۶ء)



فضیلتِ علم وعلماء

مذکورہ ذیل مضمون "تفسیر معارف القرآن" سے ماخوذ ہے جس میں علم کی فضیلت اور اہل علم کے فرائض منصبی کا بیان ہے اور ان کو ان کی شرعی مسؤلیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ رب کریم اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(ادارہ)

فضیلت علم وعلماء: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: "جو شخص کسی راستہ پر چلے جس کا مقصد علم حاصل کرنا ہو اللہ تبارک وتعالیٰ اس چلنے کے ثواب میں اس کا راستہ جنت کی طرف کردیں گے' اور یہ کہ اللہ کے فرشتے طالب علم کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں اور یہ کہ عالم کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اور پانی کی مچھلیاں دعاواستغفار کرتی ہیں اور یہ کہ عالم کی فضیلت کثرت سے نفلی عبادت کرنے والے پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر اور یہ کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں' اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام سونے چاندی کی کوئی میراث نہیں چھوڑتے لیکن علم کی وراثت چھوڑتے ہیں تو جس شخص نے یہ وراثت علم حاصل کرلی اس نے بڑی دولت حاصل کرلی"۔

رسول اللہ ﷺ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے ایک عالم تھا جو صرف نماز پڑھ لیتا اور پھر لوگوں کو دین کی تعلیم دینے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ دوسرا دن بھر روزہ رکھتا' اور رات کو عبادت میں کھڑا رہتا تھا' ان دونوں میں کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم سے ادنیٰ آدمی پر۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عبادت گذاروں سے زیادہ قوی ہے اور بھاری ہے (ص ۲۸۸ ج ۴)

اہل علم کی شان: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگر چہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہو۔ (ص ۵۰۷ ج ۵)

علماء انبیاء کرام کے وارث ہوتے ہیں: بے شک علماء وارث ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہم السلام دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی وراثت علم ہوتا ہے جس نے علم حاصل کر لیا اس نے بڑی دولت حاصل کر لی۔ (ص ۱۸ ج ۶)

علماء کے لئے بشارت: ایک حدیث ہے جس میں علماء کے لئے بڑی بشارت ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے۔ حدیث یہ ہے۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوں گے تو علماء سے فرمائیں گے کہ میں نے اپنا علم و حکمت تمہارے سینوں میں صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا ہوں باوجود ان خطاؤں کے جو تم سے سرزد ہوئیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مراد وہی علماء ہیں جن میں علم کی قرآنی علامت خشیت اللہ موجود ہو۔ اس آیت میں لفظ "لمن یخشی" (سورہ طہٰ: ۳) اسی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ علامت نہ ہو وہ اس کے مستحق نہیں۔ واللہ اعلم (ص ۶۵ ج ۶)

علم سکھانے کی فضیلت: قیامت کے روز ایک شخص کے اعمال وزن کے لئے لائے جائیں گے اور ترازو کے پلہ میں رکھے جائیں گے تو یہ پلہ ہلکا رہے گا۔ پھر ایک ایسی چیز لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہوگی اس کو بھی اس کے حسنات کے پلہ میں رکھ دیا جائے گا تو یہ پلہ بھاری ہو جائے گا۔ اس وقت اس شخص سے کہا جائے گا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے (جس نے تمہاری نیکیوں کا پلہ بھاری کر دیا) وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں، تو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھایا کرتا تھا۔

(ص۳۳۷ج۶)

علماء کی روشنائی کا وزن: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی (جس سے انہوں نے علم دین کی کتابیں لکھی تھیں) باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔

(ص۳۳۷ج۶)

علماء کی عظیم الشان فضیلت: اس آیت (سورہ فاطر:۳۲) میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جو ہمارے بندوں میں منتخب اور برگزیدہ ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور علوم نبوت کے بلا واسطہ وارث حضرات علماء ہیں، جیسا کہ حدیث میں بھی ارشاد ہے "العلماء ورثۃ الانبیاء" حاصل اسکا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن وسنت کے علوم کا مشغلہ اخلاص کے ساتھ نصیب فرمایا یہ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ اولیاء ہیں۔ (ص۳۴۸ج۷)

علماء کی مجالس میں بلند آواز سے نہیں بولنا چاہیے: ۔جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء ہونے کے داخل ہیں۔ اسی طرح رفع صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے ان کی آواز دب جائے۔ (ص۱۰۱ج۸)

علماء دین کے سامنے بھی پیش قدمی ممنوع ہے: ۔(سورہ الحجرات:۱) بعض علماء

نے فرمایا ہے کہ علماء ومشائخ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارث انبیاء ہیں اور دلیل اسکی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوالدرداء کو رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا وآخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع وغروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر وافضل ہو۔

اس لئے علماء نے فرمایا کہ اپنے استاد اور مرشد کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ (ص ۱۰۰ ج ۸)

تقدم اور رفع صوت بدون نیت ایذا بھی نقصان کا باعث ہے:۔ یہ افعال تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہو جائے۔ اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچادے جس سے تمام اعمال صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصد ایذا کا نہ کیا تھا اس لئے اس کو اسکی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلاء کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہوا سکے ساتھ گستاخی وبے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاع ایمان کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ (ص ۱۰۲ ج ۸)

عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے:۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ جب میں کسی عالم صحابی سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو ان کے مکان پر پہنچ کر ان کو آواز یا دروازہ پر دستک دینے سے پرہیز کرتا اور دروازہ کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لائیں گے اس وقت ان سے دریافت کروں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی' آپ نے دروازہ پر دستک دیکر کیوں نہ اطلاع کر دی تو ابن

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ان کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازہ پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اس کا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لائیں گے اس وقت ملاقات کروں گا۔ (ص ۱۰۳ ج ۸)

تنبیہات

اہل علم پر بدعملی کا وبال زیادہ ہوگا:۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج میں میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے تھے میں نے جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیادار واعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے۔

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے ''ہم زبان سے کہتے ضرور تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے''

حضرت انس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ (ص ۲۱۸، ۲۱۹ ج ۱)

علم کا اظہار واجب اور چھپانا حرام ہے:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر

اللہ تبارک وتعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہے اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا“

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا موجود نہ ہو۔ اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کرلو۔

باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل واحکام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل واحکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا بہتر ہے اور وہ کتمان علم کے حکم میں نہیں ایسے ہی کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کردو گے۔

صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے علم کا اظہار کرو جس کو ان کی عقل وفہم برداشت کرسکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی ان کے دلوں میں اس سے شبہات وخدشات پیدا ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔“

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا“ (ص۴۰۳ ج۱)

شاگرد کی گمراہی کا وبال مستند استاد پر نہیں ہوگا:۔ کوئی شخص کسی جامع معقول ومنقول عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے تا کہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کیئے جاتے ہیں اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے اور پھر خود ہی خلاف شرع عقائد باطلہ کو تقویت دینے میں استعمال کرنے لگے' اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کرلے' اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جائے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلاف اسلام نظریات وعقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اسکی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہوسکتی۔ (ص ۲۷۳ ج ۱)

دنیوی اغراض کی خاطر احکام کو چھپانا حرام ہے: علم دین اور احکام خدا ورسول کو چھپانا حرام ہے۔ مگر یہ حرمت اسی طرح چھپانے کی ہے جو یہود کا عمل تھا' کہ اپنی دنیوی اغراض سے احکام خداوندی کو چھپاتے تھے اور اس پر لوگوں سے مال وصول کرتے تھے اور اگر کسی دینی اور شرعی مصلحت سے کوئی حکم عوام پر ظاہر نہ کیا جائے تو وہ اس میں داخل نہیں۔ بعض اوقات کسی حکم کے اظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس خطرہ کی بناء پر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔ (ص ۲۵۸ ج ۲)

علماء ہی صحیح عقلاء ہیں:۔ اگر کوئی انتقال سے قبل یہ وصیت کر جائے کہ میرا مال عقلاء کو دے دیا جائے۔ تو کس کو دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا کہ ایسے عالم زاہد اس کے مال کے مستحق ہوں گے جو دنیا طلبی اور غیر ضروری مادی وسائل سے دور ہیں' کیونکہ صحیح معنی میں وہی عقلاء ہیں۔

(ص ۲۶۵ ج ۲)

بغیر عمل کے محض عالم ہونا کافی نہیں: ۔امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’یعنی جو شخص کسی کام میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کررہا ہے وہ یہ کام کرتے ہوئے جاہل ہی ہے‘‘ اگرچہ صورت میں بڑا عالم اور باخبر ہو۔ (۳۴۳ ج ۲)

اللہ کے نزدیک عالم وہی ہے جو علم پر عمل بھی کرے: ۔اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو علم پر عمل بھی کرتا ہو ورنہ وہ عالم جو احکام الٰہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض وواجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اسکی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ ورسول کے نزدیک جاہل سے بھی بدتر ہے۔ (ص ۱۵۹ ج ۲)

ربانی اور عالم کی خدمات میں فرق: ۔جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات وعمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہے اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کرلیتا ہے۔ وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص علمی مہارت پیدا کرکے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض وواجبات اور سنن موکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔ (ص ۱۶۰ ج ۲)

علماء عوام کے اعمال کے ذمہ دار ہیں: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے۔ ایک مشائخ دوسرے علماء اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ربانیوں سے مراد وہ علماء ہیں جو حکومت کی طرف سے مامور اور با اقتدار ہوں اور احبار سے مراد عام علماء ہیں، اس صورت میں جرائم سے روکنے کی ذمہ داری حکام اور علماء دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

آخر آیت (سورہ مائدہ: ۶۳) میں فرمایا ’’لبئس ما کانوا یصنعون‘‘ یعنی ان مشائخ وعلماء کی یہ سخت بری عادت ہے کہ اپنا فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ ان کو نہیں روکتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مشائخ وعلماء کے لئے پورے قرآن مین اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہہ کہیں نہیں، اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ، علماء کے لئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔

مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہیں جبکہ مشائخ وعلماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائے گی اور جس جگہ قرائن یا تجربہ سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے، لیکن افضل واعلیٰ پھر بھی یہی رہتا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں اور اس میں کسی کی ملامت یا ایذا کی فکر نہ کریں۔ (ص۱۸۶ج۳)

قوم وملت کی اصلی روح حق پرست علماء ومشائخ ہیں:۔ قوم وملت کی اصلی روح حق پرست، خدا ترس علماء ومشائخ ہیں۔ ان کا وجود پوری قوم کی حیات ہے، جب تک کسی قوم میں ایسے علماء ومشائخ موجود ہوں جو دنیوی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں، خدا ترسی ان کا مقام ہو تو وہ قوم خیر وبرکت سے محروم نہیں ہوتی۔ (ص۲۱۸ج۲)

اپنی بات کی پچ میں لگے رہنا اہل علم کی شان کے خلاف ہے:۔ خدا کی منکر اور کافر قوموں کا حال ہے کہ غلط بات زبان سے نکل گئی تو اس کی سخن پروری کرتے رہے اور اس کے خلاف کتنے ہی واضح دلائل آجائیں اپنی بات کی پچ کرتے رہے جس میں بکثرت مسلمان بلکہ بعض علماء وخواص بھی مبتلا پائے جاتے ہیں کہ کسی چیز کو اول وہلہ میں غلط یا جھوٹ کہہ دیا تو اب اس کی سچائی کے ہزاروں دلائل بھی سامنے آجائیں تو اپنی غلط بات کی پیروی کرتے رہے، یہ حالت قہر خداوندی اور غضب الٰہی کا موجب ہے۔ (ص۱۹ج۴)

اہل علم کو ناز نہیں کرنا چاہئے:۔ کسی شخص کو اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت پر ناز نہیں کرنا چاہئے، حالات بدلتے اور بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی، جیسے بلعم بن باعورا (بنی

اسرائیل کے ایک عالم) کا حشر ہوا' طاعت وعبادت کے ساتھ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دعا اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔ (ص۱۲۲ج۴)

علم' دین میں سمجھ بوجھ کا نام ہے:۔ جس شخص نے دین کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں مگر سمجھ بوجھ پیدا نہ کی وہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں عالم نہیں' علم دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے وہ جن ذرائع سے حاصل ہو' وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت' سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔ (ص۴۹۱ج۴)

اہل علم کی ذمہ داری: عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اسکی تبلیغ ودعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا' ایک دفعہ موثر نہیں تو بار بار کرتا رہے تاکہ اس کا نتیجہ "یحذرون" برآمد ہوسکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا۔
(ص۴۹۲ج۴)

اہل علم سے رابطہ رکھنا:۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ جس شخص کو دین کے معاملہ میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ علماء حق سے سوال کرکے اپنے شبہات دور کرے ان کی پرورش نہ کرتا رہے۔ (ص۵۶۹ج۴)

اہل علم کو تنبیہ: امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ (ص۶۷۳ج۴)

اہل علم کو لوگوں کے معاش کی درستگی کی بھی فکر رکھنی چاہئے:۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے اسی طرح ان مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ جیسے یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ حکیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیداوار کے تمام گیہوں

کوخوشوں کے اندر رہنے دیں اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جائے۔ (ص ۷۰ ج ۵)

اہل علم، عوام سے خود کو بدگماں نہ ہونے دیں:۔ عالم ومقتداء کو اس کی بھی فکر رہنی چاہیے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو۔ اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہیے' کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال اس کی دعوت وارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے۔ لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو' یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے' یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے خواص وعلماء کو اس میں دوہری احتیاط لازم ہے۔ خود رسول کریم ﷺ جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں' آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا۔ ایک مرتبہ ازواج مطہراتؓ میں سے ایک بی بی آپ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے تو آپ نے دور ہی سے یہ بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کہا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہو جائے۔ (ص ۷۰ ج ۵)

اہل علم کے مابین رشتہ اخوت ہونا چاہیے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "علم تو اہل علم وفضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتہ اخوت وبرادری) ہے تو وہ لوگ جنہوں نے علم ہی کو عداوت بنالیا ہے' وہ دوسروں کو اپنے مذہب کی اقتداء کی دعوت کس طرح دیتے ہیں' ان کے پیش نظر دوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر ان سے باہمی انس ومودت اور مروت کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے' اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور برائی اور کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کر دے اور مؤمنین ومتقین کے اخلاق سے محروم کر دے۔

(ص ۲۱۸ ج ۵)

اس لئے ائمہ فقہاء اور اہل حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے دعوت حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطاء پر سمجھے اس کو نرمی اور خیر خواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطاء پر متنبہ کر دے پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے جھگڑے اور بدگوئی سے کلی احتراز کرے۔

حضرت امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا ارشاد ہے: "کہ علم میں جھگڑا اور جدال نور علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو کیا وہ حفاظت سنت کے لئے جدال کر سکتا ہے فرمایا نہیں بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے پھر وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے"
(ص ۴۱۸ ج ۵)

جو علم نافع نہیں وہ عذاب ہے:۔ امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے فرمایا کہ علم دین اور دعوت حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصول صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادت ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوت ابدی کی طرف جاتا ہے اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے۔

"سب سے زیادہ عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو" (ص ۴۱۹ ج ۵)

عبدالاعلیٰ تیمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا مقولہ ہے۔ "جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو جو اسکو رلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اس کو علم نافع نہیں ملا۔ (ص ۵۲۹ ج ۵)

اہل علم کی اولاد کی قدر کرنا چاہیئے: تفسیر مظہری میں ہے کہ لوگوں کو علماء و صلحاء کی اولاد کی رعایت اور ان پر شفقت کرنی چاہیئے۔ جب تک کہ وہ بالکل ہی کفر و فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جائیں (ص ۲۱۰ ج ۰)

عالم ربانی کون ہے:۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ ربانی حکماء علماء اور فقہاء بنو صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ربانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے' جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے وہ عالم ربانی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں پر آسانی کرو، دشواری نہ پیدا کرو' اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناؤ' مایوس یا متنفر نہ کرو" (ص ۴۱۶ ج ۵)

اہلِ علم کو اعمال میں زیادہ اہتمام آداب کی ضرورت ہے:۔ امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج اہل علم اور معروف بالصلاح لوگوں میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نماز کے آداب سے غافل' محض نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ چھٹی ہجری کا حال تھا' جس میں ایسے لوگ خال خال پائے جاتے تھے۔ آج یہ صورت حال نمازیوں میں عام ہوگئی الا ماشاء اللہ۔ (ص ۴۵ ج ۶)

اللہ کے نزدیک عالم کون ہے؟۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت (سورۂ عنکبوت: ۴۳) کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کرے' اور اسکی طاعت پر عمل کرے اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا۔ جب تک قرآن میں تدبر اور غور و فکر کی عادت نہ ڈالے اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔ (ص ۶۹۴ ج ۶)

علم پر عمل کرنے سے علم میں زیادتی:۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت (سورۂ عنکبوت: ۶۳) کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو علم لوگوں کو دیا گیا

ہے جولوگ اپنے علم پر عمل کرنے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان پر دوسرے علوم بھی منکشف کردیتے ہیں جواب تک حاصل نہیں۔ اور فضیل بن عیاض رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے فرمایا کہ جولوگ طلب علم میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے عمل بھی آسان کردیتے ہیں۔ (ص۱۶۷ج۶)

عالم کو عمل کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور وبال بھی زیادہ:۔ جو عالم اپنے علم پر عامل بھی ہے اس کو بھی اس عمل کا ثواب دوسروں سے زیادہ ملے گا، اور اگر وہ کوئی گناہ کرے گا تو عذاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ (ص۱۳۰ج۷)

اہلِ علم بیت المال سے اپنا خرچ لے سکتے ہیں:۔ علماء جو تعلیم و تبلیغ کی خدمت مفت انجام دیتے ہوں، اور قاضی و مفتی جو لوگوں کے کام میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں ان کا بھی یہی حکم ہے کہ بیت المال سے اپنا خرچ لے سکتے ہیں۔ مگر کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو جو دینی خدمت میں خلل انداز بھی نہ ہو تو وہ بہتر ہے۔ (ص۲۶۳ج۷)

علماء سے مراد کون ہیں؟:۔ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ جل شانہ کی ذات صفات کا کما حقہ علم رکھتے ہیں، اور مخلوقاتِ عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات و انعامات پر نظر رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف و نحو اور فنون بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا جب تک اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔

حسن بصری رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے اس آیت "**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**" کی تفسیر میں فرمایا کہ عالم وہ شخص ہے جو خلوت و جلوت میں اللہ سے ڈرے، اور جس چیز کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ترغیب دی ہے وہ اس کو مرغوب ہو اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو اس سے نفرت ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہُ نے فرمایا "یعنی بہت سی احادیث یاد

کر لینا یا بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو"

احمد بن صالح مصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "خشیۃ اللہ" کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جا سکتا بلکہ اس کو کتاب وسنت کے اتباع سے پہچانا جاتا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ تعالیٰ' نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس شخص میں خشیت نہ ہو وہ عالم نہیں۔ اس کی تصدیق اکابر سلف کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "یعنی جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں"

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کسی میں خدائے تعالیٰ کا خوف ہے وہ اسی درجہ کا عالم ہے۔ (ص ۳۴۷ ج ۷)

فقیہ کون ہے؟: سعد بن ابراہیم سے کسی نے پوچھا کہ مدینہ میں سب سے زیادہ "افقه" کون ہے؟ تو فرمایا "اتقاهم لربه" یعنی جو اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی "فقیہ مکمل وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے اور ان کو گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو اللہ کے عذاب سے مطمئن بھی نہ کرے اور قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے۔ (اور فرمایا) اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو بے علم کے ہو۔ اور اس علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ بوجھ کے ہو اور اس قرأت میں کوئی خیر نہیں جو بغیر تدبر کے ہو۔ (ص ۳۴۷ ج ۷)

اہلِ علم کے بارے میں شبہ اور اس کا جواب:۔ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف وخشیت نہیں کیونکہ تصریحات بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں۔ جس میں خشیت نہ ہو وہ قرآن کی اصطلاح میں عالم ہی نہیں' البتہ خشیت کبھی صرف

اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی بے تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکۂ راسخہ کے درجہ میں ہو جاتی ہے۔ جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے، خشیت کا پہلا درجہ مامور بہ اور عالم کے لئے ضروری ہے، دوسرا درجہ افضل و اعلیٰ ہے ضروری نہیں۔ (ص ۳۳۸ ج ۷)

اہلِ علم کو لوگوں کی بے قاعدگیوں پر صبر کرنا چاہیئے:۔ جس شخص کو اللہ نے کوئی بڑا مرتبہ دیا ہو اور لوگوں کی ضروریات اس سے متعلق ہوں اسے چاہئے کہ وہ اہل حاجت کی بے قاعدگیوں اور گفتگو کی غلطیوں پر حتی الوسع صبر کرے کہ یہی اس کے مرتبہ کا تقاضا ہے۔ خاص طور سے حاکم، قاضی اور مفتی کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ (ص ۵۰۴ ج ۷)

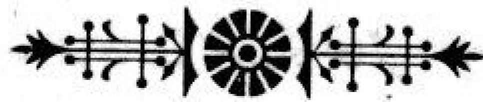
جس بات کا علم نہ ہو تو "اللّٰہ اعلم" کہہ دے:۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ "اے لوگو، تم میں سے جس شخص کو کسی بات کا علم ہو تو وہ لوگوں سے کہہ دے، لیکن جس کا علم نہ ہو تو وہ "اللہ اعلم" کہنے پر اکتفا کرے، (کیونکہ) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے۔" قل ما اسئلکم علیه من اجر وما انا من المتکلفین" (ص ۵۳۲ ج ۷)

علماء کو کچھ وقت خلوت کا بھی رکھنا چاہیئے:۔ حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت (سورۂ مزمل: ۷) سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء و مشائخ جو تعلیم و تربیت اور اصلاح خلق کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں ان کو بھی چاہئے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں۔ رات کا وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے۔ جیسا کہ علمائے سلف کا تعامل اس پر شاہد ہے۔ کوئی وقتی ضرورت دینی، تعلیمی، تبلیغی کبھی اتفاقات کو بھی اس میں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ بقدر ضرورت مستثنیٰ ہے۔ اس کی شہادت بھی بہت سے حضرات علماء وفقہاء کے عمل سے ثابت ہے۔ (ص ۵۹۳ ج ۸)

اہل علم مسئلہ پوچھنے والے سے نرمی سے پیش آئیں:۔ "اما السائل فلاتنھر" اس میں وہ بھی داخل ہے جو کسی مال کا سوال کرے اور وہ بھی جو علمی تحقیق کا سوال کرے۔ دونوں کو جھڑکنے، ڈانٹنے سے آنحضرت ﷺ کو منع فرمایا گیا۔ بہتر یہ ہے کہ سائل کو کچھ دیکر رخصت کرے اور نہیں دے سکتا تو نرمی سے عذر کردے۔ اسی طرح کسی علمی مسئلہ کا سوال کرنے والے کے جواب میں بھی سختی اور بدخوئی ممنوع ہے۔ نرمی اور شفقت سے جواب دینا چاہئے بجز اس کے کہ سائل کسی طرح مانے ہی نہیں تو بضرورت زجر بھی جائز ہے۔ (ص ۷۶۷ ج ۸)

اہلِ علم کو خط و کتابت کا بھی اہتمام کرنا چاہئے:۔ علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء وطلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سینکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریرِ کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں۔ (ص ۷۸۶ ج ۸)

میں اس شخص کے لئے جنّت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔ (حدیث شریف) (ماہنامہ البلاغ کراچی مئی ۱۹۹۶ء)



علم اور اہلِ علم

ارشاداتِ مفتی اعظم رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ پاکستان

(منتخب از البلاغ مفتیِ اعظم نمبر)

❶ فرمایا کہ ”فتویٰ کا خاص ذوق اور ملکہ ہوتا ہے جو مفتی میں ہونا ضروری ہے اور وہ کتنی ہی کتابیں پڑھنے کے باوجود اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک برسہا برس کسی ماہر مفتی کے زیرِ ہدایت فتویٰ لکھنے کا کام نہ کیا ہو“ (ص ۲۳۷)

❷ فرمایا کہ ”حضرت شاہ صاحب“ نے ہمیں دورہ حدیث ہی کے سال میں اس بات کی تاکید فرمائی تھی کہ فارغ التحصیل ہو جانے کو کبھی منتہائے مقصود نہ سمجھنا، فراغت کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کے بعد انسان میں قوت مطالعہ پیدا ہو جاتی ہے اور علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اب یہ فارغ ہونے والے کا کام ہے کہ وہ علم کی چند کلیوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس دروازہ میں داخل ہو اور اس قوت مطالعہ کو کام میں لا کر علم میں وسعت و گہرائی پیدا کرے۔“ (ص ۲۶۸)

❸ فرمایا کہ ”فقہاءِ کرام نے محقق ابن ہمام رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ اور شاہ ولی اللہ جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلے میں بہت اہون ہے، چنانچہ اگر کبھی آپ (مفتی اعظم) کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہوتا جو معروف نقطہ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں کسی کا قول اس کے موافق مل جائے یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔“ (ص ۴۱۰)

۴ فرمایا کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کرلینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں، جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ درحقیقت فقہ کے معنی "سمجھ" کے ہیں اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔ (ص ۴۱۸)

۵ فرمایا کہ "حضرت شیخ الہند رَحمہُ اللہُ تعالیٰ فرمایا کرتے کہ "تقلیدِ شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمۂ مجتہدین برحق ہیں۔ اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لئے وزنی دلائل موجود ہیں لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کرلے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرلے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباعِ خداوندی کے بجائے اتباعِ نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔ (ص ۴۱۹)

۶ فرمایا کہ "فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس طرح مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں؟ اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہوسکتا ہے ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔" (ص ۴۲۴)

۷ فرمایا کہ "فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ باسانی حکم معلوم کرلے

اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔ فتویٰ میں عام آدمی کے لئے تو صرف حکم ہوتا ہے اور دلائل اہلِ علم کے لئے ہوتے ہیں۔'' (ص ۴۲۹)

❽ فرمایا کہ ''درس حدیث میں ''روایۃ'' اور ''درایۃ'' کی تفریق عہد حاضر کی بدعت ہے اسلاف میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے کہ بعض ابواب پر بحث کے دوران انتہا درجے کی تحقیق کا مظاہرہ کیا جائے اور بعض کو تشریح مفہوم کے قابل بھی نہ سمجھا جائے۔ اس کے بجائے درس حدیث شروع سال سے اس معتدل انداز پر ہونا چاہئے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آجائیں اور درس حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو۔'' (ص ۴۳۶)

❾ فرمایا کہ ''درس حدیث میں جو فقہی اختلافات اور ان کے مفصل دلائل بیان کئے جاتے ہیں ان کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے وہاں اصل مقصد طالب علم میں تحقیق ونظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تاکہ اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج، متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث میں صحیح وسقم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کس طرح کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں تو اس سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ آئندہ اپنی بساط کے مطابق تحقیقی کام کرسکتا ہے۔ لہٰذا ان مباحث کے دوران استاد کو چاہئے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا یا نہیں؟ استاد کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث ہوتے ہیں ان کا محفوظ ہو جانا ضروری ہے۔'' (ص ۴۳۶)

❿ فرمایا کہ ''حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''حافظ ابن حجر'' ہوں یا ''علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ'' یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی

عاقبت خراب نہ کرو۔" (ص ۴۳۷)

(۱۱) فرمایا کہ "ائمۂ مجتہدین کا اختلاف تو ہوا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رو سے دونوں راہوں کی گنجائش موجود تھی لہذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا بلا دلیل ہے بڑی نادانی کی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں کی طرف موجود ہیں اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں دلائل متعارض ہوں اس لئے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ یہ "شافعیہ" "حنابلہ" "یا مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ" کے مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہوگا کیونکہ اگر کسی مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے؟۔" (ص ۴۳۸)

(۱۲) فرمایا کہ "میں نے ۱۳۴۵ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکہ میں حدیث کے مختلف درس ہوا کرتے تھے ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی باب کی مختلف احادیث آئیں تو حدیث کے تحت فرماتے فیه حجة ساداتنا المالكية پھر اس کے مختلف دوسری حدیث آتی ہو تو فرماتے فیه حجة ساداتنا الحنفية"۔ (ص ۴۳۸)

(۱۳) فرمایا کہ "قرآن کریم کی محض تلاوت بھی بلاشبہ بہت موجب اجر ہے لیکن ایک عالم کو چاہیئے کہ وہ کچھ وقت تدبر قرآن کے لئے بھی نکالا کرے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ حشو یا زائد نہیں ہے، لہٰذا اگر غور کیا جائے تو اس کے ہر لفظ سے کسی نئے فائدے کی طرف رہنمائی مل سکتی ہے۔" (ص ۴۵۰)

(۱۴) فرمایا کہ "باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت و تبلیغ ہی کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا اس میں بھی حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلہ بالتی ہی احسن کے اصولوں پر عمل ضروری ہے، آج کل دوسروں کی تردید میں طعن و تشنیع، طنز و تعریض اور فقرے کسنے کا جو انداز عام ہو گیا ہے اس سے اپنے ہم خیال لوگوں سے داد تو وصول ہو جاتی ہے

لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد وعناد پیدا ہوجاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی۔" (ص ۴۶۴)

۱۵ فرمایا کہ "یوں تو انسان کو اپنے ہر قول وفعل میں محتاط ہونا چاہئے لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کافی مواد موجود نہ ہو۔" (ص ۴۷۰)

۱۶ فرمایا کہ "اکابر علماء دیوبند کا طریقہ یہی رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہنے کی حالت میں انہوں نے عملی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن جب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ آزادئ ہند کے سلسلے میں تحریکات خلافت میں مؤثر حصہ لینے لگے تو دارالعلوم دیوبند سے الگ ہوگئے۔" (ص ۴۷۲)

۱۷ فرمایا کہ "علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اربابِ اقتدار اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ "ملا" اقتدار چاہتا ہے، میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کبھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے، لیکن ارباب اقتدار کو تھوڑا سا ملا بنانا ضرور چاہتے ہیں۔" (ص ۴۷۴)

۱۸ فرمایا کہ "اگر صرف علم کسی شخص کی عظمت کے لئے کافی ہوتا تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے، اور وہ مستشرقین جو دن رات علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں، وہ بھی بہت سے مسلمان اہل علم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے علم کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے جو انسان کو ایمان کی دولت نہ بخش سکے، اسی طرح جو علم انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو، وہ بیکار ہے۔" (ص ۴۹۰)

۱۹ فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میں نے تحصیلِ علم میں نہ تو محنت زیادہ کی ہے اور نہ بہت سی کتابیں میرے مطالعہ میں رہیں۔ بس اتنا اہتمام کیا کہ اپنے کسی بھی استاد کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ سے ناراض نہیں

ہونے دیا۔ یہ سب اسی کی برکت ہے کہ اللہ نے دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اکثر اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھتے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

(ص ۸۹۷)

۲۰ فرمایا کہ ”حضراتِ فقہاء نے من لم یعرف عرف زمانه فهو جاهل. (یعنی جو اپنے زمانہ کے رسم ورواج وغیرہ سے واقف نہ ہو وہ فقیہ نہیں ہوسکتا بالکل صحیح فرمایا ہے)“۔ (ص ۹۰۱)

۲۱ طلباء واساتذہ سے فرمایا کہ ”آپ کو ملکی سیاست کا علم ہونا ضروری ہے البتہ جب تک علمی مشغلہ میں مصروف ہیں اس وقت تک عملی سیاست میں قطعاً حصہ نہ لیں اور نہ کسی دوسری تنظیم کے رکن بنیں، کیونکہ اس سے تحصیلِ علم میں خلل واقع ہوگا۔“ (ص ۹۰۱)

۲۲ فرمایا کہ ”قرآن عظیم میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ جو طائفہ علم دین حاصل کرنے کے نام پر جمع ہوا ہے اس کا کام یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے اور سمجھ بوجھ اس کو کہا جائے گا جبکہ اس علم کے ساتھ عمل بھی ہو، جس علم کے ساتھ عمل نہ ہو، وہ دین کی سمجھ بوجھ نہیں کہلاتی۔ ایسا علم تو شیطان کو بھی ہے۔“ (ص ۹۰۷)

۲۳ فرمایا کہ ”تم شروع سال ہی سے اپنی نیت کو درست کرلو اپنی نیت یہ رکھو کہ ہم جو کچھ پڑھ لکھ رہے ہیں۔ اس سے رضائے خداوندی حاصل کرنا ہے اگر اس مقصد کو مدنظر رکھ کر تم نے تعلیم کی ابتداء کی تو انشاءاللہ تم کو پڑھنے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ اگر خدانخواستہ یہ علم پڑھنے سے کوئی اور ارادہ ہے مثلاً یہ کہ لوگ تمہاری عزت کریں، تمہیں مفتی صاحب کہیں اور تمہارے بالوں اور قدموں کو بوسہ دیں۔ اگر یہ نیت ہے تو فوراً توبہ کرو اور اپنی نیت کو فوراً صحیح کرو۔“ (ص ۹۰۸)

۲۴ طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''وہ تقریر کرنے کی مشق کیا کریں۔ فرمایا کہ مولویوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کو تقریر کرنی آتی ہو۔ فرمایا کہ ایک اچھا واعظ اور مقرر بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہر واعظ قرآن حکیم کی اس آیت کو ملحوظ رکھے۔ ادع الی سبیل ربك بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتی هی احسن'' (ص ۹۱۲)

۲۵ طلبہ سے فرمایا کہ عصر کی نماز کے بعد کھیل وغیرہ ہلکی ورزش کا اہتمام کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو چہل قدمی ہی کی جائے۔ اس سے انشاء اللہ صحت اچھی رہے گی اور پڑھائی وغیرہ میں دل لگے گا۔ اور انسان دلجمعی کے ساتھ رات کے وقت مطالعہ کرسکے گا۔ فرمایا کہ چہل قدمی کے لئے بازار یا مارکیٹ یا پارکوں کا اہتمام نہ کرنا چاہئے' کیونکہ اس میں بہت خرابی ہے، اول یہ کہ بازار وغیرہ جاکر انسان خواہ مخواہ کے گناہوں کا مرتکب ہوجاتا ہے اور بازاروں اور پارکوں وغیرہ سے دل مردہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے اہل علم کو ایسے مقامات پر خواہ مخواہ جانا مناسب نہیں۔ ہاں بقدر ضرورت اگر کسی کام سے جائے تو چاہئے کہ فوراً لوٹ آئے۔

۲۶ فرمایا ''عزیزو! ایک عرصہ سے مدارس عربیہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ سب سے پہلے مدارس میں روحانیت کی کمی واقع ہونی شروع ہوئی۔ مگر تعلیمی استعداد پھر بھی اچھی تھی۔ مگر اب یہ افتاد آگئی ہے کہ عادات و اعمال کے ساتھ ساتھ تعلیمی استعداد بھی گرتی جارہی ہے اور اب مدارس بالکل بانجھ ہوگئے ہیں کہ اب بہت ہی کم اللہ والے علماء فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں۔'' (ص ۹۱۳)

۲۷ فرمایا کہ ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا علم ہمیشہ باقی اور تازہ رہے اور اس میں دن رات اضافہ ہو تو تم کو چاہئے کہ اپنے اندر عمل پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ فرمایا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی پیر کامل اور شیخ کامل کی صحبت اختیار کی جائے اور اس سے اپنی اصلاح باطن کروائیں۔'' (ص ۹۱۳)

۲۸ فرمایا کہ ”جہل کا اعتراف بھی علم کا ایک حصہ ہے اور پھر امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ سنایا کہ وہ فرمایا کرتے ”علموا اصحابکم قول لاادری“ اپنے ساتھیوں کو لاادری (میں نہیں جانتا) کہنا بھی سکھاؤ۔“ (ص۱۱۰۵)

۲۹ فرمایا کہ ”دینی خدمت کے میرے سامنے اور بھی طریقے اور راستے تھے لیکن میں نے فتویٰ کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی سوچ سمجھ کر بنایا اس لئے کہ اس کا نفع نقد ہے اور دوسرے طریقوں میں ایسا نہیں۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص صرف تصنیف وتالیف کو اپنا مقصد زندگی بنالے اور کتابیں لکھا کرے تو اس کا نفع مصنف کو اسی وقت حاصل ہوگا جب کوئی اس کی کتاب کو پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا اور معلوم نہیں کہ ایسا ہوگا بھی یا نہیں۔“ (ص۱۱۱۱)

۳۰ فرمایا کہ ”مفتی کو ہمیشہ اس امر کا خصوصی طور پر خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے فتویٰ سے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہوجائے۔ نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا چاہئے۔ کتب کی طرف مراجعت کے ساتھ ساتھ موقع اور محل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ فقہاء نے فرمایا ہے من لم یعرف اہل زمانہ فھو جاھل“ (ص۱۱۶۸)

۳۱ فرمایا کہ ”مفتی کو چاہئے کہ جن مسائل کا تعلق اپنی ذات سے ہو ان مسائل میں دوسرے علماء سے استفسار کرے اپنے نفس پر اعتماد نہ کرے کیونکہ نفس کے کید خفی کا اندیشہ ہے۔“ (ص۱۱۶۹)

۳۲ فرمایا کہ ”میری زیادہ تر یہ خواہش رہتی ہے کہ مدرسہ میں چند اللہ والے جمع ہوجائیں اگرچہ زیادہ محقق نہ ہوں۔ جس مدرس کا مقصود تنخواہ لینا ہو اس کو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی اصطلاح میں پیشہ ور مولوی فرمایا کرتے تھے۔ (ص۱۱۷۰)

۳۳ ایک دفعہ فرمایا کہ بعض مدرسین مدرسہ سے تنخواہ تو پوری وصول کرلیتے ہیں مگر مدرسہ کی طرف سے جو کام ان کے ذمہ ہوتا ہے اس کو پورا نہیں کرتے۔ کبھی سبق میں دیر سے پہنچتے ہیں، کبھی بلاوجہ سبق کا ناغہ کردیتے ہیں کبھی سبق میں بے ضرورت

اور بے فائدہ باتیں کرتے ہیں۔ جس سے سبق کی کمیت اور کیفیت کا نقصان ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں امانت و دیانت کے خلاف ہیں۔ خیانت اور تطفیف میں داخل ہیں۔" (ص ۱۱۷۱)

۳۴ فرمایا کہ "مدرسہ کی ضروریات کی اہلِ خیر کو عمومی اطلاع دے دی جایا کرے یا ان مخصوص حضرات کو اطلاع کر دی جائے جو ایسے مواقع خیر کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر چندہ کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے اہل علم کی بے وقعتی ہو۔" (ص ۱۱۷۷)

۳۵ فرمایا کہ "میرے خیال میں مولوی وہ ہے جس میں اس قدر استعداد ہو کہ ہدایہ کی چاروں جلدوں میں جو جگہ اس کو بتلائی جائے اس کو حل کر کے سمجھا اور پڑھا سکے۔" (ص ۱۱۸۰)

۳۶ فرمایا کہ "بقسم کہتا ہوں کہ میں نے ایک عالم بھی ایسا نہیں دیکھا کہ جس نے اللہ کے لئے پڑھا اور پڑھایا ہو اور اللہ نے اس کو عزت و راحت کی زندگی عطا نہ کی ہو۔ اگر عالم ہو کر کوئی رسوا ہوا تو اپنی بدعملی سے ہوا۔" (ص ۱۱۸۰)

۳۷ فرمایا کہ "طلباء کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے اور اس دور میں سہل پسندی اور کاہلی سے کام لیکر اپنی عمر کے قیمتی حصے کو برباد کر دیتے ہیں، یاد رکھو! ایک ایک لمحہ آپ کا قیمتی ہے اس کو یوں ہی نہ گزارو۔" (ص ۱۱۸۷)

۳۸ فرمایا کہ "جو استاد کسی مدرسے میں پڑھ رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے۔ اول تو اس میں "سوم علی سوم اخیہ" کا گناہ ہے دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہو گئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات فرماتے وہ یہ تھی کہ "اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو

دارالعلوم حاضر ہے۔" (ص۵۱۹)

۳۹ فرمایا کہ "حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ" کی وصیت کے مطابق جب تک دینی مدارس توکل استغناء اور للّٰہیت پر کاربند رہیں گے، ان کا کام انشاء اللہ بابرکت ہوگا اور اہل علم سے دنیا کو فائدہ پہنچے گا، لیکن جب اہل علم بھی توکل، استغناء سے محروم ہوجائیں اور اہل ثروت پر ان کی نگاہ جانے لگے تو ان کی تعلیم وتبلیغ بھی انوار وبرکات سے خالی ہوجائے گی۔" (ص۵۲۱)

۴۰ حضرت والا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (حضرت مفتیٔ اعظم) نے تمام منتظمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ "ہم نے دارالعلوم کی شکل میں کوئی دکان نہیں کھولی بلکہ خدمت دین کا ایک ادارہ قائم کیا ہے جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق چلاسکیں چلائیں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کردینا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اسے غلط اصولوں پر چلایا جائے۔" (ص۵۲۱)

۴۱ فلسفہ اور عقلیات کی حقیقت اور اس کے "پائے چوبیں" کی ناپائیداری حضرت والا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر روز روشن کی طرح واضح تھی لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے اور اسکی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل درس سے نکال دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جو ہمارا اگرانقدر علمی سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن وفکر کو جلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے اور اس طرح یہ علوم تفسیر حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوتے

ہیں۔ حضرت والا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشین کرکے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے گی' اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخل درس کیا تھا۔ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہو تو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں' دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں' اور دونوں کی خدمت موجب اجر وثواب ہے۔"

(ص ۳۹۱)

۴۲ فرمایا کہ "مدرس لمبی چوڑی تقریر کرکے سمجھتا ہے کہ میں نے سبق کا حق ادا کردیا کتاب سمجھادی اور میرا حق ادا ہوگیا اور اسی طرح طالب علم سمجھتے ہیں کہ اب امتحان میں پاس ہوجائیں گے یا مدرس بن جائیں گے یہ کافی نہیں ہے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ مدرس اور طالب علم جو کچھ پڑھتے پڑھاتے جائیں ان پر عمل بھی کرتے جائیں اگر عمل کرلیا تو واقعی کتاب کا حق ادا کرلیا۔ اس لئے عمل کرنے اور کروانے کی نیت سے پڑھنا پڑھانا چاہئے"۔ (ص ۹۶۷)

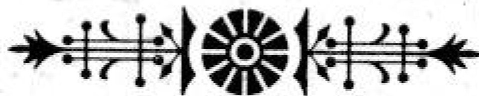
۴۳ ایک مرتبہ طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "میں اپنی اسی سالہ زندگی کا نچوڑ اور حاصل آپ کو بتلاتا ہوں اس کو توجہ سے سنو! یہ خلاصہ ساری دنیا دیکھ کر اور دنیاداروں کا تجربہ کرکے اور زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ دیکھ کر بیان کررہا ہوں' وہ یہ ہے کہ آپ جس کام میں لگے ہیں (یعنی تعلیم وتعلم) اگر یہ خلوص کے ساتھ محض حق تعالیٰ شانہ کی رضا کے لئے ہے تب تو یہ ایسا عظیم الشان کام ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کے برابر نہیں یہ سب سے بہتر اور افضل ہے اور اگر خدانخواستہ مقصود اس سے رضائے الٰہی نہیں، دنیا کمانا پیش نظر ہے جیسا کہ آج کل یہ کام صرف ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے تو میرے عزیزو! پھر دنیا میں اس سے بدتر کوئی کام نہیں۔ (العیاذ باللہ)" (ص ۹۸۲)

۲۴ فرمایا کہ ”میں مدرسین میں محققین تلاش نہیں کرتا، جو شخص کتاب اچھی طرح سمجھادے اسی سے کام چلالیتا ہوں، آدمی مدرس ہو، مفہم ہو، صالح ہو مفسد نہ ہو۔ بس یہ کافی ہے اگر محقق ہو اور مفسد ہو تو مدرسہ اور طلبہ کا علم وعمل سب تباہ ہو جائے گا۔“ (ص ۹۹۲)

۲۵ فرمایا کہ ”دارالعلوم کا وہ زمانہ تھا کہ مہتمم سے لیکر دربان اور چپڑاسی تک ہر شخص صاحب نسبت تھا۔“ (ص ۹۹۳)

۲۶ ختم بخاری شریف پر فرمایا ”آج ہمیں اپنے پورے سال کی محنت کا نتیجہ دیکھنا ہے اور سال بھر جو چکی پیسی اس کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حاصل کیا ہوا، اور اس موقع پر حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”**جعجعة ولا طحين**“ نقل فرمایا کرتے تھے یعنی چکی تو چلالی اب یہ دیکھو کہ آٹا بھی ہے یا نہیں؟ فرماتے تھے کہ سال بھر کی محنت سے چند آدمی تیار ہوتے ہیں لیکن ان کو جو سند دی جائے گی دنیا میں اس کی دو پیسے کی بھی قیمت نہیں، اس کے علاوہ کالج و یونیورسٹی میں کوئی ملازمت نہیں مل سکتی اور درحقیقت ہمارے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کو چاہئے بھی یہی کہ مدرسوں ہی میں زندگیاں گزاردیں دوسری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اللہ کے یہاں علوم قرآن وحدیث کی قدر ہے، بس ہمیں وہی چاہئے، اہل دنیا کی ملازمت کی ہمیں ضرورت ہی کیا؟“

(ص ۹۹۶) (ماہنامہ البلاغ کراچی فروری/مارچ ۱۹۹۶ء)



مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض اہم ملفوظات

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ کان میں شور وغل کی آواز آنا بھی ایک عذاب ہے اور بہت بڑی تکلیف ہے، دیکھو حدیث شریف میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خدیجہ کو اس کے رب کی طرف سے سلام فرما دیجئے اور جنت میں ان کے لیے ایک ایسے گھر کی خوشخبری دیجئے جو موتی کا ہوگا اور جس میں نہ شور وشغب ہوگا نہ کوئی تھکان ہوگی۔[1] معلوم ہوا کہ شور وغل کی آواز سے محفوظ رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

بارہا فرمایا کہ جب معدہ کمزور ہوجاتا ہے (یعنی بڑھاپے میں) تو دانت بھی اکھڑ جاتے ہیں، اس میں اللہ جل شانہ کی بہت بڑی حکمت ہے کہ جو شخص بے تکا کھانے اور چبانے کا شوقین ہو اور اپنے اختیار سے معدہ پر رحم نہ کرے تو دانتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر تھوڑا کھائے اور نرم غذا استعمال کرے اور اس طرح معدہ ظلم وزیادتی سے محفوظ رہے۔[2] اکثر فرماتے تھے کہ میں مدرسین میں محققین تلاش نہیں کرتا جو شخص اچھی طرح سمجھاوے اسی سے کام چلا لیتا ہوں آدمی مدرّس ہو، مُفَهِّم ہو،

[1] اخرجه الشيخان كمافي المشكوة ۵۷۳۔

[2] اس بات کو اکثر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو دو چکیاں عطا فرمائی ہیں ایک پیٹ میں یعنی معدہ، اور دوسری منہ میں یعنی دانت اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ہے کہ جب بڑھاپے میں اندر کی چکی خراب ہوتی ہے تو باہر کی چکی کو بھی ناکارہ کر دیا جاتا ہے۔

صالح ہو، مفسد نہ ہو، بس یہ کافی ہے اگر محقق ہوا اور مفسد ہوا تو مدرسہ اور طلبہ کا علم وعمل سب تباہ ہو جائے گا۔

اکثر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے ہم کو خطاب کر کے فرمایا کہ آدمی تو نہ تم ہو، نہ ہم ہیں البتہ اتنا فرق ہے کہ ہم نے آدمی دیکھے ہیں (یعنی اہل اللہ کو پایا ہے) اور تم نے آدمی دیکھے نہیں، اگر ہم کو کوئی بیل بہکانا چاہے اور کہے کہ میں آدمی ہوں تو اس کے بہکانے میں ہم نہیں آسکتے، تم لوگ دھوکہ کھا سکتے ہو۔

بارہا ارشاد فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وہ زمانہ تھا کہ مہتمم سے لے کر دربان اور چپڑاسی تک ہر شخص صاحب نسبت تھا۔

فرمایا: شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مہتمم اول دارالعلوم دیوبند عالم نہیں تھے مگر ان کا علماء سے کام لینے کا طریقہ عجیب تھا، جب دیکھا کہ اساتذہ دیر سے مدرسہ آرہے ہیں مدرسہ کے دروازہ پر چارپائی بچھا کر ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھ جاتے، ایک دو دن جو اساتذہ کا ادھر سے گذر ہوتا تو شرما جاتے اور وقت پر آنا شروع کر دیتے تھے، اگر کسی مدرس نے اس طرح بھی وقت پر آنا شروع نہ کیا تو اس سے تنہائی میں فرماتے کہ مولانا آپ مشغول آدمی ہیں، گھربار کی مشغولیتوں میں اور سودا سلف لانے میں دیر ہو جاتی ہے جس سے طلبہ کا حرج ہوتا ہے اور میں بالکل بیکار ہوں آپ بازار کا کام مجھے بتا دیا کریں یہ خدمت میں کر دیا کروں گا جس سے آپ کا وقت بچ جائے گا۔ اس کے بعد کسی کو دیر سے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

فرمایا: لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (دارالعلوم دیوبند کے اولین شیخ الحدیث) کا دیر سے آنا برابر جاری رہا ان کی مشغولیتیں خانگی تو نہ تھیں بلکہ تعویذ لینے والے اور مریدین آجاتے تھے جس سے دیر ہو جاتی تھی، جب کسی طرح قابو نہ پایا تو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو گنگوہی کو لکھا، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے

مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کوتنہائی میں خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ قیامت میں اس وقت کی پوچھ ہوگی جو آپ نے مدرسہ میں دیا ہے یہ جو لوگ گھیر لیتے ہیں ان کو مدرسہ کے وقت کے علاوہ دوسرا وقت دیں اور بزرگی کے گھمنڈ میں نہ رہیں اور مہتمم صاحب سے فرمایا کہ آپ اس شخص کی دیر سے آنے کی شکایت کرتے ہیں اگر یہ شخص مدرسہ میں ذرا سی دیر کو آ کر یوں ہی ذرا سا گھوم پھر کر چلا جائے اور اس کو ہزار روپے تنخواہ دی جائے تب بھی کم رہے گی۔(اس زمانہ میں عموماً ۱۵،۲۰ روپے تنخواہ ہوتی تھی)۔

فرمایا: جب ہم نے ہوش سنبھالا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند میں سب سے بڑے تھے، یہ سادگی کا زمانہ تھا بڑے بڑے القاب استعمال نہیں ہوتے تھے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کو عموماً سب ہی لوگ ''مولوی صاحب'' کہتے تھے، شیخ الہند مالٹا سے واپس ہونے کے بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ مشہور ہوا۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الہند قدس سرہ کی سادگی اور بے نفسی کے کئی قصے سنایا کرتے تھے، جن میں سے ایک واقعہ یہ سنایا کرتے کہ دیوبند اور اس کے آس پاس کے شہروں اور قصبوں کے رواج کے مطابق سردی کے زمانہ میں مسجد میں گھاس بچھائی جاتی تھی، یہ گھاس سردی میں گرم رہتی ہے، دیوبند کے ایک تالاب کے کنارہ پر یہ گھاس بہت ہی کھڑی تھی۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے بعض طلبا سے فرمایا کہ چلیں تالاب پر غسل کریں گے وہاں پہنچ کر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے غسل کرتے ہوئے بہت سی گھاس کاٹ لی اور جگہ جگہ گڈیاں بنا کر رکھ دیں پھر ایک گڈی اٹھا کر سر پر رکھ کر یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ میں تو اپنا حصہ لے چلا، اس کا مطلب دوسرے حضرات بھی سمجھ گئے اور سب نے ایک ایک گڈا اٹھایا اور مسجد تک پہنچا دیا۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ الہند کے محلہ کی مسجد کا واقعہ ہے۔ [1]

[1] یہ واقعہ حضرت نے اپنے ہم سبق مولانا مغیث الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا تھا اور اُن کو براہ راست مولانا معین الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سنایا۔ (مدیر)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میں نے فارغ ہونے کے بعد مدرسی کے ابتدائی عہد میں ایک رسالہ ''آداب المساجد'' کے نام سے لکھا تھا اور سبق کے ایک ساتھی جو بہت ذی استعداد تھے وہ دارالعلوم سے فارغ ہوکر اور کسی جگہ تدریس میں مشغول ہوگئے انہوں نے مؤطا کے کچھ حصہ کی بہت محقق شرح لکھی جب مجھ سے ملنے آئے تو میرا رسالہ دیکھ کر بہت بے تکلفی کی وجہ سے کہنے لگے کہ تو نے کیا ذرا سی کتنی لکھی ہے اور وہ بھی اردو میں ہے، دیکھ میں نے یہ مؤطا کی شرح لکھی ہے'' میں نے کہا کہ میری کتاب انشاء اللہ بہت مفید ہوگی اور اس سے بہت نفع پہنچے گا اور تیری تصنیف یونہی دھری رہ جائے گی (چنانچہ ایسا ہی ہوا مفتی صاحب کا رسالہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں بار ہا ہندوپاک میں چھپتا رہا ہے اور ان صاحب کی شرح کا کہیں وجود نہیں، بات یہ ہے کہ جہاں تصنیف سے علمی شان ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اوّل تو وہ کتاب پوری ہی نہیں ہوتی اور اگر پوری ہو بھی جائے تو مقبولیت کی شان اُسے نہیں ملتی)۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی پند و نصیحت کے لیے دارالعلوم کی مسجد میں اساتذہ و تلامذہ کو خطاب فرمایا کرتے تھے، بار ہا نماز میں مسبوق ہوجانے پر تنبیہ فرماتے تھے اور جو لوگ وضو کر کے باتوں میں یا منہ پونچھنے میں مشغول رہ جاتے اور یہ سمجھتے کہ رکوع سے پہلے پہلے مل جائیں گے اُن سے فرماتے تھے کہ جیسے ہی آؤ، امام کے ساتھ نماز میں مل جاؤ، جتنی نماز نکل جائے گی اُس کا ثواب کم ہو جائے گا اور اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد مؤطا امام مالک سے نقل فرماتے تھے کہ **ومن فاته قراءة ام القران فقد فاته خير كثير** (یعنی جس سے سورۃ فاتحہ کی قراءت چھوٹ گئی تو اُس سے بہت زیادہ خیر فوت ہوگئی)۔

شروع سال میں بخاری شریف کا افتتاح فرماتے تھے اور یہی مدرسہ کے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا تھا اس موقعہ پر اساتذہ اور تلامذہ کو بہت سی نصیحتیں فرماتے تھے، عموماً اس تقریر میں یہ مضمون بھی ہوتا تھا کہ ''میں مدرسین کرام کی دار و گیر نہیں کرتا بلکہ انکی

دیانت پر چھوڑتا ہوں، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ اہل علم کا محاسبہ کروں اور وقت کی کمی پر تنخواہ وضع کروں، [۱] البتہ ان حضرات سے گزارش کرتا ہوں کہ بطور خود پورا وقت دینے کا اہتمام کریں جس طرح خرید وفروخت میں تطفیف قابل مواخذہ ہے، اسی طرح دیگر معاملات اجارہ واستجارہ وغیرہ میں تطفیف جرم ہے" تنخواہ پوری لیں اور وقت کم دیں یا کام پورا نہ کریں یہ بھی اِذَا کْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ میں شامل ہے، اس سلسلہ میں مؤطا کی یہ عبارت بھی نقل فرمایا کرتے تھے یقال لکل شیئی وفاء وتطفیف۔ [۲]

بخاری شریف کے ختم پر بھی کچھ باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے ان میں سے ایک بات یہ فرماتے کہ آج ہمیں اپنے پورے سال کی محنت کا نتیجہ دیکھنا ہے۔ اور سال بھر جو چکی پیسی اس کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حاصل کیا ہوا اور اس موقع پر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد جعجعۃ ولا طحین نقل فرمایا کرتے تھے یعنی چکی تو چلالی اب یہ دیکھو کہ آٹا بھی ہے یا نہیں، فرماتے تھے کہ سال بھر کی محنت سے چند آدمی تیار ہوتے ہیں لیکن ان کو جو سند دی جائے گی دنیا میں اس کی دو پیسے کی بھی قیمت نہیں اس کے علاوہ کالج ویونیورسٹی میں کوئی ملازمت نہیں مل سکتی اور درحقیقت ہمارے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کو چاہئے بھی یہی کہ مدرسوں ہی میں زندگیاں گزار دیں دوسری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اللہ کے یہاں علوم قرآن وعلوم حدیث کی قدر ہے بس ہمیں وہی چاہئے۔ اہل دنیا کی ملازمت کی ہمیں ضرورت ہی کیا۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی عمر کا اکثر حصہ علم دین کے طلباء میں گزارا ہے اور اب آخری عمر میں مدرسہ کھولا ہے اور اس کے باوجود کہ علماء اور طلباء

[۱] آخر میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے دار العلوم میں تنخواہ وضع کرنے کا ضابطہ بھی بنادیا تھا، لیکن اس طرح کہ ہر مدرس اپنی تاخیر کی مقدار خود ہی تحریر کر کے دیا کرے، اس کے مطابق تنخواہ وضع کرائے، چنانچہ اب اسی پر عمل ہوتا ہے۔ (مدیر)

[۲] یہ عبارت اوائل مؤطا مالک میں موجود ہے۔

بہت کچھ بدل گئے ہیں (اس موقعہ پر ان کی بے علمی کا تذکرہ فرماتے تھے) پھر بھی کوئی دوسری جماعت ایسی نہیں پاتا جس کو ان پر ترجیح دوں۔ اور ان کو چھوڑ کر اُن کے ساتھ رہوں۔

بار ہا ارشاد فرمایا کہ ایک بار حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ مولوی وصی اللہ کو جانتے ہو (حضرت تھانویؒ کے مشہور خلیفہ جن سے ہندوستان میں بہت فیض پہنچا اور سفر حج میں بحری جہاز میں وفات پائی) اس سوال کے جواب میں میری زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

ماو مجنون ہم سبق بودیم درسندان عشق
او بصحراء رفت ومادر کوچہ ہا رسوا شدیم

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے سامنے شعر پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی مگر اس موقعہ پر یہ شعر بے ساختہ زبان سے نکل گیا۔

اس پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "میاں یوں ہی ہوتا ہے کسی کو صحرا دیا جاتا ہے اور کسی کو سہرا دیا جاتا ہے۔

(یعنی کسی عاشق کو صحرا نوردی ملتی ہے اور کسی کو نوشہ بنایا جاتا ہے، محبوب حقیقی کسی کو جذب وکیف اور مستی عطا فرماتا ہے اور کسی کو ہوش وگوش عطا فرماتا ہے اور شریعت وطریقت کی خدمت کا سہرا اس کے سر باندھتا ہے)۔

ایک صاحب تشریف لائے جو اکثر آیا کرتے تھے اس مرتبہ ان کا ایک بیٹا بھتیجا وغیرہ بھی ساتھ تھا اس کا تعارف کراتے ہوئے کہ یہ ڈبل ایم اے ہیں اور فلاں بینک میں اونچے عہدہ پر ہیں یہ سن کر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناگواری ہوئی اور بینک کی ملازمت کو جو انہوں نے بطور کمال اور ترقی کے ذکر فرمایا اس پر بہت ملامت فرمائی ایک تو حرام ملازمت پھر اوپر سے اس پر فخر؟ سراسر جہالت کی بات ہے۔

فرمایا کہ میں نے آٹھ سال ماہانہ ''المفتی'' نکالا، مضامین لکھنے سے لے کر ڈاک میں ڈالنے تک سارا کام خود ہی کرتا تھا اور کوئی مددگار یا ملازم نہ تھا، خود کوزہ اور خود گلِ کوزہ کا مصداق تھا۔ ساتھ ہی دارالاشاعت کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ بھی جاری کیا تھا، بسلسلۂ خریداریٔ کتب اکثر دہلی جانا ہوتا تھا، دہلی میں ایک مرتبہ حافظ عبدالغنی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی جو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے کتب خانہ میں شریک تھے اس کا نام کتب خانہ رحیمیہ تھا جو پہلے سنہری مسجد دہلی کے نزدیک تھا پھر اُردو بازار دہلی میں چلا گیا، حافظ صاحب موصوف کو جب یہ علم ہوا کہ میں تاجر کتب ہوں تو فرمایا ''میاں تم کس کام میں لگے ہو؟ کتابوں کی تجارت پتھر کا اچار ہے اِس کے لیئے عمر نوح علیہ الصلاۃ والسلام اور صبر ایوب علیہ الصلاۃ والسلام چاہئے۔ (مطلب یہ تھا کہ کتابوں کی نئی دوکان چلانے کے لیے عرصہ دراز تک صبر کرنا پڑتا ہے خصوصاً جب کہ نئے مصنف کی کتابیں شائع کرنا ہو تو مصنف اور اس کی کتابوں کی شہرت ہونے تک بڑے صبر آزما دن کاٹنے پڑتے ہیں)۔

دارالعلوم کراچی کے زیر انتظام جناب الحاج محمد یوسف صاحب سیٹھی مرحوم کے تعاون سے مکاتب قرآنیہ جاری ہیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انتظام احقر کے سپرد کر رکھا تھا۔ مدرسین کی بے عنوانیوں پر کبھی طبعی طور پر بہت زیادہ ناگواری ہو جاتی تھی اور سخت سرزنش کے بعد بعض مدسین کو معزول کرنا پڑتا تھا، اس سلسلہ میں ایک دن تنہائی میں احقر سے فرمایا کہ علیحدہ کرو اور ساتھ ہی سخت کلامی سے بھی پیش آؤ یہ ٹھیک نہیں۔ اس میں دو سختیاں جمع ہو جاتی ہیں کام کرنے کا اصول یہ ہے کہ جس کے ساتھ معاملہ سخت کرنا ہو (مثلاً عارضی ملازمت کے بعد مستقل کرنا یا تنخواہ بڑھانا ہو) اس کے ساتھ بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت زبانی سرزنش اور زجر و توبیخ روا ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے اصحاب کہف کے سلا دینے کا ذکر فرماتے ہوئے یہ فرمایا:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا،

سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا۔

اس موقعہ پر آنکھوں کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ کانوں کا ذکر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آنکھیں بند ہو جانے پر سو جانا ضروری نہیں ہے یہ تو بیدار ہوتے ہوتے بھی بند ہو جاتی ہیں اور ان کے اوپر پلکوں کا پردہ موجود ہے جو انسان کے اختیار میں ہے چاہے بند کرے چاہے کھولے، لیکن گہری نیند وہی ہوتی ہے جو کانوں پر بھی پردہ ڈال دیتی ہے، پاس بیٹھنے والے کچھ ہی باتیں کرتے رہیں سونے والا نہیں سن پاتا، اور جب جگانا ہو تو آواز دے کر جگاتے ہیں اور بلند آواز سے خود ہی آنکھ کھل جاتی ہے، پس معلوم ہوا کہ گہری نیند کا تعلق آنکھوں سے تو ہے ہی مگر زیادہ تعلق کانوں سے ہے، جب سننا بند ہو جائے تو سمجھو کہ سونے والا واقعی سو گیا۔ اللہ جل شانہٗ نے کانوں پر پردہ نہیں رکھا ہے اگر کانوں پر پردہ ہوتا اور انسان سوتے وقت اس کو ڈال لیا کرتا تو اس کا جگانے میں بڑی دشواری ہوتی ہے، سوتے وقت کانوں میں بس نیند کا پردہ ہوتا ہے جو آواز دینے سے ختم ہو جاتا ہے۔ [1]

دارالعلوم کے ایک عربی مدرس نے جو حافظ بھی تھے، رمضان المبارک میں ایک جگہ قرآن مجید سنایا اور ختم کے دن تقریر کے لیے حضرت مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعالیٰ کو لے گئے یہ صاحب جلدی ختم کرنے اور تیزی سے پڑھنے کی وجہ سے مثل دیگر قراء کے سورۂ فاتحہ میں نَسْتَعِيْنُ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پڑھتے تھے یعنی نُ

[1] اس ملفوظ کی مناسبت سے احقر کو اپنے استاد مولانا الحاج محمد اسعد اللہ صاحب رامپوری مدظلہم، ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کا ایک ملفوظ یاد آ گیا آپ نے فرمایا کہ سننا کانوں سے نہیں ہوتا بلکہ آنکھوں سے ہوتا ہے اور اس بارے میں یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ اَلْاِسْتِمَاعُ فِى الْعَيْنَيْنِ مطلب اس کا یہ ہے کہ تقریر کرنے والے کی طرف آنکھیں متوجہ رہتی ہیں اگر آنکھوں کی توجہ ہٹ جائے تو کان صحیح اور پوری بات نہیں سنتے۔

کے پیش کو ہمزہ وصل حذف کر کے ھاء سے ملا دیتے تھے، حضرت کو اس سے ناگواری ہوئی اور دار العلوم میں آ کر مکروہ لہجہ میں اس پر تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ یہ وصل ذوقِ سلیم پر بار ہے، اس سے بہت تکلیف ہوئی (مطلب یہ تھا کہ ہمزہَ وصل حذف کر کے وصل کر دینا گو قواعد وصل کے مطابق صحیح ہو گیا لیکن چونکہ اِهْـدِنَـا سے نئی بات شروع ہے اس لیے وصل کرنا معنوی اعتبار سے مناسب نہیں ہے اسی لیے علمائے کرام نے نَسْتَعِيْنُ پر وقف کی علامت ''ط'' لگائی ہے)

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تجویز اور تحریک پر میں نے دار العلوم دیوبند میں حدیث کے اسباق شروع کئے تھے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سیاسی اختلافات کے باوجود یگانگت میں فرق نہیں آیا۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ ذکر فرماتے تھے اور وہ یہ کہ حضرت مدنی قدس سرہ چمڑے کے علاوہ دوسرے موزے پہنتے تھے جو موٹے تھے اور ان پر مسح کرتے تھے۔ میں ان پر مسح جائز نہیں سمجھتا تھا، حضرت مدنی کو میرا اختلاف معلوم ہوا تو فرمایا میں دار الافتاء میں آؤں گا، فقہاء کی تصریحات دیکھ کر فیصلہ ہو گا، دوسرے دن آپ دار الافتاء میں تشریف لائے اور کتب فقہ سے اپنی تائید میں روایات اور عبارات نکالیں لیکن میری تشفی نہ ہوئی حضرت اپنی رائے پر قائم رہے اور میں اپنی رائے پر، ان ہی ایام میں کسی مکان پر اساتذہ کا عصر کے بعد اجتماع ہوا، مغرب کا وقت قریب ہوا تو حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے موزوں پر مسح فرمایا، اور ساتھ ہی احقر سے فرمایا کہ ''مفتی صاحب تو اس مسح کو جائز نہیں کہیں گے'' میں نے بے تکلفی سے عرض کیا ''جی ہاں، اور آپ کے پیچھے اس وقت نماز نہیں پڑھوں گا'' حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت متانت اور بے تکلفی سے فرمایا: ''آپ کے پیچھے ہماری نماز ہو جائے گی لہٰذا آپ امام بن جائیں ہم سب مقتدی ہو جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا میں نے امامت کی اور حضرت نے دیگر رفقاء کے ساتھ اقتداء فرمائی۔

یہ بھی فرماتے کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے لوگوں نے جلسے کرنا اور اسٹیج پر آنا اور الیکشن کے لیے دورے کرنا تو سیکھ لیا۔ لیکن ان کے اندر جو باطنی کمالات تھے ان کے حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔

فرمایا دار العلوم دیوبند میں جب میں مفتی مقرر ہوا تو ہر سوال کے جواب کے لیے تمام موجودہ کتب دیکھتا تھا اور بڑی محنت سے سات سال کام کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے اس کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا بہت سخت کام ہے، یہ پریشانی اپنے مرشد و مربی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کی تو حضرت قدس سرہٗ نے ہمت بندھائی اور تسلی دے کر فرمایا کہ لگے رہو، اللہ مدد فرمائے گا۔

فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ فارغ التحصیل مولوی ہونا اور مفتی ہونا ایک ہی بات ہے اور کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کتابوں سے جزئیات نکال لینے سے مفتی ہو جاتا ہے حالانکہ مفتی ہونا ایک مخصوص ذوق اور مزاج کا نام ہے جو برسوں کی محنت کے بعد بطور عطیہ وہبی کے عطا ہوتا ہے، مفتی کا کام اتنا سا نہیں ہے کہ صرف جزئیہ دیکھ کر جواب لکھ دے، اس پر لازم ہے کہ سوال کو دیکھے، سائل کو پرکھے، جن حالات میں سائل دریافت کر رہا ہے ان کا پس و پیش دیکھے عرف و عادت کے تغیر پر نظر کرے انقلابات احوال سے جوابات بدل جایا کرتے ہیں، اس کو ذہن میں رکھے، پھر ہر سوال کا جواب بھی ضروری نہیں ہوتا اور اگر جواب دیا ہی جائے تو تحریری جواب دینا لازم نہیں ہوتا۔

دار العلوم کراچی اور دیگر اداروں سے فارغ شدہ بعض طلبہ مشق افتاء کے لیے درجہ تخصص میں داخلہ لے لیتے تھے، دو سال کا نصاب ان کے لیے تجویز کیا گیا تھا، دو سال کے بعد وہ سند مانگتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دل سے سند دینے پر راضی نہ تھے ان کا دل چاہتا تھا کہ دس پانچ سال افتاء کا کام کریں، گرم نرم سہتے

رہیں، اکابر کے فتاویٰ پر عبور حاصل کریں، تب سند دی جائے، بلکہ اسقدر کام لیں گے تو خود ہی سند کے طالب نہ ہوں گے۔ کیونکہ جیسے جیسے کام کریں گے اپنے عجز اور قلت علم کا احساس بیدار ہوتا جائے گا۔ پھر بھی طلبہ کے اصرار پر سند دے دیتے تھے جس میں خاص طور سے یہ بات تحریر کراتے تھے کہ فلاں بن فلاں نے مطالعہ کتب کیا اور افتاء کی مشق کی مگر مفتی ہونا بہت کٹھن کام ہے اگر کسی ماہر مفتی کی نگرانی میں اس نے چند سال کام کیا تو امید ہے کہ اس سلسلہ میں کسی قدر کچھ لائق ہو جائے گا۔

فرماتے تھے کہ میرا اصل فن تو فقہ وفتاویٰ ہی رہا ہے جس پر محنت کی اور زندگی کھپائی لیکن اللہ جل شانہ کا فضل وکرم ہوا کہ اس نے زندگی کے آخری سالوں میں دل کی بیماری کے زمانہ میں تفسیر کی بھی خدمت لے لی اور معارف القرآن لکھوادی۔

فرماتے تھے ہم تفسیر کے اہل نہیں ہیں، اکابر نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو اپنے الفاظ میں اور نئے طرز کے قالب میں پیش کر دیا ہے۔

بھٹو حکومت نے دوسرے مکتب فکر کے ایک مفتی صاحب کو گرفتار کر لیا تھا، اسی زمانہ میں کسی سائل نے دار العلوم کراچی میں ایک استفتاء بھیجا، یہاں سے جو جواب دیا گیا اس کو اس نے شائع کر دیا، اس جواب میں مفتی موصوف کے جواب کے کچھ حصہ کی موافقت تھی۔ دار العلوم کے اس شائع شدہ جواب کو بنیاد بنا کر ان حضرات نے کوشش کر کے اپنے مفتی صاحب کو چھڑا لیا جس پر بعض لوگ دار العلوم کراچی کے دار الافتاء میں کام کرنے والے فتویٰ نویس عالمِ دین کو ملامت کرنے لگے کہ تمہارے فتوے سے مخالف مکتب فکر کا مفتی چھوٹ گیا، گویا اچھا نہ ہوا، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بحیثیت امت کے سوچا کرتے تھے آپ کو ان لوگوں کی ملامت کا پتہ چلا تو فرمایا کہ اچھا ہوا ہمارے دار الافتاء کے فتویٰ کی وجہ سے فلاں مفتی صاحب رہا ہو گئے کیونکہ حکومت نے ان کو اس لیے گرفتار نہیں کیا تھا کہ اس مکتب فکر کے مفتی ہیں بلکہ اس لیے گرفتار کیا تھا کہ وہ مفتی ہیں اور ان کا فتوے

حکومت کے منشاء کے خلاف پڑ گیا تھا، اگر آج ان کو گرفتار کیا ہے تو کل کو ہماری باری بھی آسکتی ہے۔

ایک مرتبہ ہر پیز کی تکلیف تھی (پوری ٹانگ میں بہت سخت درد تھا جس کی میعاد بائیس دن تھی یہ دن بہت صبر آزما گزرے) فرمایا کہ اللہ جل شانہ کی یہ عادت ہے کہ مرض شدید ہوتا ہے تو مدید نہیں ہوتا اور مدید ہوتا ہے تو شدید نہیں ہوتا، لیکن اس مرض میں اشتداد بھی ہے اور امتداد بھی، اسی مرض کے ایام میں احقر ایک دن عیادت کے لیے حاضر ہوا، دریافت فرمایا کہ میرے لیے تیمّم کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ درد میں اس قدر شدت تھی کہ تیمّم کی گنجائش دینے کو دل چاہتا تھا لیکن فقہ میں یہ لکھا ہے کہ جس کے خدمت گزار موجود ہوں جو وضو کرا سکتے ہوں اور نماز میں اٹھا بٹھا سکتے ہوں اس کو تیمّم جائز نہیں اور اس کی نماز بھی بیٹھ کر درست نہیں (بشرطیکہ مرض کے لیے پانی مضر نہ ہو اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے دوران سر وغیرہ کی تکلیف نہ ہو، بس وضو خود کرنا اور خود کھڑے ہونا مشکل ہو) احقر نے خاموشی اختیار کی اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے خاموش اٹھ کر چلا آیا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میری خاموشی سے فائدہ اٹھایا یعنی وضو کر کے نماز پڑھی اور سمجھ لیا کہ تیمّم کی گنجائش نہیں ہے، میں ایک دو دن کے بعد حاضر خدمت ہوا تو فرمایا بھئی میں نے وضو کر لیا تھا (دوسرا کوئی شخص ہوتا تو خاموشی کے دوسرے معنی لیتا)۔

فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک استاد جو دیوبند ہی کے باشندہ تھے بڑی تنخواہ پر بہار کے ایک مدرسہ میں چلے گئے جب جا رہے تھے تو ان کو احباب نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور یہ فرماتے رہے کہ مدرسہ میں بہت تھوڑا سا وقت دینا ہوگا (کیونکہ سرکاری مدرسہ ہے) اور تنخواہ زیادہ ہوگی گزارہ خوب فارغ البالی کے ساتھ ہوگا اور تصنیف و تالیف کا اور خارج مدرسہ مفت تعلیم کا خوب موقعہ ملے گا۔ احباب کہتے تھے کہ یہ نفس کا دھوکہ ہے ایسا نہ ہو سکے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا علمی خدمت تو موصوف کچھ نہ

کر سکے البتہ بہار کے متوطن ہو گئے اور کچھ جائداد خریدی اور بس، دینی مدرسوں میں کم تنخواہ پر کام کرتے رہنا چاہئے اسی میں عالم کے لیے دین ودنیا کی خیر ہے۔

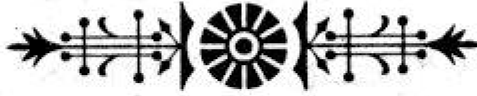
فرمایا اہل عرب کا یہ طریقہ ہے کہ جب کچھ شمار کراتے ہیں تو آٹھویں نمبر پر ضرور واؤ لے آتے ہیں اس کا نام واوِثمانیہ ہے، سورۂ کہف میں جو رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ اور سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واؤ نہیں ہے اور وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واؤ ہے اس میں یہی نکتہ ہے اور اس کی نظیر میں سورۂ توبہ کی آیت اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الآیۃ ذکر فرماتے تھے، اس میں آٹھویں جگہ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ پر واؤ ہے اس سے پہلے کسی جگہ واؤ نہیں ہے، اسی طرح سورۂ تحریم کی آیت عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ الآیۃ میں آٹھویں جگہ وَاَبْكَارًا پر واؤ ہے اس سے پہلے واؤ نہیں ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ آجکل لوگوں میں فکرِ آخرت نہیں ہے جو کام کرنا طے کر چکے ہیں اس کو ضرور کریں گے، نہ فتویٰ معلوم کر کے باز آتے ہیں نہ خود مسئلہ جان کر گناہ چھوڑتے ہیں اس لیے مسائل مجتہد فیہا میں مفتی حضرات متعدد اقوال میں سے جواز کے پہلو پر فتویٰ دیں تو عوام کے حق میں بہتر ہے کیونکہ جواز معلوم کر کے عمل کریں گے تو گناہ گار نہ ہوں گے اور دین سے اپنا لگاؤ سمجھیں گے اور اگر ان کو ناجائز کا فتویٰ دیدیا تب بھی وہی کریں گے جو طے کر چکے ہیں البتہ اس صورت میں گناہ جانتے ہوئے شریعت کے باغی ہو کر عمل کریں گے جو ان کے دین وایمان کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ (یہ بات اُن ہی مسائل وامور سے متعلق ہے جن کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی نص نہیں ہے جو قرآن وحدیث کے بیان کردہ اصول کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہیں اور جو مجمع علیہ ہی نہ ہوں)۔

اکابر دیوبند کے کمالات کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مصرع کہا ہے جس کا مصرع ثانی اب تک کوئی نہ کر سکا۔

ایک مجلس تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے صاحبزادے مولوی محمد زکی مرحوم نے دوسرا مصرع کہا تھا مگر حضرت کے نزدیک خاطر خواہ جوڑ نہ لگا۔ آخر تک اپنے مصرع کو خود ہی فرماتے رہے اور خود بھی غالباً کوئی جوڑ نہ لگا یا۔ واللہ اعلم (ماہنامہ البلاغ کراچی)



ارشادات وملفوظات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مفتئ اعظم پاکستان

راہِ سلوک میں اصل وظائف نہیں بلکہ تہذیب اخلاق سے پہلے آدمیّت آجائے تو بہت جلد وصول ہوجاتا ہے۔ جب تک آدمی رگڑے نہ کھائے آدمی نہیں بنتا اور رگڑے لگتے ہیں شیخ کی خدمت میں رہ کر، اس کی خدمت اور اس کے کام دھندے کرنے میں، کیونکہ کام دھندا کرنے اٹھنے بیٹھنے میں اس کی غلطیاں سامنے آتی ہیں پھر ان پر تنبیہ کی جاتی ہے، نہ یہاں برکت ہے نہ علم غیب، یہاں تو حرکت کی ضرورت ہے۔

شیخ سے مناسبت پیدا کرنی چاہئے تب جاکر کچھ حاصل ہوتا ہے اور مناسبت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ شیخ کی عادات واخلاق دیکھ کر ویسی ہی اپنی عادات بنانے کی کوشش کرے اور سارے سلوک کا خلاصہ سنت کی پیروی کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

اعمال کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ظاہری اعمال ان کو فقہ کہتے ہیں دوسرے باطنی اعمال ان کو تصوف کہتے ہیں، سو جس طرح ظاہری فرائض اور واجبات پر عمل کرنا ضروری ہے اور محرمات سے اجتناب لازم ہے اسی طرح باطنی اعمال میں بھی جو فضائل ہیں ان پر عمل کرنا ضروری اور رذائل سے اجتناب لازم ہے بلکہ باطنی اعمال تو ظاہری اعمال کے لئے بمنزلۂ جڑ اور بنیاد کے ہیں اس لئے باطنی اعمال کی اصلاح زیادہ قابل توجہ ہے، فضائل یہ ہیں: صبر، شکر، توحید، صدق، توکل، محبت، شجاعت، سخاوت، مراقبہ، محاسبہ وغیرہ۔ رزائل یہ ہیں۔ حسد، ریا، کبر، بغض، کینہ، عُجب، شہوت،

نخوت، رعونت، آفاتِ لسان وغیرہ۔

اپنے عیوب پہچاننے کے چار ④ طریقے ہیں:

① رہبر کامل مل جائے جو اپنی بصیرت خداداد سے، اپنی فراست سے پہچان لے۔

② ایسے احباب مل جائیں جو خلوص کے ساتھ نگاہ رکھیں اور عیوبِ نفس پر آگاہ کریں۔

③ دشمن جو برائیاں چھانٹے اور کہے، تو اپنے اندر غور کرتا رہے کہ یہ برائیاں مجھ میں ہیں یا نہیں، کیونکہ دشمن چھانٹ چھانٹ کر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالا کرتا ہے۔

④ دوسروں کے جو عیب دیکھے تو اپنے اندر خوب غور کرے کہ یہ عیب خود میرے اندر تو نہیں ہے۔

لوگ مصلحت بینی میں بہت افراط میں مبتلا ہیں حتی کہ اچھے خاصے دیندار، سمجھدار لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی کیا کریں حالات نے ایسا مجبور کیا کہ کرنا ہی پڑا۔ ایسا ہرگز جائز نہیں بلکہ مصلحت بینی دفع مضرت تک تو جائز ہے جلب منفعت کے لئے جائز نہیں۔

ایک بار طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ، نے فرمایا ہے کہ انسانوں کی چار قسمیں ہیں:

① جن کے نہ دل میں دنیا ہے اور نہ ہی ہاتھوں میں دنیا ہے، بہت سے انبیاء علیہم السلام کرام اور اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ اللہ ایسے ہوئے ہیں۔

② وہ جن کے دل میں نہیں مگر ہاتھوں میں دنیا رہی۔ بعض انبیاء اس طرح کے ہوئے جیسے حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام اور بہت سے اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ اللہ بھی اس طرح کے ہوئے ہیں جیسے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کہ ان کے شاہانہ انداز کا یہ حال تھا کہ روزانہ ایک نیا جوڑا بدلتے اور پھر کبھی دوبارہ وہ جوڑا

بدن پر نہیں آتا تھا۔

③ وہ جن کے دل میں دنیا ہے اور ہاتھوں میں بھی دنیا جیسے اکثر مالدار ایسے ہی ہوتے ہیں۔

④ وہ جن کے دل میں تو دنیا ہے مگر ہاتھ دنیا سے خالی ہیں۔

ان چاروں میں سب سے خسارہ والا چوتھے نمبر والا شخص ہے جس کے ہاتھ دنیا سے خالی اور دل دنیا اور حبِّ دنیا سے لبریز ہے یہ شخص انتہائی قابل رحم، مسکین اور حقیقی مفلس ہے۔ اگر ہماری نیت تحصیل علمِ دین سے معاذ اللہ حق تعالیٰ کی رضا نہیں بلکہ دنیا کمانا مقصود ہے جیسا کہ عام رواج ہے کہ اس لئے پڑھتے ہیں کہ پڑھ کر کہیں مدرس ہو جائیں گے، امام خطیب بن جائیں گے تو ایسا شخص خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ کا مصداق ہے کیونکہ دنیا تو اس راستے میں کبھی ہوئی نہیں ہاں آخرت حاصل ہوا کرتی ہے اس لئے دونوں جہاں میں ذلت ورسوائی اس کا مقدر ہوئی اور دونوں جہاں برباد ہوئے لہٰذا محض حق تعالیٰ کی رضا کے لئے پڑھو اور اس پر عمل کرو۔

ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستے کا جان لینا کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ پر نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت کی اطاعت کے اور کچھ نہیں ورنہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت وتوفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے۔ قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصد رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر اسے تعلیمات اسلام کی نمایاں خصوصیت بتلایا ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہی کافی نہیں کہ روپیہ اپنے پاس سے نکال دیا جائے بلکہ اس کے صحیح مصرف تک پہنچانا بھی انسان کی اپنی ذمہ داری ہے اسی لئے حکم یہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ نکالو بلکہ حکم یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ لہٰذا لوگوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ زکوٰۃ نکال کر جس کو چاہا پکڑا دی۔ اس سے ذمہ داری پوری نہیں ہوتی بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسے مستحقین کی ایک فہرست نگاہ میں رکھے جو کسی سے مانگتے نہیں لیکن ضرورت مند ہیں۔

اردو زبان میں دو شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے ایک اکبر الٰہ آبادی مرحوم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم۔ ان دونوں میں سے اکبر الٰہ آبادی کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے، اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اور ان کے یہاں حکمت کی بھی فراوانی ہے۔ اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے مگر اس میں اس درجہ سلامتی نہیں۔

اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اور اس سے جتنا فائدہ پہنچا، اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیا اور طنز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لطف تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی مؤثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی فروری ۲۰۰۲ء)



افادات: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

ضبط وترتیب: مولانا شمس الحق رحمہ اللہ تعالیٰ

اِصلاحِ نفس کے لئے دو کام کی باتیں

بیان مجلس دارالعلوم نانک واڑہ اتوار ۲۶/دسمبر ۱۹۶۴ء

دِین داری کے لئے بڑی ضرورت ہے اِصلاحِ نفس کی، آج لوگ اس کے لئے صرف اتنی کوشش کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے مرید بن جائیں، لیکن یہ سمجھئے کہ مرید ہونا مقصد نہیں بلکہ اِصلاحِ نفس مقصد ہے۔ اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، حالانکہ پیر کے ہاتھ پر بیعت ہونا ذریعہ ہے اس مقصد کے حاصل کرنے کا، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سب کو اسی ذریعے سے اِصلاح ملے۔ شیخ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: کسی شخص کو یہ معلوم کرنا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہیں یا ناراض ہیں؟ تو وہ یہ دیکھے کہ دِین اور دُنیا کے کاموں سے جو وقت فراغت کا اس کو ملتا ہے وہ اس وقت کو کن کاموں میں گزارتا ہے؟

دُنیا میں جتنے انسان ہیں اتنی ہی تعداد اللہ تک پہنچنے کے راستوں کی ہے، یعنی اللہ تک پہنچنے کے بھی بے شمار راستے ہیں، ہر شخص الگ الگ راستوں سے اللہ تک پہنچ سکتا ہے، اس لئے یہ خیال نہ کرے کہ تصوف تو صرف خالی آدمیوں کا راستہ ہے، ہر شخص اپنی محنت کے بقدر کامیاب ہوسکتا ہے۔ ایک بزرگ کے پاس ایک طالبِ علم آیا اور کہا کہ: حضرت! میرے دِل میں خواہش ہے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں اور تصوّف کی لذّت حاصل کروں، لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ تصوّف کے راستے میں بڑے مجاہدے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور میں اپنے اندر اس کی قوّت نہیں

پاتا، اور نہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ مجاہدات کا راستہ اِختیار کروں اس لئے کہ علمِ دِین حاصل کرنے میں مشغول ہوں اور اس سے فرصت نہیں پاتا۔ بزرگ ہنسنے لگے اور فرمایا: اچھا! کوئی مشکل کام نہیں بتائیں گے، دو جملے کہتا ہوں، اسی کو اپنالو، کامیاب ہو جاؤ گے۔ پہلی بات یہ کہ فضول باتوں سے بچو، دُوسرے یہ کہ تقویٰ اِختیار کرو۔

دیکھا آپ نے ان دو جملوں میں ساری دُنیا اور آخرت کی بھلائی پوشیدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان غور کرے اور فضول باتوں سے بچے تو سارے گناہوں سے بچ جاتا ہے، مثلاً کہنے میں کوئی فضول بات نہ ہو، یعنی ہر بات میں یا تو دِین کا کوئی فائدہ ہو یا دُنیا کا کوئی فائدہ ہو تو بولے ورنہ فضول کلام نہ کرے۔ سننے میں ایسی مجلسوں میں بیٹھے جو کارآمد ہوں، جن باتوں سے کوئی فائدہ نہ ہو وہ نہ سنے، کھانے میں وہ چیز کھائے جس سے کوئی فائدہ ہو، فضول کھانے بھی چھوڑ دے، ہر کام میں یہ دیکھے کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ جو کام بے فائدہ ہو اُسے چھوڑ دے۔

آج ہمارا بہت سا وقت محض اخبار پڑھنے یا بیکار کی گفتگو کرنے میں گزر جاتا ہے، حالانکہ اخبار پڑھنا گناہ نہیں، صرف خبریں دیکھنا بھی ایک بیماری کی طرح لازمی بن کر رہ گیا ہے، اور بے کار گفتگو تو عام ہے، جہاں دو چار آدمی جمع ہوں گے اِدھر اُدھر کی بے معنی گفتگو شروع ہو جائے گی، جس میں یا تو کسی کی بُرائی بھلائی ہوگی یا محض وقت کا گزارنا ہوگا، ایسے خالی وقت میں جب کوئی کام نہ ہو اپنے اُوپر غور کرنے کی ضرورت ہے اور جس نے اپنے اُوپر غور کیا تیاری کی؟ تو نہ صرف بدگوئی اور بُرے اعمال سے بچے گا بلکہ آخرت کا کچھ سامان کرلے گا۔

دُوسری بات جس میں تقویٰ اختیار کرنے کو کہا ہے، یہ تمام اعمالِ حسنہ کی جڑ ہے، فرائض و واجبات اختیار کرو، ممنوع اور حرام چیزوں سے بچو، آخرت کی فکر کرو، خدا کا خوف کرو، یہی تقویٰ ہے۔ ہر اِنسان کی کامیابی کے لئے بس یہی دو جملے کافی

ہیں، یہ ایسے سبق ہیں کہ انسان پہلے دن سے لے کر آخر دم تک انہیں کو پکڑ کر صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: دو چیزیں نعمت ہیں جن کی موجودگی میں انسان ان کی قدر نہیں کرتا، اور ان نعمتوں کے جانے کے بعد ان کی قدر ہوتی ہے، وہ ہیں صحت اور فراغت۔ صحت کی قدر جب ہوتی ہے جب بیماری آتی ہے، اور فراغت کی قدر جب ہوتی ہے جب انسان عمل کے قابل نہیں رہتا، اور دونوں کی قدر یہ ہے کہ محاسبہ کرے اپنے اعمال کا اور فکر کرے آخرت کی۔

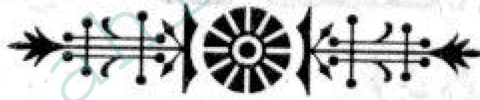
نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزیں غنیمت سمجھو پانچ چیزوں سے پہلے۔ جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، زندگی کو موت سے پہلے، غنا کو فقر سے پہلے اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے۔ جوانی کو اس لئے غنیمت فرمایا کہ جوانی میں انسان کے پاس قوّت ہوتی ہے، ارادہ ہوتا ہے، طاقت ہوتی ہے، ہر کام کرسکتا ہے، چنانچہ اس میں جتنے بھی نیک اعمال اکٹھے ہوسکیں کرے، پھر جب بڑھاپا آجاتا ہے تو اِرادے بھی پست ہوجاتے ہیں اور قُویٰ بھی جواب دے دیتے ہیں، اگر چاہے تب بھی کوئی کام نہیں کرسکتا اور پھر افسوس کرتا ہے جوانی پر۔ اور اس پر بھی اگر کوئی وقت مقرّر کرلے یعنی یہ سمجھ لے کہ جوانی تو دس پندرہ سال رہے گی ابھی سے کیا فکر کریں؟ تو صحت کا تو کوئی اعتبار نہیں، ہر شخص کو کسی نہ کسی بیماری سے تو دوچار ہونا ہی پڑتا ہے، اس وقت نیک اعمال کی طاقت کہاں ہوگی؟ اس وقت تو صحت کے لئے ہی دُعائیں مانگنی پڑتی ہیں اور اعمال کی طاقت کہاں؟ اور مشغولیت دراصل ایک عذاب ہے جس میں آج ہم مبتلا ہیں، آج کا فیشن ہی ہمارے لئے مشغولیت کا عذاب بنا ہوا ہے، آج کے نوجوان کو بننے اور سنورنے میں ہی گھنٹوں صرف ہوجاتے ہیں، فضولیات کو ضروریات بنا

چھوڑا ہے، بلکہ اپنے اُوپر لادلیا ہے، اکثر مجالسوں میں بات کام کی دس منٹ کی ہوتی ہے، اس کا اہتمام اور فضولیات گھنٹوں کی ہوتی ہیں۔

اور غنا کو اس وجہ سے غنیمت جانو کہ مال بھی چلتی پھرتی چھاؤں ہے، آج ہے، کل نہیں، جو کرنسی آخرت کی خرید کر جمع کرادو گے، کل آخرت میں وہ جمع کیا ہوا مل جائے گا۔ آج ہم غنی اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس دولت ہو، کارخانے ہوں، موٹر ہوں، بلکہ غنی وہ شخص ہے جو شریعت کی رُو سے صاحبِ نصاب ہو۔ حاصل یہ کہ پیسے پر بھروسہ نہ کرے، نہ معلوم کب ختم ہوجائے۔ اور یہ ساری چیزیں ایک دُوسرے کے بعد آنی ضروری ہیں، اب کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص تو شروع سے مال دار تھا اور مرتے دَم تک مال دار رہا، اس پر فقر کب آیا؟ تو سمجھو اس بات کو کہ آخر میں مرتے وقت تو اس سے سب مال چھن گیا اور فقیر ہوکر ہی دُنیا سے رُخصت ہوا، کیا مال وہ لے گیا؟ اپنے ساتھ صرف وہ مال جس کو اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے جمع کرادیا وہی اس کے کام آئے گا۔ آج ہم فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے پاس مال نہ ہو، اللہ کے سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: فقیر وہ ہے جو دُنیا سے جاتے وقت بہت اعمال اور نیکیاں ساتھ لے گیا، لیکن حقوق کی پروانہ کی اور قیامت میں جب میزان کا وقت آیا تو اس کے حق داروں نے اللہ پاک سے درخواست کی کہ ہمارے حقوق دِلوائے جائیں، اب وہاں روپیہ پیسہ تو موجود نہ ہوگا، چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ: اس کی نمازیں لے لو، پھر وہ لوگ آئیں گے جن کا اس نے حق مارا تھا، جن کی غیبت کی تھی اور ان کے حقوق کے بدلے میں اللہ پاک اس شخص کے روزے، نوافل، عمرے اور حج دِلوائیں گے، پھر وہ بالکل نیکیوں سے خالی ہوجائے گا، اور حق دار جب اور آئیں گے تو حکم ہوگا اب نیکیاں اس کے پاس ختم ہوگئیں اب اپنے گناہ اس پر ڈال دو، اور وہ شخص جو نیکیوں کا انبار لے کر گیا تھا اب گناہوں سے لد جائے گا، فرمایا غریب وہ شخص ہے۔

اور زندگی کو غنیمت سمجھنا موت سے پہلے تو ظاہر ہے کہ یہ سارا عمل کا میدان زندگی میں ہی ہوگا، اور آج تو وہ زندگی مشینی ہے، ہر کام بٹن دبا کر مشین سے کیا جاتا ہے، تو عزرائیل علیہ الصلاۃ والسلام کا کام بھی مشینی ہوگیا ہے، چنانچہ موت بھی آج مشینی طور پر آتی ہے، آدمی ابھی ابھی بات کررہا ہے، ابھی ابھی کام کررہا ہے، ابھی ابھی سفر کررہا ہے، اور آن کی آن میں حرکتِ قلب بند ہوجاتی ہے، جب تک سانس ہے کچھ کرلو، پھر تمنا رہ جائے گی کہ ہم کو بھی وقت ملتا تو اعمال کا ذخیرہ کرلیتے۔ اور کچھ نہیں ہوسکتا تو اپنے خالی اوقات ہی کو ذکرِ الٰہی میں صرف کردو، لایعنی باتوں ہی سے بچ جاؤ، آخرت کی فکر کرو، اللہ پاک ہم سب کو نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی، محرم ۱۳۹۴ھ)



مجموعة الجواهر

ملفوظاتِ مفتیِ اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ

احقر نے حضرت اقدس سیدی ومرشدی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ (مفتیٔ اعظم پاکستان وبانیٔ دارالعلوم کراچی) کی خدمت اقدس میں حاضری کے دوران چند ملفوظات جمع کئے تھے وہ پیشِ خدمت ہیں، بقیہ بشرطِ زندگی انشاء اللہ اسی عنوان کے تحت دیگر ذاتی استفادات پیش کرنے کی سعی کروں گا۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

(بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہ)

دارالعلوم میں ہم خیال احباب کی ضرورت

فرمایا دارالعلوم میں اپنے ہم خیال احباب جمع کرنے کی کوشش کررہا ہوں، ورنہ مختلف الخیال احباب کے جمع ہوجانے سے بعد میں اکثر گڑبڑ کا اندیشہ رہتا ہے۔

مقام فنا کی ضرورت

اکثر ارشاد فرمایا کہ جتنا ہو سکے اپنے آپ کو مٹایا جائے۔

اساتذہ وطلباء کو جذبۂ عمل کی ضرورت

اکثر اس پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ دینی تعلیم بھی فنی تعلیم کی طرح ہوتی جارہی ہے، اساتذۂ کرام میں اب وہ عمل کا جذبہ نہیں رہا۔ ورنہ ایک وقت تھا کہ دارالعلوم

(دیوبند) کے چپڑاسی سے لے کر مہتمم تک سب ہی شب بیدار وصاحب دل ولی اللہ تھے۔ اب ملازمت، امانت مدرّسی وغیرہ کی نیت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، نفلی روزہ اور نفلی نماز وغیرہ کا اہتمام شاید ہی کسی میں رہا ہو۔

اہلِ عرب کی شکایت مناسب نہیں

فرمایا کہ بعض مرتبہ لوگ عربوں کی شکایت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو تکلیفیں واقعی ان سے پہنچتی ہیں مگر اس سے ان کو شکوہ و شکایت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو جس مقام (مکہ و مدینہ) میں رہنے کی سعادت و شرف سے نوازا ہے شاید ان پر کسی وقت نگاہ کرم ہو جائے یا ان کی کوئی عبادت قبول ہو جائے تو ہماری ساری عمر کی عبادت اس کے مقابلہ میں کیا ہے؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی خدماتِ تصوف

فرمایا تصوف کو لوگوں نے راہب لوگوں کا پیشہ سمجھا ہوا تھا، حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس میں خوب اجتہاد کیا اور راستہ کھولا، یہاں تک کہ دنیا دارں کو دیندار بنا دیا۔ اس ضمن میں حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر بزرگانِ دین پہلے جو مجاہدات کراتے تھے ان کے واقعات بیان فرمائے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان کو نصیحت

فرمایا میں ہمیشہ رمضان تھانہ بھون میں گزارتا تھا اور عید الفطر گھر (دیوبند) میں کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ۲۹/رمضان المبارک کو گھر جانے سے پہلے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نصیحت کی درخواست کی تو ارشاد فرمایا کہ ہم کو تو ایک ہی سبق آتا ہے اور وہی سبق سب کو پڑھاتے ہیں کہ جتنا ہو سکے اپنے آپ کو مٹا لو۔ پھر ایک موقعہ پر نصیحت کی درخواست کے جواب میں حدیث

بیان فرمائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ جب صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کرو اور جب شام ہو تو صبح کا انتظار مت کرو، پھر اپنے آپ کو قبر والوں میں سے شمار کرو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اب تو بیماری نے ایسی حالت خود ہی کردی، حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحت اور تندرستی کے زمانے میں ایسا ہونے کو کہا تھا۔

عدمِ نفع اور ضرر میں فرق

حضرت حکیم الأمت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک ملفوظ کی تشریح کے ضمن میں فرمایا کہ بیرسٹر اور وکلاء کا جو وفد علماء سے ملاقاتیں کررہا تھا، حضرت حکیم الأمت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصول وضوابط سے بہت حیران ہوئے۔ حضرت نے عدم نفع اور ضرر میں جو فرق بیان فرمایا وہ پہلے کسی کو معلوم نہ تھا، (حضرت نے فرمایا کہ ایک شخص کسی کو سو روپے دینے والا ہو، کسی کے ایماء پر نہ دے تو لینے والے کا ضرر نہیں ہوا، عدم نفع ہوا، ضرر تو جب ہوتا کہ کوئی چھین لیتا یا جیب سے جاتے وغیرہ) میں نے بھی سوالات کے جوابات قلمبند کرکے دیئے تھے لیکن یہ اس میں موجود نہ تھا۔ جو حضرت نے مجلس میں ارشاد فرمایا وہ سب لاجواب ہوگئے اور کہا عالم ایسے ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم نے عالم کہاں دیکھے ہیں، میں تو علماء کا ادنیٰ خادم اور ایک طالب علم ہوں۔

پھر فرمایا ضرر اور عدم نفع کا فرق ایک کتاب میں نظر سے گزرا مگر حضرت حکیم الأمت رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس وقت انتقال ہوچکا تھا ورنہ حضرت کو دکھلاتا اور حضرت سن کر مسرور ہوتے۔ (نور اللہ مرقدہ)

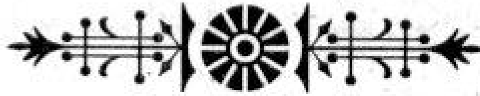
حضراتِ اکابرین دیوبند کا اعتدال

فرمایا فقہ کی سب کتابوں میں لکھا ہے کہ کتب فقہ کا مطالعہ رات کے نوافل (تہجد) سے افضل ہے مگر میں نے اپنے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ دیوبند وتھانہ بھون میں

سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا کہ اس سے فقہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو کر نمازِ تہجد چھوڑ دی ہو۔ دونوں کو جمع ضرور کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی پر علم کا غلبہ ہوا تو انہوں نے تہجد کو کم وقت دیا اور کسی پر عبادت کا غلبہ ہوا تو انہوں نے مطالعہ میں کم وقت صرف کیا مگر مطالعہ کیا ضرور، پھر دورِ حاضر کے مدرسین وطلباء پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ علم تو سب پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر اس طرف شاید ہی کسی کی توجہ اور عمل ہو۔

ذکری مذہب کے متبعین کو ضرورتِ تبلیغ

فرمایا دورانِ تعطیلات اگر اساتذہ وطلباء کو کچھ فرصت ملے تو جا کر ذکری مذہب والوں کو تبلیغ ضرور کرنی چاہئے۔ یہ کراچی میں بہت آباد ہو گئے ہیں۔ ان کے عقائد بہت غلط ہیں۔ ان کی اصلاح کرنی چاہئے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی دسمبر ۲۰۰۳ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

عام مؤمنین کے لئے استغفار!

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اپنے لئے اور عام مؤمنین ومؤمنات کے لئے استغفار یعنی اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی استدعا کیا کریں۔ واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنات! یہی حکم ہم امتیوں کے لئے بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی ترغیب دی اور بڑی فضلیت بیان فرمائی ہے، اس سلسلے کی دو حدیثیں ذیل میں پڑھئے:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے مغفرت مانگے گا۔ اس کے لئے ہر مومن مرد عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی۔''

کسی صاحب ایمان بندے یا بندی کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش کی دعا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا احسان اور اس کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس لئے جب کسی بندہ نے عام اہل ایمان (مؤمنین ومؤمنات) کے لئے استغفار کیا اور ان کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کی تو فی الحقیقت اس نے اولین وآخرین زندہ اور مردہ سب ہی اہل ایمان کی خدمت اور ان کے ساتھ نیکی کی۔ اس لئے ہر ایک کے حساب میں اس کی یہ نیکی لکھی جائے گی۔ سبحان اللہ

ہمارے لئے لاتعداد نیکیوں کے کمانے کا کیا راستہ کھولا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس

کے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔ جمیع مؤمنین ومؤمنات کے لئے دعائے مغفرت کے بہترین الفاظ وہ ہیں جو قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام سے نقل کئے گئے ہیں کہ:

"رب اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب" ﴿اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور تمام ہی ایمان والوں کی مغفرت فرمادے قیامت کے دن۔﴾

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ عام مؤمنین ومؤمنات کے لئے ہر روز ۲۷ دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی دعا کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے۔ (معجم کبیر طبرانی)

اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ہی محبوب ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت وخیر خواہی اور ان کو نفع پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ ایک حدیث میں ہے۔ سب مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اس لئے لوگوں میں اللہ کو زیادہ محبوب وہ بندے ہیں جو اس کی مخلوق کو زیادہ نفع پہنچائیں۔

پھر جس طرح مخلوق کے لئے کھانے، کپڑے، ہر قسم کی زندگی کے ضروریات فراہم کرنا اور ان کو راحت وآرام پہنچانا وغیرہ۔ اس دنیا میں ان کی خدمت اور نفع رسانی کی صورتیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے بندوں کے لئے مغفرت اور بخشش کی دعا کرنا بھی اخروی زندگی کے لحاظ سے ان کی بہت بڑی خدمت اور ان کے ساتھ بہت بڑی نیکی ہے اور اس کی قدر وقیمت آخرت میں اس وقت معلوم ہوگی جب یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ کسی کے استغفار نے کسی کو کیا دلوایا اور کتنا نفع پہنچایا۔ پس جو مخلص بندے اخلاص اور دل کی گہرائی سے ایمان والے بندوں اور بندیوں کے لئے مغفرت اور بخشش کی دعائیں کرتے ہیں اور دن رات میں بار بار

کرتے ہیں۔ (جس کا کورس اس حدیث" میں ۲۷ بتایا گیا ہے۔) وہ تمام مؤمنین ومؤمنات کے خاص الخاص محسن اور گویا آخرت کے لحاظ سے "اصحابِ خدمت" ہیں اور اپنے اس عمل سے اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ایسے مقرب اور مقبول ہو جاتے ہیں کہ ان کی دعائیں سنی جاتی ہیں اور ان کی اور ان کی دعاؤں کی برکت سے دنیا والوں کو اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے۔

لیکن یہ بات یہاں قابل لحاظ ہے کہ اس دنیا میں تو ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی خدمت اور اس کو ضروری درجہ کا آرام پہنچانے کی کوشش نیکی اور کار ثواب ہے۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ "في كل ذات كبد رطب صدقة" لیکن اللہ رب العزت سے مغفرت اور جنت کی دعا صرف اہل ایمان ہی کے لئے کی جاسکتی ہے۔ کفر وشرک والے جب تک اس سے توبہ نہ کریں مغفرت اور جنت کے قابل نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے واسطے مغفرت اور جنت کی دعا بھی نہیں کی جاسکتی، ہاں ان کے واسطے ہدایت اور توبہ کی توفیق کی دعا کرنی چاہئے۔ جس کے بعد ان کے لئے مغفرت اور جنت کا دروازہ کھل سکے۔ ان کے حق میں یہی دعا کرنا ان کے ساتھ بہت بڑی نیکی اور خیر خواہی ہے۔

توبہ واستغفار سے اللہ کتنا خوش ہوتا ہے

توبہ واستغفار سے متعلق احادیث وروایات کے سلسلہ کو مندرجہ ذیل حدیث پر ختم کیا جاتا ہے جو صحیحین میں بھی متعدد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے والے گناہ گاروں کو وہ بشارت سنائی ہے جو کسی دوسرے بڑے سے بڑے عمل پر نہیں سنائی گئی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی شان رحمت کو سمجھنے کے لئے صرف یہی ایک حدیث ہوتی تو کافی تھی۔ حق یہ ہے کہ اس چند سطری حدیث میں معرفت کا ایک دفتر ہے۔ اللہ تعالیٰ فہم اور یقین نصیب فرمائے:

"عن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول للّٰہ افرح بتوبة عبده المؤمن من رجل نزل ارض دوية مهلكة معه راحلته عليها طعامه وشرابه فوضع رأسه فنام نومة فاستيقظ وقد ذهبت راحلته فطلبها حتى اذا اشتد عليه الحر والعطش أو ماشاء اللّٰه قال ارجع الى مكانى الذى كنت فيه فأنام حتى أموت فوضع رأسه على ساعده ليموت فاستيقظ فاذا راحلته عنده عليها زاده وشرابه فاللّٰه اشد فرحاً بتوبة العبد المؤمن من هذا براحلته وزاده"

﴿ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے خدا تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ سے اس مسافر آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ جو (اثنائے سفر میں) کسی ایسی غیر آباد اور سنسان زمین پر اتر گیا ہو جو سامان حیات سے خالی اور اسباب ہلاکت سے بھرپور ہو اور اس کے ساتھ بس اس کی سواری کی اونٹنی ہو۔ اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو۔ پھر وہ آرام کرنے کے لئے سر رکھ کے لیٹ جائے۔ پھر اسے نیند آجائے۔ پھر اس کی آنکھ کھلے تو دیکھے اس کی اونٹنی (پورے سامان سمیت) غائب ہے پھر وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ یہاں تک کہ گرمی اور پیاس وغیرہ کی شدت سے جب اس کی جان پر بن آئے تو وہ سوچنے لگے کہ میرے لئے اب یہی بہتر ہے کہ میں اسی جگہ جا کر پڑ جاؤں جہاں سویا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔ پھر وہ اسی ارادہ سے وہاں آکر اپنے بازو پر سر رکھ کر مرنے کے لئے لیٹ جائے۔ پھر اس کی آنکھ کھلے تو وہ دیکھے کہ اس کی اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس پر کھانے پینے کا پورا سامان (جوں کا توں محفوظ) ہے۔ تو جتنا خوش یہ مسافر اپنی اونٹنی کے ملنے سے ہوگا۔ خدا کی قسم! مؤمن بندہ کے توبہ کرنے سے خدا اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) ﴾

ذرا تصور کیجئے اس بدو مسافر کا جو اکیلا اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اور راستہ بھر کے لئے کھانے پینے کا سامان اسی پر لاد کر دور دراز کے سفر پر کسی ایسے راستہ سے چلا جس میں کہیں دانہ پانی ملنے کی امید نہیں۔ پھر اثنائے سفر میں وہ کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اترا اور آرام کرنے کے ارادہ سے لیٹ گیا۔ اس تھکے ماندے مسافر کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اونٹنی اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ غائب ہے۔ وہ بے چارہ حیران و سراسیمہ ہو کر اس کے تلاش میں دوڑا بھاگا۔ یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدت نے اس کو لب دم کر دیا۔ اب اس نے سوچا کہ شاید میری موت اسی طرح اس جنگل بیابان میں لکھی تھی اور اب بھوک پیاس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے یہاں مرنا ہی میرے لئے مقدر ہے۔ اس لئے وہ اسی سایہ کی جگہ میں مرنے کے لئے آگے بڑھ گیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ اسی حالت میں اس کی آنکھ پھر جھپکی۔ اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹنی اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی ہے۔

ذرا اندازہ کیجئے کہ بھاگی ہوئی اور گم شدہ اونٹنی کو اس طرح اپنے پاس کھڑا دیکھ کر اس بدو کو جو مایوس ہو کر مرنے کے لئے پڑ گیا تھا۔ کس قدر خوشی ہوگی۔ صادق مصدوق ﷺ نے اس حدیث پاک میں قسم کھا کر فرمایا کہ خدا کی قسم! بندہ جب جرم گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا اور سچے دل سے توبہ کر کے اس کی طرف آتا ہے تو اس رحیم و کریم رب کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ جتنی کہ اس بدو کو اپنی بھاگی ہوئی اونٹنی کے ملنے سے ہوگی۔

قریب قریب یہی مضمون صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور صحیح مسلم میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی مضمون مروی ہے، بلکہ حضرت

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بدو مسافر کی فرطِ مسرت کے حال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اونٹنی کے اس طرح مل جانے سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس بے انتہا عنایت اور بندہ نوازی کے اعتراف کے طور پر وہ کہنا چاہتا تھا کہ:

"اللھم انت ربی وانا عبدك". ﴿خداوند! بس تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ۔﴾

لیکن خوشی کی سرمستی میں اس کی زبان بہک گئی اور اس نے کہا کہ "اللھم انت عبدی وانا ربك"

﴿میرے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا خدا﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غلطی کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"أخطأمن شدة الفرح".

﴿فرطِ مسرت اور بے حد خوشی کی وجہ سے اس بے چارے بدو کی زبان بہک گئی۔﴾

بلاشبہ اس حدیث میں توبہ کرنے والے گناہ گاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ وہ جنت اور اس کی ساری نعمتوں سے بھی فائق ہے۔

شیخ ابن القیم نے مدارج السالکین میں توبہ واستغفار ہی کے بیان میں اسی حدیث پر کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس خوشنودی کی وضاحت میں ایک عجیب وغریب مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر ایمانی روح وجد میں آجاتی ہے۔ ذیل میں اس کا صرف حاصل وخلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی ساری کائنات میں انسان کو خاص شرف بخشا ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور اس کو اپنی معرفت اور اطاعت وعبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ساری مخلوقات کو اس کے لئے مسخر کیا اور اپنے فرشتوں تک کو اس کا خادم اور محافظ بنایا۔ پھر اس کی ہدایت وراہنمائی

کے لئے کتابیں نازل فرمائیں اور نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ پھر ان ہی میں سے کسی کو اپنا خلیل بنایا اور کسی کو شرف ہم کلامی بخشا اور بہت بڑی تعداد کو اپنی ولایت اور قرب خصوصی کی دولت سے نوازا اور انسانوں ہی کے لئے دراصل جنت و دوزخ کو بنایا۔

الغرض دنیا و آخرت میں اور عالم خلق وامر میں جو کچھ ہے اور ہوگا۔ اس سب کا اصل مرکز ومحور بنی نوع انسان ہی ہے۔ اسی نے امانت کا بوجھ اٹھایا۔ اسی کے لئے شریعت کا نزول ہوا اور ثواب وعذاب دراصل اسی کے لئے ہے۔ پس اس پورے کارخانۂ عالم میں انسان ہی اصل مقصود ہے۔ اللہ نے اس کو اپنے خاص دست قدرت سے بنایا۔ اس میں اپنی روح ڈالی۔ اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا اور ابلیس اس کو سجدہ ہی نہ کرنے کے جرم میں مردودِ بارگاہ ہوا اور اللہ نے اس کو اپنا دشمن قرار دیا۔

یہ سب اس لئے کہ اس خالق نے انسان ہی میں اس کی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک زمینی اور مادی مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق وپروردگار کی (جو وراء الوراء اور غیب الغیب ہے) اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل کرے۔ ممکن حد تک اس کے اسرار اور اس کی حکمتوں سے آشنا ہو۔ اس سے محبت اور اس کی اطاعت کرے۔ اس کے لئے اپنے نفسانی مرغوبات اور اپنی ہر چیز کو قربان کرے اور اس دنیا میں اس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرے اور پھر اس کی خاص الخاص عنایتوں اور بے حساب بخششوں کا مستحق ہو کر رحمت ورأفت اس کے پیار ومحبت اور اس کے لئے بے انتہا لطف وکرم کا مورد بنے اور چونکہ وہ رب کریم اپنی ذات سے رحیم ہے اور لطف وکرم اس کی ذاتی صفت ہے۔ (جس طرح بلاتشبیہ ماممتا ماں کی ذاتی صفت ہے) اس لئے اپنے وفادار اور نیک کردار بندوں کو انعامات واحسانات سے نوازنا اور اپنے عطیات سے ان کی جھولیوں کو بھر دینا اس کے لئے بلاتشبیہ اسی طرح بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ جس طرح اپنے بچہ کو دودھ پلانا اور نہلا دھلا کر اچھے

کپڑے پہنانا مامتا والی ماں کے لئے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اب اگر بندے نے بدبختی سے اپنے اس خالق و پروردگار کی وفاداری اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کر بغاوت و نافرمانی کا طریقہ اختیار کرلیا اور اس کے دشمن اور باغی شیطان کے لشکر اور اس کے متبعین میں شامل ہوگیا اور رب کریم کی ذاتی صفت رحمت ورأفت اور لطف و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بجائے وہ اس کے قہر و غضب کو بھڑکانے لگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں (بلاتشبیہ بلاتشبیہ) اس غصہ اور ناراضی کی سی کیفیت پیدا ہوگی۔ جو نالائق اور ناخلف بیٹے کی نافرمانی اور بدکرداری دیکھ کر مامتا والی ماں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر اگر اس بندہ کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ محسوس کرے کہ میں نے اپنے مالک اور پروردگار کو ناراض کر کے اپنے کو اور اپنے مستقبل کو برباد کرلیا اور اس کے دامن رحم و کرم کے سوا میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہو اور مغفرت و رحمت کا سائل بن کر اس کی بارگاہ کرم کی طرف رجوع کرے۔ سچے دل سے توبہ کرے۔ روئے اور گڑگڑائے۔ معافی مانگے اور آئندہ کے لئے وفاداری اور فرمانبرداری کا عہد و ارادہ کرے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے اس کریم رب کو جس کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور جس کا پیار ماں کے پیار سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے اور جو بندوں پر نعمتوں کی بارش برسا کے اتنا خوش ہوتا ہے۔ جتنا نعمتوں کو پا کر محتاج بندے خوش نہیں ہوتے۔ تو سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسے کریم پروردگار کو اپنے اس بندہ کی اس توبہ و انابت سے کتنی خوشی ہوگی۔

شیخ ابن القیم نے اس سے بہت زیادہ وضاحت اور بسط کے ساتھ یہ مضمون لکھنے کے بعد آخر میں کسی عارف کا ایک واقعہ لکھا ہے جو شیطان یا نفس امارہ کے اغواء سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے اور سرکشی و نافرمانی کے جراثیم ان کی روح میں پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

وہ عارف ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ روتا چلاتا ہوا اس میں سے نکلا۔ اس کی ماں اس کو گھر سے دھکے دے دے کر نکال رہی تھی۔ جب وہ دروازہ سے باہر ہو گیا۔ تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بچہ اسی طرح روتا چلاتا بکتا بڑبڑاتا کچھ دور تک گیا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے سوا کہاں جا سکتا ہوں اور کون مجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ٹوٹے دل کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے تو وہ وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کر پڑ گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ ماں آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے بچے کو اس طرح چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور ماتا کا جذبہ ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوں بہنے لگے۔ بچہ کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو پیار کرنے لگی اور کہہ رہی تھی بیٹے تو نے دیکھا تیرے لئے میرے سوا کون ہے۔ تو نے نالائقی نادانی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اور میرا دل دکھا کر مجھے وہ غصہ دلایا جو تیرے لئے میری فطرت نہیں ہے۔ میری فطرت اور ماتا کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں تجھ سے پیار کروں اور تجھے راحت و آرام پہنچانے کی کوشش کروں۔ تیرے لئے ہر خیر اور بھلائی چاہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے تیرے لئے ہے۔ ان عارف نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس میں ان کے لئے جو سبق تھا وہ لیا۔

اس قصہ پر غور کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سامنے رکھئے کہ:

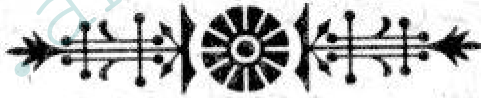
"خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچہ کے لئے۔"

یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ ایک عورت تھی جو بڑے والہانہ انداز میں اپنے بچہ کو بار بار اٹھا کے سینے سے لگاتی اور دودھ پلاتی تھی۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ ماتا کے جذبہ سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ

نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ: ''خدا کی قسم! اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچہ کے لئے ہے۔''

کیسے بدبخت اور محروم ہیں وہ بندے، جنہوں نے نافرمانی کی راہ اپنا کے ایسے رحیم وکریم پروردگار کی رحمت سے اپنے کو محروم کرلیا اور اس کے قہر وغضب کو بھڑکا رہے ہیں۔ حالانکہ توبہ کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ اس کی طرف قدم بڑھا کے اللہ رب العزت کا وہ پیار حاصل کرسکتے ہیں جس کے سامنے ماں کا پیار کچھ نہیں۔ اللہ انہیں حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

(۔۔۔۔۔ماہنامہ لولاک ملتان،۔۔۔۔۲۰۰۶ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

روزہ میں عبادت کا مقام

ایک نشری تقریر

روزہ ایک ایسا مفید عمل ہے کہ اس کے مفید و نافع ہونے پر حکماء واطباء اور ہر مذہب وملت کے ماننے والے متفق ہیں، نقطۂ نظر اپنا اپنا علیحدہ ہے حکیم ڈاکٹر روزہ کو اس لئے مفید بتاتے ہیں کہ وہ بدن انسانی کی صحت کا اور سینکڑوں امراض سے حفاظت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اہل مذاہب اس کو اس لئے مفید کہتے ہیں کہ وہ روحانی تندرستی کا بہترین ضامن اور انسان کا گناہوں سے تنقیہ کرنے میں نسخہ اکسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا آباد ہے ہر مذہب وملت میں روزہ کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے گو اس کی صورتیں مختلف مذاہب میں مختلف ہیں، اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ روزہ جس طرح خود ایک عظیم عبادت اور غیر محدود ثواب کا موجب ہے اسی طرح وہ انسان کو دوسری عبادات کے قابل بنانے اور ان کے لئے مہیا کرنے میں ایک خاص اثر رکھتا ہے جس کا جی چاہے یہ کرے کہ ایک گناہ کے چھوڑنے کی کوشش انسان کرتا رہتا ہے کامیابی نہیں ہوتی۔ لیکن روزہ کی حالت میں اس پر قابو پانا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ جو عبادت ہمیشہ بھاری نظر آتی ہے روزہ میں قدرتی طور پر آسان ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ وہ لوگ جو گیارہ مہینہ کی عبادت سے کوئی ذوق نہیں رکھتے۔ نماز فرض ادا کرنا بھی انھیں دوبھر نظر آتا ہے۔ رمضان میں

روزہ کی برکت سے وہ نہ صرف فرض نماز کے پابند ہوجاتے ہیں بلکہ تراویح جیسی طویل اور مشکل نماز کو ذوق وشوق سے ادا کرنے لگتے ہیں۔

اگر عبادت کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو روزہ کے ساتھ اس کا جوڑ خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ دیکھئے عبادت کے معنی ہیں بندگی۔ اور بندگی اسی کا نام ہے کہ اپنے آپ کو اپنے آقا کے سپرد کردے کہ اس کے حکم کا منتظر رہے جب بھی جس طرح کا حکم ملے اس کو بجالائے

عاشقی چیست بگو بندہ جانان بودن
دل بدست دگرے دادن حیران بودن

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ یہ سب عبادات کی مختلف صورتیں ہیں لیکن حقیقتِ عبادت جو سب میں مشترک ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کیلئے تیار کردے اور اس کے سپرد کردے۔ جیسا حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوا۔

اذقال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمين

جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان کے رب نے فرمایا کہ فرمانبردار ہوجاؤ تو انھوں نے عرض کیا کہ میں رب العالمین کا تابع فرمان ہوں۔

عبادت کی یہ حقیقت تمام شرائع ومذاہب میں ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اس کی صورتیں بدلی بھی جاسکتی ہے، کم وبیش بھی کی جاسکتی ہیں۔ قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔

ليس البران تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من امن بالله الآية۔

یعنی اصل عبادت یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف رُخ کرو یا مغرب کی طرف بلکہ اصلی عبادت اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت ہے۔

حقیقت عبادت واضح ہو جانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عبادات میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ یا نئی صورت گھڑنا جس کو اصطلاح میں بدعت کہا جاتا ہے اگر چہ صورت عبادت کی ہے، مگر حقیقت میں وہ عبادت نہیں کیونکہ وہ اپنی تجویز ہے، فرمان الٰہی کی پیروی نہیں۔ حدیث میں اس کو گمراہی اور موجب عذاب قرار دیا ہے۔ کوئی شخص ظہر کی رکعتیں چار کے بجائے پانچ یا مغرب کی چار ادا کرے یا اذان واقامت میں اپنی طرف سے اور کچھ کلمات بڑھادے تو اگر چہ بظاہر اس نے عبادت اور نیکی میں زیادتی کی ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے کہ اس نے اپنی پہلی نیکی کو بھی برباد کر دیا۔ وجہ وہی ہے کہ اس نے اپنے نفس کو تابع فرمان نہیں رکھا۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ عبادت کی حقیقت بندگی اور اپنے نفس کو مرضی مولا کے سپرد کرنا ہے تو اب یہ معلوم کرنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا کہ روزہ اس میں سب سے بڑا معین ومددگار ہے۔ کیونکہ بندگی اور تابعداری سے انسان کو روکنے والی چیز اس کی نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے۔ اور روزہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ایک معیّن وقت کے لئے خواہشات نفسانی کو ترک کیا جائے۔ اور جب کوئی شخص معیّن اوقات میں خواہشات نفسانی پر قابو پا سکتا ہے تو اس کو دوسرے اوقات میں بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے روزہ دار کے لئے عبادت آسان ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص کا رمضان سلامتی سے گزر جائے اس کا سارا سال سلامتی سے گذرے گا یعنی جو شخص رمضان میں گناہوں سے بچ گیا تو باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس کیلئے معاصی سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

قرآن کریم نے جہاں روزہ فرض ہونے کا ذکر کیا ہے اس کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ روزہ رکھنے سے تقویٰ وپرہیزگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے۔

یآ ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون.

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی و پرہیز گار بن جاؤ۔

اور خاص کر ماہ رمضان اور اس کے صیام وقیام کو انسان کی باطنی اور روحانی پاکی میں بڑا دخل ہے۔ اللہ جل شانہ نے اپنا کلام قرآن مجید نازل کرنے کے لئے اسی ماہ مبارک کو منتخب فرمایا بلکہ پچھلی تمام آسمانی کتابیں بھی اسی ماہ مبارک میں نازل ہوتی رہی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ میں ایک خطبہ دیا جس میں رمضان المبارک کے متعلق خصوصی احکام وفضائل کا بیان فرمایا، ہم اس طویل حدیث کا خلاصہ اردو زبان میں عوام کے فائدہ کے لئے بیان کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم پر ایک عظیم الشان مبارک مہینہ آرہا ہے جس میں ایک رات ایسی آئے گی جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہوگی یعنی اس رات کو عبادت میں مشغول رہنا ایسا ہوگا جیسے کوئی شخص ایک ہزار مہینے یا اس سے بھی زائد عبادت میں مشغول رہا ہو۔

پھر فرمایا کہ جو شخص اس ماہ مبارک میں کوئی نفلی عبادت ادا کرتا ہے وہ فرض کے برابر ثواب اور درجہ رکھتا ہے اور جو فرض عبادت ادا کرتا ہے وہ ستر فرضوں کے برابر ثواب پاتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ ماہ رمضان صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، کبھی اگر روزہ سے کچھ تکلیف پیش آئے تو اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے شور شغب نہ کرے۔ پھر فرمایا کہ ماہ رمضان ہمدردی وغمخواری کا مہینہ ہے یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس ماہ مبارک میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی وغمخواری کا سلوک کرے، ان کی حاجت پورا کرنے کی کوشش کرے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص بھوکے کو روٹی کھلائے یا ننگے کو کپڑا

پہنائے یا مسافر کو شب باشی کی جگہ دے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے اہوال (خوفوں) سے پناہ دیں گے۔

پھر فرمایا کہ اس ماہ مبارک میں مسلمان کا رزق بڑھتا ہے، جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے اس کو بھی اس کے روزہ کا ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔

پھر فرمایا کہ جو شخص رمضان المبارک میں اپنے غلام یا نوکر پر کام ہلکا کر دے تا کہ اس کو روزہ رکھنا آسان ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیں گے اور جہنم سے اس کو نجات دیں گے۔ اسی لئے سلف صالحین اور اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ ماہ رمضان میں نوکروں سے زیادہ محنت کا کام نہیں لیتے پھر ارشاد فرمایا کہ رمضان میں چار چیزوں کی پابندی لازمی سمجھو۔ ایک کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی کثرت، دوسرے استغفار، تیسرے حصول جنت کے لئے دعاء، چوتھے جہنم سے پناہ مانگنا۔

ایک حدیث میں ہے کہ تین شخصوں کی دعا رد نہیں ہوتی، ایک روزہ دار، دوسرے بادشاہ عادل، تیسرے مظلوم کی دعاء۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رمضان المبارک کی ہر رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی پکارتا ہے کہ اے نیکی کے طلبگار متوجہ ہو اور آگے بڑھ، اور اے برائی کے طلبگار بس کر اور آنکھیں کھول، اس کے بعد وہ منادی فرشتہ کہتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا تا کہ اس کی مغفرت کی جائے، ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کی توبہ قبول کی جائے۔ ہے کوئی دعاء کرنے والا کہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ ہے کوئی حاجت مانگنے والا جس کی حاجت پوری کی جائے۔

مسلمانو: یہ رمضان کے چند لمحات ہیں ان کی قدر کیجئے، پچھلے گناہوں سے توبہ واستغفار اور آئندہ کے لئے احتیاط و پابندی کا عزم پختہ کر لیجئے اور

ایک مرتبہ ہمّت کرکے عمل شروع کردیجئے پھر دیکھئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کیسی مدد پہنچتی ہے۔

حدیث: بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کے لئے حرام کھانے یا حرام کام کرنے یا غیبت وغیرہ کرنے کی وجہ سے) پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور بہت سے تہجد گزار ایسے ہیں جن کے لئے (ریاکاری کی وجہ سے) جاگنے کے سوا کچھ نہیں۔

(دارمی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(ماہنامہ البلاغ کراچی)



افادات: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مقامِ زُہد

چیست دنیا؟ از خدا غافل شدن!

''زُہد'' کے لغوی معنی ہیں: اپنی کسی مرغوب چیز کو کسی دوسری بہتر چیز کے لئے چھوڑ دینا، اسلامی اصطلاح میں زہد کا مطلب ہے آخرت کے لئے دنیا کو ترک کر دینا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ محض ''ترک دنیا'' کا نام ''زہد'' نہیں ہے، لہذا اگر کوئی شخص بے حسی کی بنا پر دنیا کو چھوڑ دے تو یہ ''زہد'' نہیں کہلا سکتا۔

پھر آخرت کے لئے بھی جس ''ترکِ دنیا'' کی ترغیب دی گئی ہے اس کا مطلب سمجھنے میں بھی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، بعض لوگ ''زہد'' کو ''رہبانیت'' کا مرادف سمجھنے لگتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ کھانا، پینا، تجارت یا کسب معاش کے ذرائع اختیار کرنا ''زہد'' کے خلاف ہے حالانکہ اس قسم کی ''ترکِ دنیا'' قرآن وسنت کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ہمیشہ یاد رکھئے کہ ایک تو ہیں دنیا کے مقاصِد ضروریہ جن کے بغیر انسانی زندگی کا بقاء ممکن نہیں اور جنھیں حاصل کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، مثلاً بقدرِ ضرورت کھانا پینا اور حصولِ معاش کی کوشش ایسی چیزوں کو ''حقوق نفس'' کہا جاتا ہے، اور شریعت نے انسان کے ذمّے ضروری قرار دیا ہے کہ ''نفس'' کے ان ''حقوق'' کو ادا کیا جائے، اور انہی حقوق کو ترک کرنے کا نام ''رہبانیت'' ہے جس کی قرآن کریم نے ممانعت فرمائی ہے۔

اور حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

طلب المعاش فریضة بعد الفریضة

''طلب معاش فرائض اسلام کے بعد دوسرا فریضہ ہے''

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی وجہ سے اپنے متوسلین کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی ''صحت'' کا خالص خیال رکھا کریں، کیونکہ وہ حقوق نفس میں سے ہے اور اگر صحت خراب ہو جائے تو آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز ہے ''حظوظِ نفس''، یعنی وہ نفسانی لذتیں جن پر نہ انسان کی بقاء موقوف ہے اور نہ ان کی تحصیل انسان کی فطرت میں داخل ہے، انسان انھیں محض اپنی زائد از ضرورت نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس قسم کی خواہشات کو ترک کرنے کا نام ''زہد'' ہے اور یہ اسلام میں مطلوب ومحبوب ہے، قرآن وحدیث یا فقہاء وصوفیاء کے کلام میں ''ترک دنیا'' سے مراد ہمیشہ یہ ''زہد'' ہی ہوتا ہے۔ ''رہبانیت'' نہیں۔

صوفیاء کرام نے فرمایا ہے کہ ''زہد'' کے تین درجات ہیں۔

❶ سب سے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ مال ومتاع سے دل میں ایسا اعراض اور نفرت ہو کہ کوئی بے مانگے بھی دے جائے تو اچھا نہ لگے۔ مگر اس نفرت کے باوجود اسے بقدر ضرورت استعمال کرے، اور ضروریاتِ اصلیہّ سے زائد حصے کو چھوڑ دے، یہ اعلیٰ مقام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''مالی وللدنیا انّما أنا کمثل راکب استظلّ تحت شجرة ثم ارتحل (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

مجھے دنیا سے کیا کام؟ میری مثال تو اس شہسوار کی سی ہے جو ذرا دیر کے لئے کسی درخت کی چھاؤں لیتا ہے پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا معمول کھانے پینے میں یہ تھا کہ بہت تھوڑی مقدار پر اکتفا

فرماتے تھے۔ شمائل ترمذی کی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ آپ نے کبھی ''سیر'' ہوکر کھانا تناول نہیں فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ہم مہینوں تک صرف پانی اور کھجور پر اکتفاء کرتے تھے۔

❷ زہد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی نہ دنیوی مال ومتاع سے بالکل نفرت کرتا ہو اور نہ اس کی کوئی خاص رغبت ہو، کوئی زائد از ضرورت چیز بھی مل گئی تو اللہ کا شکر کر کے استعمال کی، اور اگر کچھ نہ ملا تو بھی چنداں رنج وافسوس نہ ہوا،

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں ان کا سارا مال چوری ہوگیا۔ چوروں نے ان کے گھر میں بالکل جھاڑو ہی دیدی، ایک چیز نہ چھوڑی، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو پتہ چلا تو چنداں ملال کا اظہار نہ فرمایا بلکہ ایک خاص کیفیت میں یہ مصرعہ پڑھا۔ ؏

ماہیچ نہ داریم غمِ ہیچ نہ داریم

اتفاق سے متوسلین کی کوشش سے وہ مال مسروقہ دوبارہ مل گیا، تو اس پر بھی مسرت کا اظہار فرمایا اور اسے استعمال کیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی اسی قسم کا واقعہ منقول ہے۔

❸ زُہد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کو دنیا کی طرف رغبت تو ہو، مگر اس کی فکر میں زیادہ نہ پڑے، اسی وجہ سے دنیا کی محبت اسے اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی یہ درجہ ''قناعت'' بھی کہلاتا ہے، اسی کو حضرت مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

چیست دنیا، از خدا غافِل شدن
نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

یعنی سونا چاندی اور بیوی بچے دنیا نہیں، دنیا یہ ہے کہ آدمی کی توجہات اور فکری وعملی توانائیوں کا سارا مرکز یہ چیزیں بن جائیں، اور وہ خدا سے غافل ہو جائے، لہذا

اگر کوئی شخص مالدار ہے مگر اس کی دولت اسے اللہ سے غافل نہیں کرتی تو یہ ''دنیا'' نہیں، اور اگر کسی کے پاس چار ہی پیسے ہیں۔ مگر انہیں میں اس کا دل الجھا ہوا ہے تو یہ ''دنیا'' ہے اور مذموم ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ بہت بڑے تاجر تھے، ایک شخص ان کی بزرگی کا شہرہ سنکر ان کے پاس بڑی عقیدت کے ساتھ بیعت ہونے کے لئے پہنچا۔ مگر دیکھا کہ ان کے اوقات کا بڑا حصہ تجارت اور کاروبار میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے دل میں شبہ پیدا ہوا اور اس نے اُن بزرگ سے کہا کہ: ''حضرت! کیا یہ اتنا بڑا کاروبار زُہد کے منافی نہیں''۔ بزرگ نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا، پھر ایک دن تفریح کے لئے وہ اپنے مرید کو لیکر آبادی سے دور نکل گئے۔ وہیں انھوں نے اچانک مرید سے کہا کہ: ''بھائی! حج کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' مرید نے کہا: ''حضرت! دل تو میرا بھی چاہتا ہے''۔ بزرگ نے کہا: ''پھر چلو!'' اور یہ کہہ کر مکہ مکرمہ کی سمت چل پڑے، مرید نے کہا: ''حضرت! میری ایک چادر شہر میں رہ گئی ہے، ذرا وہ لے آؤں''۔ اس پر بزرگ نے فرمایا: ''تمہیں اپنی چادر کی تو بڑی فکر ہوئی، مگر یہ نہ دیکھا کہ ہمارا کاروبار کس قدر پھیلا پڑا ہے۔ مرید کو اس موقعہ پر تنبہ ہوا اور اس نے کہا کہ بات سمجھ میں آ گئی''۔

حضرت مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت دلنشین مثال سے اس کو سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انسان کی مثال کشتی کی سی ہے، اور دُنیا'' کی مثال پانی کی سی ہے کشتی کے لئے پانی اس قدر ناگزیر ہے کہ کشتی اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی، اور جب تک پانی کشتی کے ارد گرد رہے اس کے لئے رحمت ہے، لیکن اگر یہی پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو وہی کشتی کی تباہی کا سامان بن جاتا ہے، بالکل یہی حال دنیا کا ہے کہ جب تک وہ انسان کے ارد گرد ہے تو اس کے لئے رحمت ہے، لیکن اگر انسان کے دل میں داخل

ہو جائے تو یہی دنیا انسان کو تباہ کر ڈالتی ہے ؎

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

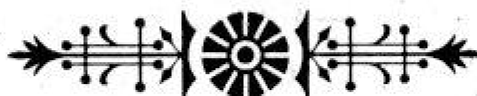
حقیقت یہ ہے کہ اس حکیمانہ مثال سے مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''دنیا'' کی حقیقت اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ بس! ''زہد'' کی روح یہ ہے کہ آدمی کا دِل اللہ کے سوا ہر چیز سے خالی ہو، خواہ وہ بیوی بچوں کے عین درمیان رہے۔ کسب معاش کی کوششیں بھی کرے۔ کھائے اور پئے بھی، آرام اور تفریح بھی کرے، لیکن ان میں سے کسی چیز کی محبت کو اپنے دل پر غالب نہ ہونے دے، اور اسے یادِ خدا کے لئے مخصوص رکھے، اکبر نے کیا خوب کہا ؎

یہ کہاں کا فسانۂ سود وزیاں' جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصتِ عمر ہے کم، جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

ہمارے حضرت مجذوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

اس زمانے میں ''زہد'' کے پہلے دو درجات کو حاصل کرنا مشکل ہے اور اگر فقر وفاقہ حد سے گزر جائے تو موجودہ حالات میں گناہوں کا سبب بھی بن سکتا ہے، اس لئے محقق صوفیاء کا کہنا ہے کہ اس دور میں تیسرے درجے کو حاصل کرنے کی کوشش کیجائے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے متوسلین سے فرمایا کرتے تھے کہ تم سب کے بدلے فقر وفاقہ میں نے کرلیا ہے، تمہارا زہد یہ ہے کہ حلال راستوں سے معاش حاصل کرو، اور خدا کی یاد سے غافل نہ ہو۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی دسمبر ۱۹۶۸ء)



افادات: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مقامِ توکّل

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہٖ الکریم

بعض ناواقف لوگوں نے ''توکل'' کو بہت غلط استعمال کیا، انھوں نے اسباب کو بالکل ترک کردینے کا نام توکل رکھا ہے، بعض صوفیاء نے جو اپنے کچھ اقوال یا اشعار میں ترک اسباب کو قابل تعریف قرار دیا ہے۔ یہ لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں، حالانکہ ان کا منشأ یہ تھا کہ ظاہری اسباب کی حقیقت ہر آن پیش رکھو کہ حقیقت میں نہ وہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، نفع وضرر تمامتر اللہ ہی کے قبضے میں ہے، ان کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ظاہری اسباب کو بالکل چھوڑ دو۔

برتوکل پایۂ اشتر بہ بند

یہاں ''ترکِ سبب'' کے مسئلے کی تھوڑی سی تفصیل عرض کردینا مناسب ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنے کام کرتا ہے اس سے یا جلب منفعت (نفع حاصل کرنا) مقصود ہوتا ہے یا حفظ منفعت (حاصل شدہ نفع کی حفاظت) مقصود ہوتا ہے یا دفع مضرت (کسی نقصان کو ختم کرنا) انہیں چار کاموں کے لئے ساری دنیا دن رات سرگرداں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کام کے لئے کچھ اسباب بنائے ہیں، ان اسباب کی تین قسمیں ہیں۔

یقینی اسباب

یعنی ایسے اسباب جن کے ذریعہ مسبب کا حصول یقینی ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک لگ رہی ہے، روٹی سامنے رکھی ہے، یقین ہے کہ اس کے کھالینے سے بھوک رفع ہوجائیگی ایسے اسباب کو چھوڑ دینا توکل نہیں، جنون ہے، اور شرعاً حرام ہے۔

ظنّی اسباب

یعنی ایسے اسباب جن کو اختیار کرنے سے مسبّب کا حصول پوری طرح یقینی تو نہیں ہے، لیکن عادتاً ہوجایا کرتا ہے۔ مثلاً تجارت، زراعت وغیرہ کے ذریعہ معاش کا حصول، ایسے اسباب کو ترک کرنے کی بھی دوصورتیں ہیں، ایک یہ کہ نہ سبب کو اختیار کرے نہ اسباب کے ماحول میں رہے، مثلاً کوئی شخص جا کر جنگل میں جا کر بیٹھ جائے۔ یہ تو شرعاً ناجائز ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اسباب کے ماحول میں رہ کر اسباب کو چھوڑ دے، مثلاً شہروں میں لوگوں کے ساتھ رہے لیکن کسب معاش کی فکر نہ کرے۔ عام حالات میں تو یہ بھی جائز نہیں، لیکن چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

(الف) صاحب عیال نہ ہو یعنی کسی کا نان ونفقہ شرعاً اس کے ذمّہ نہ ہو۔

(ب) صاحب عزم اور پختہ کار ہو۔

(ج) ہر حال میں راضی برضا رہے۔

(د) کسی سے صراحۃً یا اشارۃً سوال نہ کرے۔

ان شرائط کے ساتھ کوئی شخص علاجاً اسباب معاش کو ترک کرے تو شرعاً جائز ہوگا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہوگئی تو ناجائز ہوجائیگا۔ جن صوفیاء کرام سے منقول ہے کہ وہ اسبابِ معاش کو ترک کرکے بیٹھ گئے تھے ان کا حال یہی تھا کہ وہ واقعۃً راضی برضا تھے، اولوالعزم اور پختہ کار تھے، کسی دیکھنے والے کو گمان ہی

نہ ہوتا تھا کہ یہ فاقہ سے ہیں، یا انھیں روپے پیسے کی کوئی ضرورت ہے، قرآن کریم نے اصحابِ صفّہ کی یہی شان بیان فرمائی ہے کہ:

یحسبھم الجاھل اغنیاءَ من التعفّف (بقرہ)

ناواقف آدمی ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے انھیں مالدار سمجھتا ہے۔

پھر یہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ جن حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا صوفیاء کرام سے اسبابِ معاش کو ترک کرنا منقول ہے، وہ کسی دینی یا اجتماعی ضرورت یا علاجِ نفس کے لئے تھا، ورنہ عام حالات میں افضل بہرصورت یہی ہے کہ انسان کسبِ معاش کرے اور یہ توکل کے کسی طرح منافی نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اونچے درجے کے عارفین کا توکل یہی ہے کہ وہ کسبِ معاش کرکے نظر اللہ کے سوا کسی اور پر نہیں رکھتے۔

انوارِ سہیلی فارسی کی مشہور کتاب ہے، اس میں ایک بڑی حکیمانہ حکایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ایک کوّے کو دیکھا کہ اُس کے پر کٹے ہوئے ہیں، وہ دل میں سوچنے لگا کہ یہ بیچارہ کیسے زندہ رہے گا؟ اس کے لئے خوراک کیسے مہیّا ہوگی؟ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک عقاب نظر آیا جو اپنی چونچ میں ایک شکار پکڑ کر لایا تھا، یہ عقاب کوّے کے قریب پہنچا اور کوّے کے منہ میں شکار ڈال گیا۔ اس شخص نے جب یہ دیکھا تو خیال آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوقات کو اس طرح بھی رزق دیتا ہے۔ پھر میں تلاشِ معاش کی فکر کیوں کروں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ خود میرے لئے رزق بھیجے گا، چنانچہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا، کئی روز گزر گئے، مگر اسے کچھ نہ ملا۔ پھر کسی حکیم نے اسے سمجھایا کہ بندۂ خدا تجھے دو پرندے دکھلائے گئے تھے، ایک پر کٹا کوّا، دوسرے عقاب، تو نے کوّا بننے کو ترجیح کیوں دی؟ عقاب بننے کا خیال کیوں نہ آیا؟ جو خود بھی کھاتا ہے اور دوسرے معذوروں کو بھی کھلاتا ہے۔

یہ حکایت توکل کی حقیقت کی بالکل ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرتی ہے، جس شخص

کے پاس اسباب دوسائل موجود ہوں اس کا اسباب کا چھوڑ دینا غلط ہے۔ اس کی مثال عقاب کی سی ہے، اسے خود بھی کھانا چاہئے، دوسروں کو بھی کھلانا چاہئے۔ ہاں! اگر کوئی شخص معذوری یا مجبوری سے اسباب سے محروم ہو جائے تو پھر یہ غیر معمولی فکر بھی غلط ہے کہ روزی کہاں سے آئے گی؟ اس کو ہر آن یہ سوچنا چاہئے کہ اسباب ووسائل تو چند آلات تھے، اصل رزّاق تو اللہ ہے، اگر اسے زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ کوئی نہ کوئی انتظام کرے گا۔

چنانچہ صوفیاء کرام نے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے کہ جن صورتوں میں انسان کے لئے ترک سبب جائز ہوتا ہے ان صورتوں میں بھی اسبابِ عادیہ کو ترک کر کے توکل کرنا بہتر ہے یا اسباب عادیہ کو اختیار کر کے؟ شیخ عبداللہ تستری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرنے پر زبان طعن دراز کرے وہ اللہ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے، اور جو شخص (جائز مواقع پر) اسبابِ عادیہ کو ترک کرنے پر اعتراض کرتا ہے وہ توحید کی حقیقت کا انکار کرتا ہے، لہٰذا ایسے موقعہ پر جائز تو دونوں ہیں، لیکن افضل واعلیٰ طریقہ وہی ہے جس کی تعلیم انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دی ہے اور جو ان حضرات کی سنت ہے، اور وہ یہ کہ اسباب کو اختیار بھی کیا جائے، لیکن بھروسہ تمام تر اللہ پر ہو، اسباب کو کارساز نہ سمجھا جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے **"اعقل ساقھا وتوکل"** کے سادہ مختصر اور بلیغ جملے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

عصر حاضر میں خاص طور سے "توکل" کا صحیح طریقہ یہی ہے، کیونکہ جن مواقع پر ترک اسباب جائز ہوتا ہے وہاں بھی اسباب کو چھوڑنے سے آجکل سینکڑوں فاسد اور غوائل کا خطرہ ہے، اور یہ چیز کم از کم کبر تو پیدا کر ہی دیتی ہے۔

۳ اسبابِ خفیّہ

ہاں اسباب کی ایک قسم اور ہے جسے اسباب خفیّہ کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے، اور وہ ہے دور از کار اور باریک تدبیروں کے پیچھے پڑنا۔ یہ چیز بلاشبہ "توکل" کے منافی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس مقصد کو بھی حاصل کرنا ہو، اس کے لئے سامنے کے ان ظاہری اسباب کو تو ضرور اختیار کیا جائے جو انسان کے بس میں ہوں قلب و دماغ کو لمبی چوڑی تدبیروں کی فکر سے آزاد رکھا جائے، حدیث میں آں حضرت ﷺ نے اسی بات کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ۔

اجملوا فی الطّلب وتوکلّوا علیہ .

کسی چیز کو طلب کرنے میں اختصار سے کام لو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان افراد کا ذکر فرمایا ہے جو بے حساب جنت میں داخل ہونگے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو:

لایکتوون.

داغ دینے کا علاج نہیں کرتے۔

اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ باریک تدبیروں کے پیچھے لگنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ اہل عرب میں لوہے کے ذریعہ داغ دینے کا علاج آخری سمجھا جاتا تھا، مقولہ مشہور ہے کہ "آخر الدواء الکیّ". (آخری دوا داغ دینا ہے) خود آنحضرت ﷺ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ سامنے کے اسباب اور تدبیروں کو اختیار فرماتے اور اس کے بعد یہ دعا فرماتے کہ:

اللھم ھذا الجھد وعلیك التکلان

اے اللہ یہ اپنی سی کوشش تھی اور بھروسہ آپ ہی پر ہے۔

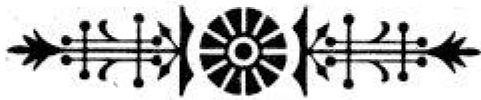
۱۸۵۷ء کے جہاد میں دہلی کے چند بزرگ ایک مکان میں محصور ہو گئے، باہر قتل عام ہو رہا تھا، اس لئے نکلنا ممکن نہ تھا پانی کا جتنا ذخیرہ مکان کے اندر موجود تھا وہ دو تین روز میں ختم ہو گیا۔ جب پیاس سے عاجز ہو گئے تو ایک بزرگ نے پیالہ لے کر پر نالے کے نیچے رکھدیا اور دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس کا تو اتنا ہی کام تھا، آگے بارش

برسانا آپ کا کام ہے، چنانچہ اللہ کے فضل وکرم سے بارش ہوئی اور سب لوگ سیراب ہوئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اسباب کو بالکل چھوڑ بیٹھنا غلط ہے، لیکن توکل کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو اسباب کی حقیقت ہرآن ذہن میں مستحضر رہے اور کسی بھی مرحلے پر ظاہری اسباب پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے اختصار اور اعتدال کے ساتھ اسباب کو اختیار کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔

البتہ افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کے اس راستہ کو اختیار کرنا بہت مشکل کام ہے، اور عادتاً کسی شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر اس مقام کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ''مقامِ توکل'' کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی شیخ کامل سے رجوع کر کے اپنے حالات وواقعات سے اسے باخبر رکھا جائے، اور اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی مارچ ۱۹۶۹ء)

مزدکی ہوکہ فرنگی، ہوس خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے



مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عدالت کا مفہوم

لفظ عدول، عدل کی جمع ہے، یہ اصل میں مصدر ہے، جسے برابر کرنے کے معنیٰ میں، اور محاورات میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو حق وانصاف پر قائم ہو۔ یہ لفظ قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے۔ حدیث میں بھی، کتب تفسیر میں بھی اس پر بحث ہے اور اصول حدیث اصول فقہ اور عام فقہ میں اس کے اصطلاحی اور شرعی معنیٰ کی تعیین کی گئی ہے، ابن صلاح رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تفصیله أن یکون مسلمًا، بالغًا عاقلا، سالمًا من اسباب الفسق وخوارم المروة (علوم الحدیث لابن صلاح)

اس کی تفصیل یہ کہ انسان مسلمان، بالغ، عاقل ہو، اور اسباب فسق سے نیز خلافِ مروت افعال سے محفوظ ہو۔

اور شیخ الاسلام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''تقریب'' میں فرمایا:۔

عدلاضابطا بأن یکون مسلمًا ،بالغًا عاقلًا سلیمامن اسباب الفسق وخوارم المرؤة ،

علامہ سیوطی نے اس کی شرح ''تدریب'' میں فرمایا:

وفسر العدل بأن یکون مسلمًا بالغًا عاقلًا الیٰ قوله سلیمامن اسباب الفسق وخوارم المرؤة" (تدریب الراوی ص ۱۹۷)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح نخبۃ الفکر میں فرمایا:

والمراد بالعدل من لہٗ ملکۃ تحملہ، علیٰ ملازمۃ التقویٰ والمروٴۃ والمراد بالتقوی اجتناب الاعمال السیئۃ من شرکۃ اوفسق اوبدعۃ،

''عدل'' سے مراد وہ شخص ہے جسے ایسا ملکہ حاصل ہو جو اسے تقویٰ اور مروت کی پابندی پر برانگیختہ کرے، اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعت جیسے اعمالِ بد سے اجتناب ہے۔

درمختار، کتاب الشہادت میں عدالت کی تفسیر یہ کی ہے:

ومن ارتکب صغیرۃ بلا اصرار ان اجتنب الکبائر کلھا وغلب صوابہ علی صغائرہ دررو غیرھا قال وھو معنی العدالۃ قال ومتی ارتکب کبیرۃ سقطت عدالتہٗ

اور وہ شخص (بھی عادل ہے) جس سے صغیرہ گناہ بغیر اصرار (مداومت) کے صادر ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ تمام گناہ کبیرہ سے پرہیز کرتا ہو، اور اس کے درست افعال اس کے صغیرہ گناہوں سے زیادہ ہوں (درر وغیرہ) یہی عدالت کے معنی ہیں اور کوئی شخص جب کبھی کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی۔

اس کی شرح میں ابن عابدین نے فرمایا:

فی الفتاویٰ الصغریٰ حیث قال العدل من یجتنب الکبائر کلھا حتی لوارتکب کبیرۃ تسقط عدالتہ وفی الصغائر لعبرۃ بغلبہ اوالاصرار علی الصغیرۃ فتصیر کبیرۃ ولذا قال غلب صوابہٗ آہ، قولہٗ (سقطت عدالتہ) وتعود اذا تاب.

(ردالمحتار ابن عابدین شامی ص ۵۲۳)

فتاویٰ صغریٰ میں لکھا ہے کہ ''عدل'' وہ جو تمام کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، یہاں تک

کہ اگر ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب بھی کر لے گا تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی اور صغیرہ گناہوں میں اعتبار اکثریت کا ہے، یا پھر کسی صغیرہ گناہ پر اصرار (مداومت) کا۔ کیونکہ اس صورت میں صغیرہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے اس لئے مصنف (درمختار) نے یہ کہا ہے کہ اس کے درست افعال زیادہ ہوں، اور مصنف نے جو یہ کہا ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب سے عدالت ساقط ہو جائے گی (اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہئے) کہ اگر وہ توبہ کر لے تو عدالت لوٹ آئے گی۔

فقہاء ومحدثین کی مذکورہ بالا تصریحات میں عدل اور عدالت کی ایک ہی تفسیر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان عاقل بالغ ہو اور کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، کسی صغیرہ گناہ پر مصر نہ ہو اور بہت صغیرہ گناہوں کا عادی نہ ہو، یہی مفہوم شرعی ہے تقویٰ کا۔ جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت مذکورہ میں ہے، جس کا بالمقابل ''فسق'' ہے جس شخص کی عدالت کو ساقط قرار دیا جائے گا تو اصطلاح شرع میں اس کو ''فاسق'' کہا جائے گا۔ اوپر جن حضرات سے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عدول ہونے پر اجماع امت نقل کیا گیا ہے ان کی اپنی عبارتوں سے بھی عدل اور عدالت کی یہی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

ایک اشکال وجواب

یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف امت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم معصوم نہیں، ان سے کبیرہ صغیرہ ہر طرح کے گناہ کا صدور ہو سکتا ہے اور ہوا بھی ہے۔ دوسری طرف یہ عقیدہ اوپر لکھا گیا ہے کہ سب کے سب عدول ہیں اور عدل کے معنیٰ اصطلاحی بھی سب کے نزدیک یہ ہیں جو کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب اور صیغرہ پر مصر نہ ہو، اور جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا۔ یا صغیرہ پر اصرار ثابت ہو گیا وہ ساقط العدالت کہلائے گا، جس کا اصطلاحی نام فاسق ہے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ان دونوں عقیدوں میں ہے۔

اس کا جواب جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اگر چہ کوئی بڑا کبیرہ گناہ بھی سرزد ہوسکتا ہے اور ہوا بھی ہے مگران میں اور عام افراد امت میں ایک فرق ہے کہ گناہ کبیرہ وغیرہ سے جو کوئی شخص ساقط العدالت یا فاسق ہوجاتا ہے، اب اس کی مکافات توبہ سے ہوسکتی ہے، جس نے توبہ کرلی یا کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس کی حسنات کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کا یہ گناہ معاف کردیا وہ پھر عدل اور متقی کہلائے گا۔ اور جس نے توبہ نہ کی وہ ساقط العدالت فاسق قرار دیا جائے گا

اب توبہ کے معاملے میں عام افراد امت اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ عام افراد کے بارے میں اس کی ضمانت نہیں ہے کہ انہوں نے توبہ کی یا نہیں کی، اور نہ یہ معلوم ہے کہ ان کی حسنات نے سب سئیات کا کفارہ کردیا۔ ان کے بارے میں جب تک توبہ کا ثبوت نہ ہوجائے یا کسی ذریعہ سے عند اللہ معافی کا علم نہ ہوجائے ان کو ساقط العدالت فاسق ہی قرار دیا جائے گا۔ نہ ان کی شہادت مقبول ہوگی نہ دوسرے معاملات میں ان کا اعتبار کیا جائے گا۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ ایسا نہیں، اول تو ان کے حالات کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ گناہ سے کتنے ڈرتے اور بچتے تھے، اور کبھی کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو اس کی توبہ صرف زبانی کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کوئی اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لئے پیش کردیتا ہے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا ہے، جب تک قبول توبہ کا اطمینان نہیں ہوجاتا۔ اس کو صبر نہیں آتا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس خوف وخشیت کا تقاضا یہ ہے کہ جن حضرات سے توبہ کرنے کا اظہار بھی نہیں ہوا ہم ان کے بارے میں بھی یہی ظن رکھیں کہ انہوں نے ضرور توبہ کرلی ہوگی، دوسرے ان کے حسنات اور سوالق اتنے عظیم اور بھاری ہیں کہ ان کے مقابلہ میں عمر کا ایک آدھ گناہ حق تعالیٰ کے وعدے کے مطابق معاف ہی ہوجانا چاہئے: وعدہ یہ ہے: ان الحسنات یذھبن السئیات.

یہاں تک تو ہر مسلمان کو خود بھی بغیر کسی واضح دلیل کے یہ اعتقاد و اعتماد رکھنا عقل و انصاف کا تقاضا ہے۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے معاملے میں ہمارا صرف یہ گمان ہی نہیں، قرآن کریم نے اس گمان کی تصدیق بار بار کردی، کبھی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خاص خاص جماعتوں کے لئے اس کا اعلان کردیا، کبھی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم و سابقین و آخرین کے لئے اعلان عام کردیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے راضی ہے۔

بیعت حدیبیہ جس کو قرآنی بشارت کی وجہ سے بیعت رضوان اور بیعت شجرہ بھی کہا جاتا ہے اس میں جو تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم شریک تھے، ان کے بارے میں کھلے الفاظ سے یہ اعلان فرمایا؛

لقد رضی اللّٰہ عن المومنین اذیبایعونك تحت الشجرۃ،

اللہ تبارک وتعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہوگیا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بیعت تحت الشجر ۃ میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کسی کو جہنم کی آگ نہ چھو سکے گی، اس مضمون پر متعدد احادیث مختلف الفاظ اسنادِ صحیحہ کے ساتھ کتب حدیث و تفسیر میں موجود ہیں۔ اور عام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اولین و آخرین کے حق میں یہ اعلان سورۂ توبہ میں اس طرح آیا:

السابقون الأولون من المهاجرين والانصارو الذين اتبعوهم باحسان رضی اللّٰہ عنهم ورضوا عنه واعد لهم جنت تجری تحتها الانهٰر خلدين فيها ابداًو ذلك الفوز العظيم.

مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔

اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کئے ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ عظیم کامیابی ہے۔

سورۃ "الحدید" میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں اعلان فرمایا:

وکلاو عد اللّٰہ الحسنی

اللہ نے ان میں سے ہر ایک سے حسنیٰ کا وعدہ کرلیا ہے۔ پھر سورۂ انبیاء میں حُسنیٰ کے متعلق یہ ارشاد ہے۔

ومن سبقت لھم مناالحسنی اولئك عنھا مبعد ون.

یعنی جس کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر کردی گئی ہے وہ اس جہنم سے دور کئے جائینگے۔

اس کا حاصل ظاہر ہے کہ سب ہی صحابۂ کرام کے حق میں یہ فیصلہ فرمادیا کہ وہ جہنم سے دور رکھے جاویں گے۔

نیز سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

لقد تاب اللّٰہ علی النبی والمھاجرین والانصار الذین اتبعوہ فی ساعة العسرة من بعد ما کادیزیغ قلوب فریق منھم ثم تاب علیھم، انهٗ بھم رؤف رحیم.

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار کی توبہ قبول فرمائی، جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی پیروی کی، بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک فریق کے دل کج ہوجائیں، پھر اللہ نے ان کو معاف کردیا، بلاشبہ وہ ان پر بہت مہربان رحمت کرنے والا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی ضمانت دیدی کہ حضراتِ صحابہ سابقین وآخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کرلے گا، یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ونصرت اور دین کی

خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو معاف کردے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہوکر وہ صاف بیباق ہوجائیں اس لئے ان میں سے کسی بھی صحابی کو ساقط العدالت یا فاسق نہیں کہا جاسکتا، صدورِ گناہ کے وقت اس پر تمام وہی احکام نافذ ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں پر ہوئے۔ حدِ شرعی یا تعزیری سزائیں جو عام مسلمانوں کے لئے ہیں وہ ان پر جاری کی جائیں گی۔ اور صدور گناہ کے وقت اس عمل کو فسق بھی کہا جائے گا جیسا کہ آیت ان جاء کم فاسق بنبإٍ سے معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ ان کی توبہ یا معافی بنص قرآن معلوم ہوچکی ہے اس لئے ان کو کسی وقت بھی ساقط العدالت فاسق نہ کہا جائے گا۔ کذا حققہ الآلوسی فی روح المعانی تحت آیۃ: ان جاء کم فاسق،

قاضی ابویعلی نے آیت رضوان کے تحت فرمایا:

والرضی من اللّٰہ صفت قدیمۃ فلا یرضی الامن عبد یعلم انہ یوفیہ علی موجباتِ الرضی ومن رضی اللّٰہ عنہ لم یسخط علیہ ابداً. (الصارم المسلول لابن تیمیۃ)

اور اللہ کی خوشنودی، باری تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ صرف اس بندے سے راضی ہوتا ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ رضامندی کے موجبات کا جامع ہے اور جس سے اللہ راضی ہوجائے اس پر کبھی ناراض نہیں ہوگا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے غیر معصوم ہونے اور سب کے عدول میں جو ایک ظاہری تعارض ہے اس کا جواب جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک یہی ہے اور وہ بالکل واضح اور صاف ہے۔

اور بعض علماء نے جو عدم عصمت اور عموم عدالت کے تضاد سے بچنے کے لئے عدالت کے مفہوم میں یہ ترمیم فرمائی کہ یہاں عدالت سے مراد تمام اوصاف واعمال کی عدالت نہیں بلکہ صرف روایت میں کذب نہ ہونے کی عدالت مراد ہے، یہ لغت

اور شرع پر ایک زیادتی ہے جس کی کوئی ضرورت اور کوئی وجہ نہیں۔ اور ان حضرات کے پیش نظر بھی اس ترمیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی رو سے کسی صحابی کو اپنے عمل وکردار کی حیثیت سے ساقط العدالت یا فاسق قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے کلمات دوسرے مواقع میں خود اس کی نفی کرتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک مضمون حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے فتاویٰ کے حوالہ سے منسوب کیا گیا ہے یہ مضمون ...... ایسا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے جامع علوم بزرگ کی طرف اس کی نسبت کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی، اور فتاویٰ عزیزی کے نام سے جو مجموعہ شائع ہورہا ہے اس کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے نہ خود ان کو جمع فرمایا ہے نہ ان کی زندگی میں وہ شائع ہوا ہے وفات کے معلوم نہیں کتنے عرصہ بعد مختلف لوگوں کے پاس جو ان کے خطوط وفتاویٰ دنیا میں پھیلے ہوئے تھے ان کو جمع کرکے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں بہت سے احتمالات ہوسکتے ہیں۔ کہ کسی نے کوئی تدلیس اس میں کی ہو اور غلط بات ان کی طرف منسوب کرنے کے لئے فتاویٰ کے مجموعہ میں شامل کردیا ہو اور اگر بالفرض یہ واقعی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کا قول ہے تو وہ بھی بمقابلہ جمہور علماء وفقہاء کے متروک ہے۔ (واللہ اعلم)

علم عقائد وکلام کی تقریباً سبھی کتابوں میں اسی طرح اصولِ حدیث کی سب کتابوں میں اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے، جس میں سے چند کے حوالے اس جگہ نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

۲ حدیث اور اصول حدیث کے امام ابن صلاح رحمہ اللہ تعالیٰ ”علوم حدیث“ میں تحریر فرماتے ہیں:

للصحابة باسرهم خصيصة وهي انه لايسئال عن عدالة احدمنهم بل ذلك امر زوغ عنه لكونهم على الاطلاق

عدلين بنصوص الكتاب و السنة و اجماع من يعتد به في الاجماع من الامة قال تعالىٰ : كنتم خير امة اخرجت للناس قيل اتفق المفسرون على انه وارد في اصحاب رسول اللّٰه صلى الله عليه و سلم (ثم سرد بعض النصوص القرآنية والاحديث كماذكرناسابقاً)

(علوم الحديث ص ٢٦٤)

تمام صحابۂ کرام کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت (ثقہ و متقی) ہونے کا سوال بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے قرآن وسنت کے نصوص قطعیہ اور اجماع امت جن لوگوں کا معتبر ہے ان کے اجماع سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: کہ تم بہترین امت ہو کہ جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی، ہے بعض علماء نے فرمایا کہ مفسرین حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت اصحاب رسول اللہ ﷺ کی شان میں آئی۔

❸ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے مقدمہ استیعاب میں فرمایا:

فهم خير القرون وخير امة اخرجت للناس ثبتت عدالة جميعهم بثناء الله عزوجل عليهم وثناء رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم والا اعدل ممن ارتضاه اللّٰه بصحبة نبيه صلى اللّٰه عليه وسلم ونصرته ولا تزكية افضل من ذالك ولاتعديل اكمل منها قال تعالىٰ :محمد رسول الله والذين معه الآية.(الا ستيعاب تحت الاصابه ص ١٢\ج ١)

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہر زمانے کے افراد سے افضل ہیں اور وہ بہترین امت ہیں جسے اللہ نے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے پیدا فرمایا: ان سب کی عدالت اس طرح ثابت ہے کہ اللہ نے بھی ان کی تعریف وتوصیف فرمائی اور رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، اوران لوگوں سے بڑھ کرکون عادل ہوسکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور نصرت کے لئے چن لیا ہو کسی شخص کے حق میں عدالت وثقاہت کی کوئی اس شہادت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔

۴ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک رسالہ اصطخری کی روایت سے منقول ہے اس میں فرمایا:

لا یجوز لا حدان یذ کر شیئا من مساویھم ولا ان یطعن علی احد منھم بعیب ولا نقص فمن فعل ذلك وجب تادیبہ و قال المیمونی سمعت احمد یقول مالھم ولمعاویۃنسئال اللّٰہ العا فیۃ وقال لی یاابالحسن اذارأیت احدا یذکراصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بسوء فاتھمہ علی الاسلام (ذکرہ ابن تیمیہ فی الصارم المسلول)

کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان کی کوئی برائی ذکر کرے، اوران پر کسی عیب یا نقص کا الزام لگائے جو شخص ایسا کرے اس کی تادیب واجب ہے اور میمونی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی برائی کرتے ہیں ہم اللہ سے عافیت کے طلبگار ہیں اور پھر مجھ سے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر بُرائی کے ساتھ کررہا ہے اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو۔

۵ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب تقریب میں فرمایا:

الصحابۃ کلھم عدول من لابس الفتن وغیر ھم باجماع من یعتدبہ.

صحابہ سب کے سب عدل ہیں جو اختلاف کے فتنہ میں مبتلا ہوئے وہ بھی اور دوسرے بھی۔

۶ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی تقریب کی شرح تدریب الراوی میں پہلے اس

کے ثبوت میں وہ آیاتِ قرآنی اور روایات حدیث لکھی ہیں جن کا ایک حصہ اوپر لکھا جا چکا ہے پھر فرمایا:

"ان سب حضرات کا تعدیل وتنقید سے بالاتر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ حضرات حاملانِ شریعت ہیں اگر ان کی عدالت مشکوک ہو جائے تو شریعت محمدیہ علیہ السلام صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ قیامت تک آنے والی نسلوں اور دور دراز کے ملکوں اور خطوں میں عام نہیں ہو سکتی (اس کے بعد جن لوگوں نے اس مسئلہ میں کچھ اختلافی پہلو لکھا ہے ان پر رد کر کے آخر میں فرمایا)۔

والقول بالتعميم هو الذى صرح به الجمهور وهو المعتبر.
(تدریب الراوی ص ۴۰۰)

عدالت کا تمام صحابۂ کرام میں عام ہونا ہی جمہور کا قول ہے اور وہی معتبر ہے۔

❼ علامہ کمال ابن ہمام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے عقائد اسلامیہ پر اپنی جامع کتاب مسایرہ میں لکھا ہے:

واعتقاد اهل السنة والجماعة تزكيّة جميع الصّحابة وجوبًا باثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم كما اثنى الله سبحانه وتعالىٰ عليهم ثم سرد الايات والروايات التى مرت (مسایرہ ص ۱۳۲ طبع دیوبند)

عقیدۂ اہل سنت والجماعت کا تمام صحابۂ کرام کا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاکی بیان کرنا ہے اس طرح کہ ان سب کے عدول ہونے کو ثابت کیا جائے اور ان پر کسی قسم کا طعن کرنے سے پرہیز کیا جائے اور ان کی مدح وثنا کی جائے جیسا کہ اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے (پھر ابن ہمام نے وہ آیات وروایات نقل کی ہیں جو اوپر گذر چکی ہیں)

❽ حافظ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے شرح عقیدۂ واسطیہ میں فرمایا:

ومن اصول اهل السنة والجماعة سلامة قلوبهم والسنتهم لاصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كما وصفهم اللّٰه تعالىٰ فى قوله تعالىٰ والذين جاء و امن بعد هم الاية (شرح عقیدۂ واسطیہ ص ۴۰۳ طبع مصر)

اہلِ سنت کے اصولِ عقائد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اپنے دلوں اورزبانوں کوصحابہ کے معاملے میں صاف رکھتے ہیں، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ والذین جاؤامن بعدہم الخ۔

⑨ علامہ سفارینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب الدرۃ المضیۃ اور اس کی شرح جو سلف صالحین کے عقائد پر تصنیف فرمائی ہے اور لوامع الانوار البہیہ شرح الدرۃ المضیہ کے نام سے شائع ہوئی اس میں فرماتے ہیں۔

والذى اجمع عليه اهل السنة والجماعة انه يجب على كل احد تزكية جميع الصحابة باثبات العدالةلهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم فقد اثنى الله سبحانه عليهم فى عدة آيات من كتابه العزيز على انه لولم يردعن الله ولا عن رسوله فيهم شئى لا وجبت الحال التى كا نواعليها من الهجرة والجهادو نصرته الذين وهذل المهج والا موال وقتل الآ بآء والا ولا دو المنا صحةفى الدين وقوة الايمان واليقين القطع بتعديلهم والا عتقاد لنزاهتهم وانهم افضل جميع الامة بعد نبيهم هذامن مذهب كافة الا مة ومن عليه المعوّل من الائمة.

(عقیدۂ سفارینی ص ۳۳۸ ج ۲)

اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پاک صاف سمجھے، ان کے لئے عدالت ثابت کرے ان پر

اعتراضات کرنے سے بچے، اور ان کی مدح وتوصیف کرے، اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کی متعدد آیات میں ان کی مدح وثنا کی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے صحابہ کی فضیلت میں کوئی بات منقول نہ ہوتی تب بھی ان کی عدالت پر یقین اور پاکیزگی کا اعتقاد رکھنا، اور اس پر ایمان رکھنا ضروری ہوتا کہ وہ نبی ﷺ کے بعد ساری امت کے افضل ترین افراد ہیں اس لئے کہ ان کے تمام حالات اسی کے مقتضی تھے۔ انہوں نے ہجرت کی، جہاد کیا دین کی نصرت میں اپنی جان ومال کو قربان کیا۔ اپنے باپ بیٹوں کی قربانی پیش کی، اور دین کے معاملے میں باہمی خیر خواہی اور ایمان ویقین کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔

⑮ اسی کتاب میں امام ابوزرعہ عراقی جو امام مسلم کے بڑے اساتذہ میں سے ہیں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

اذا رأیت الرجل ینتقص احدًا من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فاعلم انه زندیق وذلك ان القرآن حق والرسول حق وماجاء به حق وما ادّٰی ذلك الینا کل الا الصحابة فمن جر حهم انما اراد ابطال الکتاب والسنة فیکون الجرح به الیق والحکم علیه بالزندقة والضلال اقوم واحق (ص ۳۸۹۔۲۲)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کی بھی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔ اس لئے کہ قرآن حق ہے، رسول ﷺ حق ہیں، جو تعلیمات آپ لے کر آئے وہ حق ہیں اور یہ سب چیزیں ہم تک پہنچانے والے صحابہ کے سوا کوئی نہیں، تو جو شخص ان کو مجروح کرتا ہے وہ کتاب وسنت کو باطل کرنا چاہتا ہے لہذا خود اس کو مجروح کرنا زیادہ مناسب ہے اور اس پر گمراہی اور زندقہ کا حکم لگانا زیادہ قرین حق وانصاف ہے۔

⑪ اسی کتاب میں حافظ حدیث ابن حزم اندلسی نے اس مسئلہ میں یہ قول نقل کیا ہے:۔

قال ابن حزم الصحابة کلهم من اهل الجنة قطعا قال تعالیٰ (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل اولئك اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد و قاتلوا و کلا وعدالله الحسنی) وقال تعالیٰ ان الذین سبقت لهم منا الحسنی اولئك عنها مبعدون. (ص ۳۸۹)

علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُم قطعی طور پر اہل جنت میں سے ہیں (دلیل یہ ہے کہ) باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا وہ (بعد کے لوگوں کے) برابر نہیں ہو سکتے، وہ لوگ درجہ کے اعتبار سے ان لوگوں کے مقابلہ میں عظیم تر ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے) بعد انفاق اور قتال کیا۔ اور اللہ نے اچھائی (جنت) کا وعدہ سبھی سے کیا ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ "بلا شبہ وہ لوگ جن کے لئے ہمارا اچھائی (جنت) کا وعدہ پہلے سے آچکا ہے وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔

⑫ عقائد کی مشہور درسی کتاب عقائد نسفیہ میں ہے۔

ویکف عن ذکر الصحابة الا بخیر.

یعنی اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُم کا ذکر بخیر خیر اور بھلائی کے نہ کرے۔

⑬ اسی طرح عقائد اسلامیہ کی معروف کتاب شرح مواقف میں سید شریف جرجانی نے مقصد سابع میں لکھا ہے:

المقصد السّابع انه یجب تعظیم الصحابة کلهم والکف عن القدح فیهم لان الله عظیم و اثنی علیهم

فی غیر موضع من کتابه (ثم ذکر الأیات المنزلة فی الباب ثم قال). والرسول صلی اللّٰه علیه وسلم قد احبهم واثنی علیهم فی الاحادیث الکثیرة.

تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعظیم اور ان پر اعتراض سے بچنا واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حکیم ہے اور اس نے ان حضرات پر اپنی ...... بہت سے مقامات میں مدح وثنا فرمائی ہے (اس طرح کی آیات نقل کر کے لکھتے ہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات سے محبت فرماتے تھے اور آپ نے بہت سی احادیث میں ان پر ثنا فرمائی ہے۔

ان ہی شارح مواقف نے ایک مقام پر بعض اہل سنت کی طرف نسبت کر کے یہ قول ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ کرنے والوں کی خطا تفسیق کی حد تک پہنچتی ہے لیکن شارح مواقف کے اس قول کی کوئی بنیاد ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، اہل سنت کے کسی ایک عالم کے کلام میں بھی ہمیں یہ بات نظر نہیں آئی کہ انہوں نے اس بناء پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فاسق قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مکتوبات میں شارح مواقف کے اس قول کی سخت تردید کی ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:۔

وآنچه شارح مواقف گفته که بسیارے از اصحاب مابر آں اند که منازعت ازروئے اجتهاد نبوده مراداز اصحاب کدام گروه راداشته باشد اهل سنت برخلاف آں حاکم اندچنانچه گذشت وکتب القوم،شحونة بالخطاء الا جتهادیّ کما صرّح به الامام الغزالی والقاضی ابوبکر

وغیرھما. پس تفسیق وتضلیل درحق محاربان حضرت امیر جائز نباشد قال القاضی فی الشفاقال مالك من شتم احدًا مِن اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ابابکر أو عمر أوعثمان اومعاویة او عمروبن العاص رضی اللّٰہ تعالیٰ عنهم فان قال کا نوا علیٰ ضلالٍ او کفرٍ قتل واِن شتم بغیر هذامن شاعة الناس نکل نکالاً شدیدًا،فلایکون محاربوا عَلیٍّ کفرة کما زعمت الغلا ۃ من الرفضة ولا فَسقةً کما زعم البعض ونسبه شارح المواقف اِلیٰ کثیر من اصحابه..

وانچه درعبارات بعضی ازفقهاء لفظ جوردر حق معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ واقع شده است وگفة کان معاویة اِمَامًا جائراً مراداز جورعدم حقیقت خلافت او درزمان خلافت حضرت امیر خواهد بودنه جورے که مالش فسق وضلالت است تابه اقوال اهل سنت موافِق باشد، مع ذلك اربابِ استقامت ازاتیان الفاظ موهمة خلاف مقصودا جتناب می نمایندوزیادهٔ بر خطاتجویزنمی کنند.

(مکتوبات امام ربانی دفتر اوّل) حصہ چہارم مکتوب ص۲۵۱ص ۶۷ تا۶۹ جلد دوم (مطبوعہ نور کمپنی لاہور)

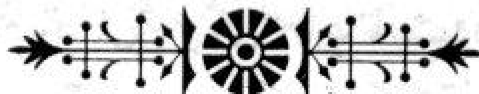
اور یہ جو شارح مواقف نے کہا ہے کہ ہمارے بہت سے اصحاب اس مسلک پر ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جنگ اجتہاد پر مبنی نہیں تھی اس میں نہ جانے اصحاب سے کونسا گروہ مُرادلیا ہے، اہل سنت کا عقیدہ تو اس کے خلاف ہے۔ جیسا کہ گزر چکا اور علمائے اہل سنت کی کتابیں خطاء اجتہادی کی تصریح سے بھری ہوئی ہیں جیسے کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ اور قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے بہ صراحت لکھا ہے لہذا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جن حضرات نے جنگ کی

انہیں فاسق یا گمراہ کہنا جائز نہیں ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے شفاء میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کو بھی، خواہ وہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں یا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ برا کہے تو اگر یہ کہے کہ وہ گمراہی یا کفر پر تھے، تو اسے قتل کیا جائے گا اور اگر اس کے علاوہ عام گالیوں میں سے کوئی گالی دے تو اسے سخت سزا دی جائے گی لہذا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دو سے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ کرنے والے نہ تو کافر ہیں جیسے کہ بعض غالی روافض کا خیال ہے اور نہ فاسق ہیں جیسے کہ بعض کا گمان ہے اور شارح مواقف نے اس کی نسبت اپنے بہت سے اصحاب کی طرف کی ہے اور یہ جو بعض فقہاء کی عبارتوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ''جور'' کا لفظ آ گیا ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام جائر تھے تو اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں ان کی خلافت برحق نہ تھی، اس سے وہ ظلم وجور مراد نہیں ہے جس کا نتیجہ فسق وگمراہی ہے یہ تشریح اس لئے ضروری ہے تاکہ اہل سنت کے اقوال کے ساتھ موافقت ہو جائے۔ اس کے ساتھ دین پر استقامت رکھنے والے ان حضرات کے حق میں ایسے الفاظ سے بھی پرہیز کرتے ہیں جن سے خلاف مقصود کا وہم پیدا ہوتا ہو۔ اور ان حضرات کے لئے خطاء کے لفظ سے زیادہ کوئی لفظ کہنا جائز نہیں سمجھتے۔

وما علینا الا البلاغ

ماہنامہ صدائے اسلام پشاور

اکتوبر ۱۹۸۵ء



حضرت امام مالک قدس سرّہ
کے
زرّیں ملفوظات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس قدس سرّہ امّت کے وہ امام ہیں کہ دنیا کے کسی عالم و جاہل کی گردن ان کے احسان سے آزاد نہیں، ان کا نام نامی محتاجِ تعارف نہیں۔ مسلمان کے لیے بڑی ناشکری اور ناقدر شناسی ہے کہ ان کے حالات سے ناواقف رہے۔ اس مختصر مضمون میں مقصود صرف آپ کے وہ ملفوظاتِ طیبہ جمع کرنا ہے جو عام مسلمانوں کی حیاتِ دنیا و آخرت کے لیے مشعلِ راہ اور علماء کے لیے عالم متجر، صوفیاء کے لیے مرشد کامل، زعماء امّت کے لیے فوز و فلاح کا دستورِ اساسی ہیں۔

شیخ السنہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالے (تزیین الممالک بمناقب الامام مالک) میں نقل کیا ہے کہ میں نے امام ابن وہب کی ایک مستقل ضخیم کتاب مجالسات امام مالک کے متعلق دیکھی ہے جس میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظاتِ طیبہ جمع کیے گئے ہیں۔ (انتہیٰ ص ۴۰)

لیکن افسوس کہ یہ عظیم الشان ذخیرۂ علوم و آداب نذر حوادث ہوکر رہ گیا۔ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی بوجہ اختصار اپنے رسالہ میں اس کتاب کا کوئی حصہ نقل نہیں فرمایا۔ اب جو کچھ اس تحریر میں لکھا جاتا ہے وہ خلاصہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ کے متفرق اوراق اور دوسری کتب کے مختلف مقامات کا التقاط ہے۔

ابتدائی حصہ اس رسالہ مذکورہ سے ماخوذ ہے۔ بعد میں جس کتاب سے لیا ہے اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

ارشاد:۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ از روئے تقویٰ واحتیاط خود اپنے نفس پر بہت سے معاملات میں تنگی کرتے تھے۔ مگر عام مسلمانوں پر اس کو لازم نہ قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ عالم اس وقت تک عالم نہیں ہوتا جب تک کہ خود ایسے احتیاطی اعمال اختیار نہ کرے جن کا فتویٰ لوگوں کے لیے نہیں دیتا۔ اور اگر وہ اُن اعمال کا پابند نہ ہوتا تب بھی اس پر کوئی گناہ نہ تھا۔ (ص ۱۲)

ارشاد:۔ اہل اہواء (وہ لوگ جو عقائد اسلامیہ میں شبہات واوہام نکالنے اور جمہور امّت کا خلاف کرتے ہیں) ان میں سے اگر کوئی شخص آپ کی خدمت میں آتا اور کسی مسئلہ میں معاندانہ بحث کرنا چاہتا تو آپ فرمادیتے تھے کہ سن لو میں تو اپنے دین وعقائد پر قوی حجتوں اور قطعی دلائل کے ساتھ پختہ ہوں مجھے تو بحث کی حاجت نہیں۔ اور تمہیں اپنے دین میں شکوک ہیں تو جاؤ ایسے ہی آدمی سے بات کرو جسے تمہاری طرح دین میں شبہات ہوں۔ (ص ۱۴)

ارشاد:۔ ایک قریشی جوان سے فرمایا کہ علم حاصل کرنے سے پہلے (انسانی اور اسلامی) آداب حاصل کرو۔

ارشاد:۔ فرمایا کوئی شخص اس علم دین میں اپنے مقصد پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب کہ اس کو فقر وفاقہ پیش نہ آوے اور وہ پھر بھی علم کو دنیا پر ترجیح دے۔

ایک خاص معمول:۔ حضرت امام قدس سرّہ کا معمول تھا کہ ہر مہینہ کی پہلی رات کو تمام رات جاگنے اور ذکر ونماز میں مشغول رہتے تھے۔ تاکہ مہینہ کی ابتداء عمل صالح سے ہو۔

ادب:۔ حضرت ممدوح کو اگر کسی شخص کے سوال سے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی غرض فی الواقع مسئلہ کا حل نہیں بلکہ اور کچھ ہے (مثلاً اپنا علم جتلانا وغیرہ) تو آپ اس کے

سوال کا جواب دینے کے بجائے اس کو ڈانٹ دیتے اور یہ آیت پڑھتے تھے وَلَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَایَلْبِسُوْنَ۔

ارشاد:۔ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ کمینہ کون آدمی ہے؟ فرمایا جو طالب علم نہ ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس کو علم سے محروم کردیتا ہے۔ (ص ۱۵)

ارشاد:۔ فرمایا کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک کہ مستند مشائخ وعلماء نے میرے لیئے اس کی شہادت نہیں دی کہ میں اس کا اہل ہوں۔ (ص ۸)

وَصیَّت:۔ حضرت خالد بن خداش فرماتے ہیں کہ میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت سے رخصت ہوا تو عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ دو چیزوں کا التزام کرلو۔ ایک تقویٰ دوسرے علم حدیث کا حاصل کرنا اس کے اہل سے۔

ف:۔ حضرت امام نے علم حدیث حاصل کرنے کے ساتھ یہ قید لگا کر ایک مستقل علم کا دروازہ کھول دیا کہ علم حدیث کو صرف اس کے اہل سے حاصل کیا جاوے کیونکہ نااہل سے حاصل کرنے میں بسا اوقات بجائے فائدہ کے مضرت پہنچ جاتی ہے۔

ارشاد:۔ امام موصوف فرماتے تھے کہ میرا تجربہ ہے کہ جو شخص سچ بولنے کا عادی ہوجائے اور کبھی جھوٹ نہ بولے اس پر آخر عمر تک بڑھاپے کے وہ آثار نہیں آتے جن سے اس کے قویٰ جسمانی یا دماغی بیکار ہوجائیں۔

خصُوصیّت:۔ افاضہ علوم حدیث کے بارہ میں ایک خاص فضیلت حضرت امام کو ایسی حاصل ہے جو امت میں کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی کہ آپ کے تلامذہ ہر طبقہ میں چوٹی کے ممتاز لوگ ہوئے ہیں۔ مثلاً ائمہ مجتہدین میں سے امام اعظم ؎

؎ اس میں محدثین کا اختلاف ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے حدیث کی روایت لی ہے یا نہیں مگر دارقطنی کتاب الذبائح میں اور ابن خسرو بلخی نے مسند امام ابی حنیفہ میں اور خطیب بغدادی نے کتاب الرواۃ عن مالک میں امام اعظم کی روایت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کی ہے (تزیین الممالک للسیوطی ص ۵۹ واللہ اعلم ۱۲) بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ۔

ابو حنیفہ، امام اوزاعی سفیان ثوری رحمہم اللہ اور طبقۂ سلاطین وخلفاء میں سے امیر المؤمنین منصور اور مہدی اور ہادی، ہارون رشید اور ان کے دونوں صاحبزادے امین اور مامون وغیرہ اور امام کے ہمعصروں میں سے ایک بڑی جماعت اور سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ امام موصوف کے بہت سے اساتذہ بھی امام کی حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے مثلاً زہری، یزید بن عبداللہ بن الہاد، ربیعہ، یحییٰ بن سعید۔ (ص ۳۹)

آخریں لمحۂ حیات

بکر بن سلیم کہتے ہیں کہ جس شام کو امام موصوف دنیا سے رخصت ہونے والے تھے ہم آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا میں نہیں جانتا کہ تم سے کیا بیان کروں مگر صرف اتنا کہتا ہوں کہ کل تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ایسے عفو وکرم کا معائنہ کروگے جو کبھی تمہارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

ہارون رشید کا مشورہ اور امام کا مدبرانہ جواب

حضرت امام فرماتے ہیں کہ خلیفہ ہارون رشید نے مجھ سے تین کاموں کے متعلق مشورہ لیا۔ اول یہ کہ امام کی تصنیف مؤطا کو بیت اللہ کے اندر معلق کردیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس کے موافق فتویٰ دینے اور عمل کرنے پر قانوناً مجبور کردیں۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے موجودہ منبر کو توڑ کر سونے چاندی اور جواہرات سے بنادیں۔

تیسرے یہ کہ نافع بن ابی نعیم کی جو کہ قرأت کے مشہور ومعروف امام ہیں۔ مسجد نبوی کا امام مقرر فرمادیں۔

امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تینوں معاملات میں ہارون رشید کی رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ پہلی چیز تمام مسلمانوں کے لیے موطا کو قانون بنا کر مجبور کرنا تو اس لیے مناسب نہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعالیٰ عَنْہُم کا فروعی مسائل میں اختلاف ہوا ہے۔ اور وہ اطرافِ عالم میں پہنچے اور ان میں سے جو بزرگ جس خطہ میں پہنچے وہاں کے مسلمانوں نے اختلافیات میں انہیں کا اتباع کیا اور ان میں سے ہر شخص اپنی رائے اور اجتہاد میں صحیح راستے پر تھا۔

امام کے بعض الفاظ اس بارہ میں یہ ہیں:۔ اختلاف العلماء رحمة من اللّٰہ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ علیٰ هذه الامة كل يتبع ماصح عنده و كل يريد اللّٰه.

تَرجَمَہ: علماء کا اختلاف اس امت کے لیے اللہ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ کی رحمت ہے۔ ہر شخص اُسی چیز کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک صحیح اور حق ہے اور ان میں سے ہر شخص کی غرض فقط حق تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ ہی کی رضاء ہے اور بس۔ (اس لیے ان کے متبعین کو ان کے خلاف پر مجبور کرنا اسلام میں ایک قسم کی تنگی پیدا کرنا ہے)۔

فقہاء اور ائمہ کے باہمی اختلاف کے بارہ میں عظیم الشان فائدہ

آج حقیقت ناشناس روشن خیالی کے مدعی صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعالیٰ عَنْہُم اور ائمۂ مجتہدین کے فروعی سیائل کو تفرقہ سمجھ کر بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور ائمہ مجتہدین اور ان مقلدین کے باہمی فروعی اختلاف پر سخت نکتہ چینی کے درپے ہیں۔ لیکن امام دارالہجرت مالک بن انس رَضِیَ اللہُ تَعالیٰ عَنْہُ جو اس امت کے حقیقی طبیب اور رموز شریعت سے پورے واقف اور صحیح معنیٰ میں امام تھے ان کی تجویز دیکھیں تو حقیقت کھل جائے کہ موطا میں حضرت امام نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات اور ان مسائل کا خلاصہ لکھا ہے جن کو وہ مختلف فیہ مسائل میں حق سمجھتے ہیں۔ اور ان کے خلاف کو خطاء

جس کا مقتضاء یہ تھا کہ وہ خود کوشش کرتے کہ دنیائے اسلام سے تمام دوسرے مسائل جوان کی رائے میں خطا ہیں، مٹادیئے جائیں۔ اور کل عالم اسلام میں یہی مسائل و احکام رائج ہوں جو آپ نے غایت تحقیق واحتیاط سے جمع کیے ہیں۔

مگر حضرت امام خود تو اس کے لیے کیا کوشش کرتے۔ سلطانِ وقت خود اس کی درخواست کرتا ہے اس وقت بھی اس پر راضی نہیں ہوتے اور اس فروعی اختلاف کے باقی رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ہاں حضرت امام کے اس ارشاد سے جس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فقہاء کا باہمی فروعی اختلاف ایک رحمت اور مقتضائے حکمت ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ روشن طریق پر ایک اور نہایت اہم اور ضروری چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ مختلف فیہ مسائل محل اجتہاد ہیں اُن میں اختلاف کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اور اجتہادی اختلاف کی کیا حد ہے کیونکہ اسی واقعہ نے یہ واضح کردیا کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر اپنی رائے پر ایسا جمود و یقین نہ ہونا چاہیئے کہ خلاف کرنے والوں کو باطل پر سمجھے اور ان کے خلاف جنگ وجدل اور فرقہ بندی کی بنیاد ڈال دے بلکہ ایسے مواقع میں ضروری ہے کہ نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ دوسروں کی رائے کو بھی وقعت کی نظر سے دیکھے۔

سلفِ صالحین کے باہمی اختلافات اور قرونِ متاخرہ کے نزاعات میں یہی فرق ہے کہ سلف صالحین ایسے مسائل میں خود اپنی تحقیق پر عمل کرتے تھے اور جوان سے مسئلہ پوچھتا وہی بتلاتے تھے لیکن جو لوگ ان کے خلاف کسی دوسرے امام یا عالم کی تحقیق کا اتباع کرتے تھے ان پر کوئی نکیر واعتراض نہ کرتے تھے۔

امام حدیث حافظ ابن عبدالبر اپنی کتاب جامع العلم میں لکھتے ہیں:۔

مابرح المفتون يفتون فيحل هذا ويحرم هذا فلايرىٰ المحرم ان المحل هلك تحليله ولايرى المحل ان المحرم هلك لتحريمهٖ (ص ١٤٤)

ہمیشہ سے اہل فتویٰ میں اختلاف رہا ہے ایک ہی معاملہ کو کوئی حلال کہتا ہے، کوئی حرام حرام کہنے والا حلال کہنے والے کو اور حلال کہنے والا حرام کہنے والے کو یہ نہ سمجھتا تھا کہ وہ ہلاکت وضلال میں ہے۔

مگر آج انہیں اساطینِ اُمّت اور سلاطین شریعت کے متبعین نے ان مسائل فرعیہ کو ایک جنگ وجدل کا میدان بنالیا۔ اور یہیں سے فرقہ بندی شروع ہوگئی جو امّت کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

الغرض امام کے اس مشورہ سے دو فائدے عظیم الشان حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ فروعی اختلافات مُقتضائے رحمت وحکمت اور یسر وسہولت ہیں ان کو مٹا کر سب عالم اسلام کو کسی ایک امام کی رائے پر جمع کر دینا شرعی مصلحت نہیں۔ دوسرے یہ کہ ایسے اختلافی مسائل میں اختلاف اسی حد پر رہنا چاہیئے جس پر قرون اولیٰ میں تھا۔ اس سے آگے بڑھانا شریعت کے مقصد کو فوت کرنا ہے۔

دوسرے امر کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ مشورہ دیا کہ یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ جس ممبر پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے ہیں آپ کے جسم مبارک کے ساتھ اس کا اتصال ہوا ہے اس کو ضائع کر کے جوہرات کا منبر بنایا جاوے۔ (کیونکہ وہ انوار وبرکات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتصال کی وجہ سے اس منبر میں ہیں ان کے مقابلہ میں دنیا بھر کے جواہرات ایک کوڑی کی قیمت نہیں رکھتے)۔

تیسرے مُعاملہ میں آپ نے فرمایا کہ حضرت نافع کو مسجد نبوی کا امام بنانا بھی مصلحت نہیں کیونکہ وہ قرأت کے مسلّم امام ہیں۔ اگر اتفاقاً کبھی کوئی کلمہ غلط ان کی زبان سے نکلے گا تو سننے والے اسی کو صحیح سمجھیں گے اور وہ دنیا میں ایک مستقل قرأت کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ امیر المؤمنین ہارون رشید نے تینوں مشوروں کو قبول کیا اور یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

ارشاد:۔ قعنبی جو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشہور تلمیذ اور موطا کے صاحبِ نسخہ ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت امام فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک لوگوں کی نصرت وامداد کرنے سے علم کی نصرت وامداد زیادہ محبوب اور بہتر ہے۔

(تزیین الممالک للسیوطی ص ۶۱)

تنبیہ:۔ یہاں تک کُل ملفوظات علامہ سیوطی کے رسالہ مذکورہ سے ماخوذ ہیں۔ اس کے بعد مناقب الامام مالک مصنفہ علامہ عیسٰی بن مسعود زاداوی سے لیے جاتے ہیں۔ واللہ الموفق

عزّتِ علم اور خُودداری

امیر المؤمنین ہارون الرشید رحمہ اللہ تعالیٰ جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کو بلایا۔ امام موصوف تشریف نہ لائے۔ پھر دوبارہ آدمی بھیجا تو تشریف لائے۔ ہارون الرشید نے کہا کہ اے ابو عامر کے بیٹے کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں بلانے کے لئے آدمی بھیجوں اور آپ نہ آئیں؟ حضرت امام نے سند کے ساتھ حدیث پڑھی جس میں قرآن مجید کے ایک لفظ غیر اُولی الضرر کے مستقل نزول کا ذکر تھا پھر فرمایا کہ امیر المؤمنین حق تعالیٰ نے اس علم کی یہ عزت کی ہے کہ اس کے ایک حرف کے لیے جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام اور دوسرے فرشتوں کو پانچ ہزار سال کی مسافت سے بھیجا ہے اور خدا تعالیٰ نے آپ کو اس مرتبہ پر علم ہی کی وجہ سے پہنچایا ہے تو آپکو چاہیئے کہ علم عزت میں کمی نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری عزت کم کردیں۔

ہارون الرشید رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام کے کلماتِ نصیحت سے متاثر ہو کر عرض کیا کہ اچھا کسی وقت یہاں تشریف لایا کریں تاکہ ہم آپ سے علم حاصل کریں۔ فرمایا کہ حق تعالیٰ آپ کی اصلاح فرمائے۔ بات یہ ہے کہ علم ایسی چیز ہے کہ لوگ اس کی تحصیل کے لیے اُس کے پاس آتے ہیں علم خود کسی کے پاس نہیں جایا کرتا۔

پھر ہارون الرشید نے درخواست کی کہ اچھا ہم خود حاضر ہوا کریں گے۔ مگر آپ یہ انتظام کر دیں کہ جس وقت ہم حاضر ہوں تو عوام الناس اُس وقت آپ کی خدمت میں نہ آیا کریں۔ امام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے فرمایا کہ علم کی یہ خاصیت ہے کہ اگر عام لوگوں کو اس سے روک دیا جائے تو خواص کو بھی اس سے نفع نہیں پہنچتا۔

ہارون الرشید کو بادشاہی جاہ وحشم کے ساتھ حق تعالیٰ نے طلبِ علم کا ایک جذبہ صادقہ عطا فرمادیا تھا کہ اگر چہ ان کی کوئی شرط امام نے تسلیم نہ کی مگر وہ سب سے دست بردار ہو کر خود امام کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور عام طُلباء کی صف میں بیٹھ کر آپ سے مؤطا پڑھا۔ (مناقب الامام مالک للزاداوی ص ۲۸)

آلِ نبی کون لوگ ہیں؟

داؤد بن حسن فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن صالح مدینہ طیبہ کے امیر تھے تو ایک روز میں ان کے پاس تھا اور بنی طالب بنی عباس کی ایک جماعت مجلس میں موجود تھی۔ ہم سب کو خطاب کر کے پوچھا کہ آلِ محمد ﷺ آپ کے نزدیک کون لوگ ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ آپ ہی حضرات ہیں۔ عبدالملک نے کہا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ آپ لوگ اس بارہ میں اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کو میرے پاس بلاؤ میں ان سے دریافت کروں گا۔

جب حضرت امام مجلس میں پہنچے تو عبدالملک نے ان کو اپنے برابر بٹھلایا اور نہایت ادب سے سوال کیا کہ آلِ محمد ﷺ کون ہیں؟ حضرت امام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے فرمایا کہ تمام امّت محمدیہ۔ اور پھر بطور استشہاد یہ آیت پڑھی اُدخُلوا اٰل فِرعون اشدّ العَذاب۔ غرض یہ تھی کہ اس آیت میں آل فرعون سے فقط فرعون کی ذریت و اولاد مراد نہیں بلکہ اس کے تمام متبعین مراد ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ صرف اولاد کے لیے مخصوص نہیں۔ امیر یہ سُن کر امام کے قدموں پر گر پڑا۔ (ص ۳۰)

فتوی میں احتیاط اور انتہائی غور و فکر

عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز عمری بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بسا اوقات میرے سامنے مسئلہ پیش کیا جاتا ہے تو میری بھوک اور نیند اڑ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا کلام لوگوں میں پتھر کی لکیر ہے۔ اور سب بلا پس و پیش آپ کا اتباع کرتے ہیں۔ پھر آپ کو اتنی فکر کیوں ہے۔ فرمایا کہ جو شخص ایسا ہو اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ انتہائی غور و فکر سے کام لے۔

آنکہ شاہ آں کندکہ اوگوید حیف باشدکہ جزنکو گوید۔

ائمہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کی محبت و عظمت

حضرت امام سے کسی نے دریافت کیا کہ ایوب سختیانی کس درجہ کے بزرگ ہیں؟ حدیث میں قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟ فرمایا کہ جتنے آدمیوں سے میں حدیث کی روایت کرتا ہوں ایوب ان سب سے افضل ہیں۔ اور اس کے باوجود میں نے ان سے روایتِ حدیث حاصل کرنے میں جلدی نہیں کی وہ دو مرتبہ حج کے لیے تشریف لائے مگر میں نے ان کی حدیث نہیں سُنی۔ یہاں تک کہ میں نے ان کا یہ حال دیکھا کہ جب ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کا ذکر آتا تو وہ اتنا رُوتے تھے کہ مجھے رحم آنے لگتا تھا۔ جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ نبی کریم ﷺ کی محبت و عظمت کا اس قدر گہرا رنگ ان پر چڑھا ہوا ہے اس وقت ان سے حدیث حاصل کی۔

اور مصعب بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی یہی حالت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ کا نام مبارک آپ کے سامنے آتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا اور چہرہ زرد پڑ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اہل مجلس پر اس کا اثر ہوتا تھا۔ سچ ہے عشق اور اس کی عظمت و جلالت کا یہی رنگ ہوتا ہے۔

ولقداجا دالمتنبی حیث قال ؎

واذکر ایام الحمی ثم انثنی علی کبدی من خشیة ان تصدعا

ترجمہ: میں جب ایام حمی (وصال حبیب کے زمانہ) کو یاد کرتا ہوں تو اپنے جگر کو تھام لیتا ہوں کہ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاوے

اُردو کا یہ شعر بھی اسی کا ترجمہ ہے ؎

ہمارے آگے کسی نے جوان کا نام لیا دِل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

بالآخر حاضرین مجلس میں سے کسی نے امام سے عرض کیا کہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ اگر آپ وہ چیز دیکھتے جو میں نے دیکھی ہے تو میری اس حالت پر تعجب نہ کرتے۔ کیونکہ میں نے سید العلماء محمد بن المنکدر کو دیکھا ہے کہ جب کبھی کوئی حدیث ان سے دریافت کی جاتی تو ان پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں رحم آنے لگتا تھا۔

اور میں نے جعفر بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے کہ ان کی عادت بہت زیادہ مزاح اور ہنسی کی تھی۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کا نام مبارک ان کے سامنے لیا جاتا تھا تو زرد پڑ جاتے تھے اور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث بھی بدون طہارت وضو کے بیان نہ کرتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں مدت تک حاضر ہوتا رہا۔ کبھی ان کو تین حالتوں کے سوا نہیں دیکھا۔ یا نماز پڑھتے ہوئے یا قرآن پڑھتے ہوئے یا خاموش بیٹھے ہوئے۔ اور کبھی بے فائدہ کلام کرتے ہوئے نہیں پائے گئے۔ یہ بزرگ ان حضرات علماء میں سے تھے جن پر حق تعالیٰ کی خشیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

چند نصائح

عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ باطل کے قریب جانا بھی ہلاکت ہے اور باطل کے معاملہ میں

گفتگو کرنا حق سے روک دینا ہے۔ اور انسان اپنے دین یا عزت و آبرو کو فاسد کر کے دنیا (کتنی ہی حاصل کر لے) اس میں کوئی خیر نہیں۔ اور جس چیز کو اللہ تبارکَ وتعالیٰ نے لوگوں کے لیے حلال کر دی ہے اس میں کسی کو ملامت نہ کرو (اگر تم اس کو طبعاً پسند نہ کرتے ہو)۔

شرک و بدعت کا انجامِ بد اور دوسرے معاصی کا اُن کے مقابلہ میں خفیف ہونا

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص شرک اور عقیدہ کی بدعات اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُرا کہنے سے محفوظ رہا۔ اگرچہ دوسرے گناہوں میں کچھ مبتلا بھی ہو گیا ہو۔ مجھے اللہ تبارکَ وتعالیٰ کے فضل ورحمت سے امید ہے کہ اللہ تبارکَ وتعالیٰ اس کے وہ گناہ معاف فرمادے گا اور وہ جنت الفردوس میں نبیین وصدیقین وشہداء کے ساتھ ہوگا۔

علمِ دین حاصل کرنے میں احتیاط

ارشاد فرمایا کہ یہ علم دین ہے۔ تو خوب غور کرو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو (یعنی جب تک کسی کے علم صحیح اور تقویٰ کا اطمینان نہ ہو اس کی تعلیم پر اعتماد مت کرو) اور مسجد نبوی کے ستونوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ستر علماء ان کے پاس درس حدیث میں مشغول پائے مگر میں نے اُن سے کسی سے علم حاصل نہ کیا (کیونکہ ان کے علم صحیح اور تفقہ پر مجھے اعتماد نہ تھا) اگرچہ دیانت میں ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ اگر ایک بیت المال ان کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً وہ اعلیٰ درجہ کے امین ثابت ہوتے۔

اور فرمایا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل نہ کرنا چاہیئے ان کے ماسوا جس سے

چاہیں حاصل کریں اور وہ چار یہ ہیں۔

ایک مبتدع جو اپنی بدعت کی تبلیغ اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہو۔

دوسرے بے وقوف، کم فہم، جس کی کم فہمی مشہور ہو۔

تیسرے وہ شخص جو باہمی معاملات میں جھوٹ بولتا ہے۔اگر چہ حدیث رسول ﷺ میں جھوٹ نہ بولتا ہو۔

چوتھے وہ شخص فن حدیث سے باضابطہ وبا اصول واقف نہ ہو (اگر چہ کچھ حدیثیں اس نے یاد کر لی ہوں)

قِلّتِ کلام

فرمایا کہ جو شخص کلام کو اپنے عمل میں داخل نہیں سمجھتا وہ بہت کلام کرتا ہے اور سلف میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص اپنے کلام کو اپنے عمل کا جزو سمجھتا ہے وہ زیادہ کلام ہرگز نہیں کر سکتا۔اور سلف کی یہ عادت نہ تھی کہ کلام کا ایک سلسلہ فضول لگائے رکھیں۔

اور اب بعض وہ لوگ ہیں جو ایک مہینہ کا کلام ایک گھڑی میں کر ڈالتے ہیں۔

فرمایا کہ جو شخص اپنے نفس کے لیے بھلائی پر قادر نہیں دوسروں کو اس سے کسی بھلائی کی توقع رکھنا فضول ہے۔

اور فرمایا کہ نماز ایسی پڑھو کہ گویا اپنی عمر کی آخری نماز پڑھ رہے ہو۔اس کے بعد تمہیں نماز پڑھنا نصیب نہ ہوگا۔

اور لوگوں کے اموال سے اپنے قلب کو مایوس کر لو کہ حقیقی غنی یہی ہے۔اور لوگوں سے حاجات طلب کرنے سے بچو کہ حقیقی فقر یہی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ کچھ کلام کی ضرورت پڑے گی (اس لیے مطلقاً کلام سے تو منع نہیں کرتا مگر) اس کلام سے بچو جس کے بعد تمہیں معذرت کرنا پڑے۔

اور فرمایا کہ اون کا موٹا لباس پہننے میں کوئی خیر نہیں۔ ہاں سفر میں بضرورت پہنے تو مضائقہ نہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے کیا، کیوں کہ ایسا لباس اختیار کرنا اپنے آپ کو ممتاز و مشہور کرنا ہے اور بہت ہی بُری بات ہے کہ انسان کا دین اس کے کپڑوں سے پہچانا جاوے۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص تمہاری بات نہ مانے اس کے سامنے علم کی بات کہنا علم کی اہانت کرنا ہے۔

لباس

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت تھی کہ لباس عمدہ رکھتے تھے۔ عدن وخراسان ومصر کے اعلیٰ کپڑے آپ کے ملبوس میں ہوتے تھے۔ اور عطر وخوشبو کا استعمال بکثرت فرماتے تھے۔ اور ارشاد فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تبارک وتعالیٰ نعمت دے۔ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اس کے بدن پر اس نعمت کے آثار ظاہر ہوں۔ اور خصوصاً اہلِ علم کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ اپنی ہیئت ولباس کو اچھا بنائیں کہ اس میں علم کی عظمت ہے۔

مزاح

فرمایا کہ اہل علم کو مزاح (ہنسی ٹھٹھے) سے یکسو رہنا چاہیئے۔ خصوصاً مجلس علم میں اور فرمایا کہ عالم کو چاہیئے کہ اپنی ضروریات کو بازار سے خود نہ خریدے اگرچہ دوسروں کی معرفت خریدنے میں کچھ مالی نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ کیوں کہ عوام اس کی قدر کو نہیں جانتے۔

ف۔ فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں کہ حضرات سلف کا یہی مذاق تھا۔ اور اس زمانہ میں پسندیدہ یہی تھا۔ لیکن آج کل مناسب یہ ہے کہ علماء خود بازاروں میں جاویں تا کہ

لوگ ان کے معاملات سے سبق حاصل کریں۔ اور وہ لوگوں کے معاملات پر مطلع ہوں کہ فتویٰ مناسب حال دے سکیں۔

احقر کہتا ہے کہ دونوں بزرگوں کی رائیں درحقیقت متضاد نہیں بلکہ حالات کے تابع مشورے ہیں۔ عالم کو چاہیئے کہ موجودہ حالات اور وقتی ضرورتوں پر نظر کرے۔ ان بزرگوں کے ارشادات کو کیدِ نفس یا ابتذالِ نفس کا ذریعہ نہ بناوے

اہلِ بدعت کی تردید میں حکمت آموز نصیحت

ابن فروخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں خط لکھا کہ ہمارے بلاد میں بدعات کی کثرت ہے۔ میں نے رد بدعت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ نے اکابر علماء وقت کے امر یا مشورہ کے بغیر خود ہی اپنے آپ کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے۔ کہ اہل بدعت کی تردید میں کتابیں لکھیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ خود کسی مغالطہ میں پڑ کر ہلاک نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اہل بدعت کی تردید صرف اس شخص کو کرنا چاہیئے جو کتاب وسنت کے غوامض اور اہل بدعت کے شبہات ووساوس سے پورا واقف ہو تاکہ وہ لوگ اس پر غالب نہ آسکیں ورنہ جو شخص اس درجہ کا نہ ہو اس سے بسا اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں کہ اہل بدعت ان پر گرفت کر کے اور زیادہ عروج پا لیتے ہیں۔ (کتاب الاعتصام للشاطبی ص ۲۵ ج ۱)

فائدہ: حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ نصیحت آب زر سے لکھنے اور ہمیشہ تقلید کرنے کے قابل ہے کہ ایک تجربہ کار حکیم کا ارشاد ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ علماء حق اپنے اہل عصر علماء کے مشورہ یا امر کی رو سے اس کے اہل ہیں وہ بھی اس کام میں ہمت سے کام نہ لیں۔ کیونکہ جس طرح یہ ایک خطرہ کا مقام ہے اسی طرح اس کا اجر وثواب بھی زیادہ ہے۔

حضرت اسد بن موسیٰ قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

ان لِلّٰہ عند کل بدعة بها الاسلام وليا لِلّٰه يذب عنهما وينطسق بعلامتها (اعتصام ص ۲۶ ج ۱)

جب کسی بدعت وضلالت کے ذریعہ اسلام کے اصولِ صحیحہ سے کید ومکر کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی ولی اس کی مدافعت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے جو اس کی قلعی کھول دیتا ہے۔

اور امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ:

لن يزال اللّٰه نصحاء فی الارض من عباده يعرضون اعمال العباد علیٰ کتاب اللّٰه فاذا وافقوه حمدوا اللّٰه واذا خالفوه عرفوا بکتاب اللّٰه ضلالة من ضل وهدی من اهتدی فاولئك خلفاء اللّٰه.

(اعتصام ص ۲۷ ج ۱)

ہمیشہ بعض اللہ کے بندے ایسے رہیں گے اللہ کے (دین) کی خیر خواہی کرنے والے ہیں۔ بندوں کے اعمال کو کتاب اللہ کے سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں اگر موافق ہیں تو شکر کرتے ہیں اور مخالف ہیں تو کتاب اللہ کے ذریعے گمراہ کی گمراہی اور ہدایت پانے والے کی ہدایت واضح کر دیتی ہے۔

کسی بدعت کا ایجاد کرنا معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خائن قرار دینا ہے

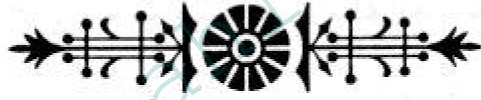
ابن ماجشون رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امامِ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ فرماتے ہوئے سنا:

من احدث فی هذه الامة شيئًا لم يكن عليه سلفها فقد زعم ان رسول

اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللّٰہ تعالیٰ یقول الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً. فمالم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا

(کتاب الاعتصام للشاطبی ص ۱۴۹ ج ۲)

جو شخص اس امت میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جس پر اُن کے سلف صالح نہیں تھے تو گویا وہ یوں کہتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے رسالت میں خیانت کی (کہ بعض مفید اور ضروری باتیں بیان نہیں کی جن کو یہ مبتدعین ظاہر کر رہے ہیں) کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے آج تمہارے لیے دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔ پس جو کام اُس روز (زمانۂ سلف میں) دین نہ تھا وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِسلامی نِظام کے تحت معاشی اصلاحات

حمد وستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا!
اور
درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

آج کل یہ سوال عام ہے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام جس کو پوری انسانیت کے لئے امن واطمینان کا ضامن بتلایا جاتا ہے، وہ نظام کیا ہے؟ اور اس کے ذریعہ ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اصل بات تو یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کوئی خالص نظری فلسفہ نہیں ہے جسے کبھی دنیا نے عملی زندگی میں دیکھا اور برتا نہ ہو۔ بلکہ یہ نظام سینکڑوں سال تک دنیا میں عملی طور پر نافذ رہا۔ اور اس کی یہ برکتیں ہر دور اور ہر ملک میں ہر شخص نے مشاہدہ کی ہیں کہ جب کسی جگہ یہ نظام رائج ہوا وہاں ان معاشی ناانصافیوں کا نام ونشان نہ رہا جن سے آج کی دنیا بے چین ہے۔ وہاں غریب وامیر کی جنگ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، وہاں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں تھی،

سب ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے تھے۔ وہاں مزدور اور کسان حقیر و ذلیل نہیں تھا، اس کی ایسی ہی عزّت کی جاتی تھی جیسی برادری کے دوسرے افراد کی، وہاں صنعت اور تجارت پر اجارہ داریاں نہیں تھیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت صرف بڑے سرمایہ داروں کے لئے مخصوص ہوکر رہ جائے، وہاں ان تمام دروازوں کو بند کردیا گیا تھا جن کی وجہ سے بڑے لوگ اشیاءِ صرف کی قیمتوں پر حاکم بن کر بیٹھ جائیں، گرانی غریبوں کی کمر توڑتی رہے، اور غریب عوام مصنوعی قحط کا شکار ہوکر رہ جائیں۔

پھر یہ نظام ایسا بھی نہیں ہے کہ سینہ بہ سینہ ہی چلا آیا ہو۔ اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ علم فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصّہ اسلام کے معاشی قوانین ہی پر مشتمل ہے اور بہت سے لوگوں نے ان احکام کو قانونی دفعات کی شکل میں بھی مدون کردیا ہے، مگر اس کا علاج کس کے پاس ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے دین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت اور توانائی کا ہزارواں حصّہ بھی خرچ نہ کریں، کبھی قرآن، حدیث اور فقہ کو سنجیدگی کے ساتھ نہ پڑھیں، اور جب کوئی شخص ''اسلام کے معاشی نظام'' کا نام لے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا شروع کردیں کہ یہ کوئی ایسی نئی اصطلاح ہے جس کا نہ کوئی مفہوم ہے اور نہ ماضی میں اس کا کوئی عملی وجود قائم ہوا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے اس وقت یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں جس اسلامی نظام کو علماء دین سب سے بہتر کہتے ہیں وہ آخر ہے کیا؟

اس کا مکمل جواب تو یہی ہے کہ اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھیئے، ہر جز کی تفصیلات سامنے آجائیں گی، لیکن یہ معلوم ہے کہ فی الوقت یہ سوال کوئی خالص علمی حیثیت کا سوال نہیں جس کو فرصت کے اوقات میں حل کیا جاسکے، بلکہ یہ ملک کے ہنگامی حالات کا پیدا کیا ہوا سوال ہے جس کا مختصر جواب جلد سے جلد سامنے آجانا چاہیئے

چنانچہ ہم ذیل میں نمونے کے طور پر اسلام کے معاشی نظام کی چند بنیادی خصوصیات پیش کررہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ اگر ہمارے ملک میں صحیح اسلامی نظام رائج ہوتو اپنی معیشت کے موجودہ ڈھانچے میں ہمیں کون سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی، تقسیم دولت کے موجودہ نظام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اوران کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیوں کر پیدا ہوسکے گی؟

اس وقت ہمارا سب سے بڑا معاشی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے عوام کی سب سے اہم اور معقول شکایت یہ ہے کہ ملک کی معاشی ترقی سے چند گنے چنے خاندان نہال ہورہے ہیں، اور عام آبادی فقر وافلاس کا شکار ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی ستائی ہوئی دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے آج کل ''سوشلزم'' کا نسخہ پیش کیا جارہا ہے، لیکن ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال کا علاج سوشلزم کے پاس نہیں ہے۔ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔

غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی معاشی پریشانی کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں۔ آمدنی کی کمی اور گرانی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی اوران دونوں اسباب کی ذمہ داری ہماری معیشت کے اس سرمایہ دارانہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے پوری قوم کی دولت کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اسلام کا نظام معیشت نافذ ہوتو مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جائیں گی۔

❶ صنعتی اجارہ داریاں جو کارٹیل وغیرہ کی شکل میں رائج ہیں، ان سب کو ممنوع قرار دے کر آزاد مسابقت کی فضا پیدا کی جائے تاکہ ناجائز منافع خوری کا انسداد ہوسکے۔ اس وقت ان صنعتی اجارہ داریوں کی وجہ سے پورا بازار چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے اور وہی قیمتوں کے نظام کو اپنی طبعی رفتار سے ہٹا کر گرانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں تو منافع کی جو

زائد مقدار سرمایہ داروں کے پاس جا رہی ہے اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے

۲ کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کئے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو، یا جن کا بینک بیلنس پانچ ہزار روپے سے کم ہو اور اب تک اس قسم کی صنعتوں میں اس سے زائد آمدنی یا بینک بیلنس والے جن افراد کے حصص ہیں ان کے ساتھ سال کے ختم پر شرکت کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔

یہ طریقہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے کہ صنعتوں کے قومی ملکیت میں چلے جانے سے صنعتیں غریبوں کی ملکیت میں نہیں آتیں بلکہ ان پر سرکاری افسروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اس صورت میں غریب عوام براہ راست صنعتوں کے مالک ہوں گے اور ان پر نہ سرمایہ داروں کا تسلط ہوگا نہ حکومت کا۔

۳ ''سود'' ارتکاز دولت کا سب سے بڑا سبب ہے، قوم کے لاکھوں افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اس سودی نظام کی وجہ سے سارا کا سارا ان چند سرمایہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے جو بینک سے لاکھوں روپیہ قرض لے کر بڑی تجارتیں کرتے ہیں اور عوام کو نہایت معمولی سی رقم سود کی شکل میں ملتی ہے، اور چونکہ سرمایہ دار نفع کی اتنی بھاری مقدار حاصل کر کے بازار کے حکمران بن جاتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ معمولی سی رقم بھی بالآخر مزید کچھ سود لے کر ان ہی سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتی ہے مثلاً کراچی میں روئی کی لاکھوں گانٹھیں آتی ہیں، اور یہ ساری گانٹھیں صرف چند تاجر خریدتے ہیں جن کو بینک کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اپنے روپے سے گانٹھوں کا کاروبار کرنے والا ایک بھی نہیں ہے۔

اسلامی نظام قائم ہو تو یہ ظالمانہ نظام ختم ہو کر بینکاری کا نظام سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے گا۔ جس کے نتیجے میں بینک میں روپیہ جمع کرنے والے عوام بینک کے جمع شدہ سرمایہ کے نفع میں شریک ہوں گے اور اس سے دوطرفہ فائدے ہوں گے۔ ایک طرف بازار پر سے چند افراد کا تسلّط ختم ہوگا اور اس سے ارزانی پیدا ہوگی، دوسری طرف منافع کے حصّہ دار بہت زیادہ ہوں گے اور بڑی بڑی تجارتوں کا متناسب منافع بینکوں کے واسطے سے عوام تک پہنچے گا۔ اور دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے گی۔

بینکاری کے نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلانے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کی تفصیلات متعدد علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہیں اور بینکاری کے ماہرین نے انہیں قطعی طور پر قابل عمل اور زیادہ مفید قرار دیا ہے (اس نظام کا ایک خاکہ انشاءاللہ عنقریب الگ شائع کر دیا جائے گا)

۲ اشیاء کی گرانی اور سرمایہ کے ارتکاز کا دوسرا بڑا سبب ہمارے معاشرے میں سٹہ کی اندھی تجارت ہے، سٹہ کی مفصّل خرابیاں بیان کرنے کے لئے تو ایک مستقل مقالہ چاہیئے۔ ایک مختصر مثال یہ ہے کہ اس کاروبار کی وجہ سے مال کے ذخیرے ابھی بازار کے قریب بھی نہیں آنے پاتے کہ اس پر سینکڑوں سودے ہو جاتے ہیں، ایک تاجر مال کا آرڈر دے کر مال کی روانگی سے پہلے ہی اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے ہاتھ اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ۔ یہاں تک کہ جس وقت مال بازار میں پہنچتا ہے تو وہ بعض اوقات خرید وفروخت کے سینکڑوں معاملات سے گذر چکا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بازار تک پہنچتے پہنچتے اس کے دام کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں، بیس روپے کی چیز پچاس ساٹھ روپیہ میں بکتی ہے۔ یہ سارا نفع سٹہ باز اڑالے اڑتے ہیں اور عوام کی جیب خالی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں اس اندھے کاروبار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام میں مال

کے قبضے سے پہلے اسے بیچنا ناجائز ہے لہٰذا اسلامی نظام قائم ہوا تو سٹہ کا یہ سارا کاروبار ممنوع ہو جائے گا جس سے اشیاء صرف لازمی طور پر سستی ہوں گی اور منافع کی وہ زائد مقدار جو اس اندھے کاروبار کی وجہ سے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے، اس سے غریب عوام مستفید ہو سکیں گے۔

۵ ہمارے موجودہ نظام معیشت میں ارتکازِ دولت کا تیسرا سبب ''قمار'' ہے انشورنس کا پورا نظام اسی قمار پر قائم ہے، اس کے علاوہ گھوڑوں کی ریس، معمہ بازیاں، انواع واقسام کی لاٹریاں، کھیل تماشوں کے سیزن ٹکٹ، یہ سب قمار کی وہ ہلاکت آفریں اقسام ہیں جن کی زد سب سے زیادہ غریب عوام پر پڑتی ہے۔ اور ان کے ذریعہ غریب عوام کی کمائی کا ایک ایک روپیہ جمع ہو کر کسی ایک فرد پر ہُن برسا دیتا ہے اور باقی سب لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں قمار کی یہ تمام صورتیں ممنوع ہوں گی۔ اور عوام کو بے وقوف بنانے کے یہ دروازے بند ہو جائیں گے۔

انشورنس کے موجودہ نظام میں انشورنس کمپنیوں کے جمع شدہ سرمایہ سے سب سے زیادہ فائدہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے جو آئے دن مختلف حادثات کے بہانے رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، غریبوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے گویا اس طریقے سے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے جانی و مالی نقصانات کی ذمہ داری بھی ان غریب عوام پر ڈال دیتے ہیں جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اس طریقے کو بدل کر اسلامی حکومت ''امداد باہمی'' کی ایسی انجمنیں قائم کرے گی جو سود اور قمار سے خالی ہوں اور جن سے غریب عوام زیادہ بہتر طریقے سے مستفید ہو سکیں گے (اس کی عملی اسکیمیں بھی علماء کی طرف سے شائع کی جا چکی ہیں اور ان شاء اللہ عنقریب انہیں الگ منظر عام پر لایا جائے گا)

❻ ناجائز ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر بدنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنے ذخائر بازار میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔

❼ لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل ہو یہ رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں صنعت وتجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ داروں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کو اس ظالمانہ طریق کار سے آزاد کر دیا جائے تو اشیائے صرف خود بخود دستی ہو جائیں گی اور ایک عام آدمی بھی معمولی سرمایہ کے ذریعہ تجارت وصنعت میں داخل ہو سکے گا۔ اور آج کا مزدور کل کارخانہ دار بن سکے گا۔

❽ موجودہ نظام میں تنخواہوں کا معیار نہایت غیر منصفانہ اور مختلف درجات کا باہمی تفاوت بہت زیادہ ہے۔ اس تفاوت کو کم کر کے اونچے درجات کی تنخواہیں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوں گی۔ پنشن کی شرح بھی اونچے درجات میں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوگی۔

❾ ہمارے یہاں مزدوروں کی اجرت کی سطح بہت پست ہے، ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچ افراد پر مشتمل ایک اوسط درجے کے خاندان کا کم از کم خرچ دو سو بیس روپیہ ہے اور مشرقی پاکستان میں دو سو ساٹھ روپیہ لیکن اجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پست ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں اور مختلف صنعتوں میں کم از کم تنخواہ بہتر روپے سے لے کر ایک سو سترہ روپے تک رہی ہے اور نئی لیبر پالیسی میں زائد سے زائد مقدار ایک سو چالیس روپے مقرر کی گئی ہے، لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں یہ تنخواہ بھی ناقابل اطمینان ہے، اور اس میں

حقیقت پسندانہ اضافے کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اجرتوں کی ایسی کم از کم شرح متعین کردے جو مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور صنعتی نظام کے لئے قابل عمل بھی، اس کے تعین کے لئے مزدوروں، آجروں اور حکومت کے مساوی نمائندگان پر مشتمل اجرت بورڈ ہونا چاہئیے جو بدلتے ہوئے حالات میں اجرتیں تبدیل کرنے کا مجاز ہو کم از کم شرح متعین کرنے کے بعد اجرتوں کی مزید مقدار مزدوروں کی قوت معاملہ (BARGAINING POWER) پر چھوڑ دی جائے۔

⓾ آجروں کے ساتھ مزدوروں کے معاملے میں یہ شرط بھی حکومت کی طرف سے عائد کی جاسکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر یا خاص مدت میں، یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضے کے طور پر ان کو نقد بونس دینے کے بجائے کسی مخصوص کارخانے کے شیئرز مالکانہ حیثیت میں دے دے۔ اس طرح مزدور کارخانوں میں حصہ دار بھی بن سکیں گے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مزدوروں کی اجرت میں یہ اضافہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے جب کہ صنعتی اجارہ داریوں کو توڑنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدامات بھی کئے جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ورنہ اجرتوں کی زیادتی سے قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ اور سرمایہ دار جو رقم ایک جانب سے مزدور کو دے گا وہ دوسری طرف سے وصول کرلے گا اور مزدور کی مشکلات حل نہ ہوسکیں گی۔

⓫ مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی کی ایسی کم از کم شرح متعین کردے جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی معقول کفالت بھی کرسکے۔ اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کرنا چاہئیے جس میں کسانوں، زمینداروں اور حکومت کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

⓬ مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم وستم زمینداروں کی طرف

سے کسانوں پر ہوتے ہیں، ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں، بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کر دیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں۔ ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم ورواج کے ذریعہ ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

۱۳ مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم ورواج نے جڑ پکڑ لی اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں، یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشتکار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے۔ اس اجرت کا تعین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشتکاروں کو دیں گے۔

۱۴ احیاءِ موات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں، یعنی جو کاشتکار غیر مملوکہ غیر آباد بنجر زمینوں کو خود آباد کریں۔ ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔

۱۵ زمینوں کے رہن کے جتنے سودی طریقے رائج ہیں، ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اور جو زمینیں اس وقت ناجائز طریقوں سے زیر بار ہیں، ان سب کو چھڑا کر ان کے غریب اور مستحق مالکوں کی طرف لوٹایا جائے اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے، اس کرائے کو قرض میں محسوب کیا جائے، اور اگر کرائے کی رقم قرض سے زیادہ ہو تو وہ

وصول کر کے قرض دار کو دلوائی جائے۔

⓰ ہمارے یہاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوئی، اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان کے شرعی مستحقین میں تقسیم کرے۔ اگر اسلام کا قانونِ وراثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

⓱ انتقال جائداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے۔ اور زمینوں کی آزادانہ خرید وفروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

⓲ کاشتکاروں کے لئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔

⓳ کاشتکاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کئے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔

⓴ زرعی امداد باہمی کی تحریک میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔

㉑ ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہو کر گذرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (MIDDLE MEN) کی بہتات سے دوطرفہ نقصان ہوتے ہیں، ایک طرف کاشتکاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث کی رو سے اسلام میں دیہی کاشتکار اور شہری خوردہ فروش کے درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا۔ اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظّم بازار (ORGANISED MARKETS) کافی تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشتکار خود بلاواسطہ

پیداوار کو فروخت کر سکیں۔ یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کے لئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشتکاروں پر مشتمل ہوں اور یہ انجمنیں پیداوار فروخت کریں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشت کار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

۲۲ ''نفقات'' کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام وکمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت اسلام نے خاندن کے کشادہ دست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔

۲۳ زکوٰۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے۔

(الف) قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمای داروں نے زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوٰۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

(ب) ہر سال مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کر کے اسے غریبوں میں تقسیم کرے۔

(ج) سونے چاندی کی سالانہ زکوٰۃ مالکان خود ادا کریں گے۔ لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے کہ انہوں نے زکوٰۃ ادا کی ہے یا نہیں؟

۲۴ ملک کے ہر باشندے کے لئے روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوشش کے باوجود جو افراد بے روزگار رہ جائیں ان کے لئے روزگار کی فراہمی تک ''بیروزگاری الاؤنس'' جاری کیے جائیں۔

۲۵ حکومت کی طرف سے ایک ''فلاحی فنڈ'' قائم کیا جائے، اور اس فنڈ کے لئے سالانہ بجٹ میں مستقل رقم رکھی جائے اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں اضافہ کیا جائے۔ اس فنڈ کے ذریعہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں تاکہ اس رقم

کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہو اور ان کے منافع سے ''فنڈ'' میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ عام غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کے لئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کئے جائیں، کثیر تعداد میں مفت شفاخانے قائم کئے جائیں، بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے اقدامات کئے جائیں۔

(۲۶) کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بے ہودہ مخرب اخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف بیجا سے پرہیز نہ کرے، ''اسراف'' یوں تو انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی ملکیت ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ فضول خرچی قومی خزانے میں ہوتی ہے۔ ہر سال خزانے کا بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ شاہانہ تقریبات، سرکاری دوروں، عمارتوں کے سامان تعیّش اور زینت و آرائش کے بہانے قطعی بے فائدہ اور فضول خرچ ہوتا ہے، ان اخراجات کو قطعی طور پر بند کرنا تو ممکن نہیں، لیکن ان مقاصد کے لئے جس بے دردی کے ساتھ قومی روپیہ بہایا جاتا ہے اس کا کوئی شرعی عقلی اور معاشی جواز نہیں ہے، بسا اوقات ایک ایک دعوت پر ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے اور اگر حساب لگایا جائے تو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یقیناً اربوں روپیہ ان فضول خرچیوں میں صرف ہوا ہے۔ اسلامی نظام میں قومی دولت کے اس ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا تقریبات اور سرکاری دوروں کے لئے اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کر کے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے۔ اور اس طرح جو خطیر رقمیں بچیں انہیں ''فلاحی فنڈ'' میں داخل کیا جائے۔

(۲۷) قومی دولت کی ایک بہت بڑی مقدار آج کل ان مقاصد پر صرف ہو رہی

ہے جو شرعی طور پر حرام اور ناجائز ہیں، مثلاً شراب، فلموں اور دوسری حرام اشیاء کی درآمد پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے، زرمبادلہ کے اس زبردست نقصان کو بالکلیہ بند کیا جائے اور اس خطیر رقم کو عوامی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جائے غیر مسلموں کو شراب استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن درآمد کرنے کی نہیں۔

۲۸ خاندانی منصوبہ بندی کی خالص احمقانہ تحریک نے بھی ہماری معیشت کو نقصان پہنچایا ہے، تیسرے پنجسالہ منصوبے میں اس تحریک کے فروغ کے لئے ۲۸۴ ملین روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ (جب کہ سماجی بہبود کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم کل ۱۲۵ ملین ہے) یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی شرعی عقلی، سماجی، معاشی غرض ہر اعتبار سے پاکستانی عوام کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اس صورت میں قومی دولت اتنا بڑا حصّہ اس پر صرف کرنے کی بجائے زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی پیدا آوری بڑھانے پر صرف کیا جائے۔

انتظامیہ کی اصلاح:۔ قانون اور رواج میں مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ ہمیں اپنے انتظامی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں استحصال کا ایک بڑا سبب انتظامی خرابیاں بھی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہمارا قانون بالکل درست ہے۔ اور اگر اس پر عمل ہو تو ان خاص معاملات میں انصاف حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ہماری انتظامی مشینری اس قدر ناقص، از کار رفتہ، سست اور ڈھیلی ڈھالی ہے کہ قانون صرف کتابوں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے۔ اور عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ کی صورت حال یہ ہو تو ملک کا قانون کتنا ہی بے داغ کیوں نہ ہو، اس کے اچھے نتائج سامنے نہیں آ سکتے۔ لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لئے انتظامیہ کو ایمان دار، مضبوط، فعال اور قابو یافتہ بنانا قانون کے مؤثر ہونے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح

دور کیا جاسکتا ہے یہ باتیں مکمل طور سے تو انتظام (ADMINISTRATION) کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں، اور قوم کی تعمیر نو کے وقت ان ہی کی خدمات سے انتظامیہ کی اصلاح کی جاسکے گی۔ لیکن ہم یہاں چند سامنے کی مثالیں پیش کرتے ہیں، جن سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ نظم وضبط کی ابتری کس بری طرح ہمارے عوام کے لئے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

❶ ''رشوت'' ایک ایسا جرم ہے جو شاید کسی بھی نظام حیات میں جائز نہ ہو، ہمارا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آکر دیکھئے تو وہی رشوت جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جارہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک سب اسے شیر مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کالازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوّث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے اور جس کی جیب خالی ہو وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورت حال کو مضبوط اور ایمان دار انتظامیہ ہی ختم کرسکتی ہے، اگر اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرت ناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لئے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کردی جائیں تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔

❷ ہمارا عدالتی نظام اس قدر فرسودہ، پیچیدہ، دشوار گذار اور تکلیف دہ ہے کہ ایک غریب آدمی کے لئے ظلم پر صبر کرلینا دادرسی کی بہ نسبت آسان ہے۔ اس کے لئے یوں تو پورے عدالتی اور اس کی دیوانی وفوجداری ضابطوں کی تشکیل نو ضروری ہے لیکن خاص طور سے مندرجہ ذیل اقدامات فوری طور پر ضروری ہوں گے۔

(الف) صنعتی تنازعات کے تصفیہ کے لئے سرسری عدالتیں قائم کی جائیں جن تک پہنچنا مزدوروں کی براہ راست دسترس میں ہو اور جن کا طریق کار آسان ہو۔

(ب) زمینداروں اور کاشت کاروں کے تعلقات کی نگرانی اور کاشت کاروں کو ناجائز شرائط کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بھی سرسری عدالتیں قائم کی جائیں۔

(ج) عورتوں پر ہونے والے مظالم کی دادرسی کے لئے گشتی عدالتیں قائم کی جائیں جو سرسری طور پر مقدمات فیصل کریں۔

۳ مزدوروں کی صحت، حادثات سے تحفظ غیر معمولی محنت سے بچاؤ اور تنخواہوں کے معیار وغیرہ سے متعلق فیکٹریز ایکٹ اور دوسرے لیبر قوانین میں کافی احکام موجود ہیں لیکن کارخانوں کی عملی تحقیق کیجئے تو ان قوانین کا کوئی اثر وہاں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔فیکٹریز ایکٹ کے تحت کارخانوں میں ہوا، روشنی، صفائی، موسمی اثرات سے حفاظت اور دوسرے حفاظتی انتظامات ضروری قرار دیئے گئے ہیں اور ان کی نگرانی کے لئے فیکٹری انسپکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ متعلقہ فیکٹری انسپکٹر کا ماہانہ "وظیفہ" کارخانوں کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ انسپکٹر سال بھر میں چند برائے نام چالان کر کے اپنی کارکردگی دکھا دیتا ہے اور چند سو روپے جرمانے کے طور پر سرکاری خزانے کو پہنچ جاتے ہیں، رہا بیچارہ مزدور، سو اسکو فیکٹری ایکٹ کی کسی دفعہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جن مقامات پر وہ کام کرتا ہے، وہ جاڑوں میں سخت ٹھنڈے اور گرمیوں میں نہایت گرم ہوتے ہیں، طعام خانے میں انتہائی مضر صحت اشیاء فروخت ہوتی ہیں، بیت الخلاء اس قدر گندے اور ناکافی ہوتے ہیں کہ فیکٹریز ایکٹ دیکھتا رہ جائے۔ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ ایسی ہی چست اور دیانت دار ہو تو کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کارگر نہیں ہو سکتا۔

۴ "سرخ فیتے" کی مصیبت ہمارے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور اس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے اپنی کسی ضرورت کے تحت دفتری کاموں سے سابقہ پڑا ہو، اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ جو شخص وسائل واسباب اور تعلقات نہ رکھتا ہو وہ اپنے جائز حقوق آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ایک ہی

نوعیت کے کاموں کے لئے محکموں اور اداروں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے اور ان میں سے ہر ایک محکمے پر قومی دولت کا مستقل حصّہ صرف ہو رہا ہے، لیکن ہر محکمے میں فائلوں کے انبار لگے پڑے ہیں اور کام نمٹنے میں نہیں آتا۔

انتظامیہ کی ابتری کی چند مثالیں صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہیں کہ نظم وضبط کے فقدان کا براہ راست اثر عوام کی معیشت پر پڑ رہا ہے، اور قانون کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جب تک انتظامیہ کو مستحکم اور فعّال نہیں بنایا جائے گا۔ عوام کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

سادہ معاشرت کا رواج: ۔ معاش کے سلسلے میں عوام کی پریشانیوں کا تیسرا اہم سبب وہ مغربی معاشرت ہے جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلّط کر رکھی ہے، اسلام ہمیں سادہ طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر ہمارے ملک پر آسمان سے ہُن بھی برسنے لگے تب بھی ہمیں تکلّف اور تعیّش کی زندگی سے مکمل پرہیز کرنا چاہئیے ۔ اگر اسلامی نظام قائم ہو تو ہمیں اپنی معاشرت میں مندرجہ ذیل اصلاحات کرنی ہوں گی۔

❶ رہن سہن کے پر تکلّف، عیش پرستانہ اور مہنگے طریقے یکسر چھوڑ دینے ہوں گے جو ہم نے مغرب سے درآمد کئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے لباس اپنی وضع قطع، اپنے طرزِ رہائش، اپنی تقریبات غرض معاشرت کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں اور اس احمقانہ تقلید کو تہذیب کی علامت سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک شخص اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ دو ڈھائی سو روپے کا اپ ٹو ڈیٹ سوٹ نہ پہنے ہوئے ہو، اس کے پاس جدید ترین آسائشوں والا بنگلہ نہ ہو، اس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر نہ ہو اور اس گھر میں ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن نہ لگا ہوا، ہو ظاہر ہے کہ جب یہ چیزیں تہذیب کی شرط

لازم قرار پا گئی ہیں تو لوگوں کا شب و روز ان کے حصول میں کوشاں رہنا قدرتی امر ہے چنانچہ اس معاملے میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے، اس غرض کے لئے جب محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیتا ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے حکام، وزراء، سیاسی رہنما اور سماجی کارکن سادہ طرز معیشت اختیار کرنے کی ملک گیر تحریک چلائیں، اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں اس لئے کہ جب تک ہمارے اعلیٰ حکّام، دولت مند افراد اور سیاسی رہنما اپنے لباس، اپنی نشست برخاست، اپنی تقریبات، اپنے طرز رہائش اور اپنی عام زندگی میں سادگی کو نہیں اپنائیں گے، عوام تکلفات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات نہیں پاسکیں گے جو ان کی معاشی بدحالی کا بڑا سبب ہے اور جس کا نتیجہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

۲ سامانِ تعیّش کی درآمد بالکل بند کردی جائے اور تمام اشیائے صرف میں ملک کی اپنی پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

۳ جو اشیائے صرف ایسی ہیں کہ وہ پاکستان میں متوسط یا اعلیٰ معیار کی پیدا ہونے لگی ہیں (مثلاً کپڑا) ان کی درآمد پر بھی پابندی عائد کردی جائے تو عوام میں سادگی کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی اور زرمبادلہ میں بھی کفایت ہوگی۔

۴ شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ پر اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کردی جائے جس سے زائد خرچ کرنا قانوناً جرم ہو۔

۵ بعض صنعتیں اور کاروبار ایسے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں، اور آج ان کو بند کرنے کا قصور بڑا نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ ان کی برائی کو جاننے بوجھنے کے باوجود انہیں بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں، لیکن اگر اپنے مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کرنا ہے تو

ہمیں اس جھجک کو ختم کر کے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کرنے ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی نامانوس اور اجنبی کیوں نہ معلوم ہوں۔ مثلاً فلم انڈسٹر اور ٹیلی ویژن ایسے ادارے ہیں جنھوں نے قوم کو اخلاقی تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے، جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیگا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس صنعت نے قوم کو نقصان ہی نقصان پہنچایا ہے۔ جس قوم کی نوے فیصد آبادی فقر و افلاس کا شکار، تعلیم و تربیت سے محروم اور فن و تکنیک میں پسماندہ ہو، اس کے لئے آخر کیسے جائز ہے کہ وہ اپنا کروڑوں روپیہ سالانہ ان کھیل تماشوں پر صرف کردے جو صحت، اخلاق اور ذہنی پاکیزگی کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہے ہیں اور جو مالی انسانی وسائل اس وقت اس قسم کی چیزوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں موجودہ حالت پر برقرار رکھنا گھر پھونک تماشا دیکھنے کے مترادف ہے۔ اگر انہیں کسی ایسی صنعت پر لگایا جائے جو قوم کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہو تو ہمیں معاشی ترقی میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اسلام صحت مند تفریح کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تفریح کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کا حاصل صحت، اخلاق اور پیسہ کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسی مفید اور صحت مند تفریحات کو فروغ کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے لئے مفید ہوں یا کم از کم مضر نہ ہوں؟

❻ ہمارے معاشرے میں پیشے کی بنیاد پر جو سماجی طبقات پائے جاتے ہیں اور جس طرح انہیں عزّت و ذلّت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی سراسر غیر اسلامی تصوّر ہے جو ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔ یہ چیز اسلام کی معاشرتی مساوات کے تو قطعی خلاف ہے ہی، اس کا معاشی نقصان بھی یہ ہے کہ یہ سماجی تقسیم محنت کی آزاد نقل پذیری (MOBILITY) میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محنت کی آزاد نقل پذیری کے بغیر متوازن معیشت کا قیام مشکل ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح نظامِ تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت کے ذرائع اور سماجی تحریکات کے ذریعہ کی

جاسکتی ہے۔

۷ ملازموں، مزدوروں اور کسانوں کا سماجی رتبہ (SOCIAL STATUS) بلند کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مزدور اور آجر ایک ہی برادری کے دو فرد ہیں جو اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آجر اپنے عام روّیہ میں مزدور کو کمتر سمجھے اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی پر دونوں کو ایک دوسرے کا قانونی محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مزدور تو آجر کے ساتھ تعظیم کا معاملہ کرنے پر مجبور ہو اور وہ اس کے ساتھ تحقیر وتوہین کا معاملہ کرے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے بھی نظام تعلیم اور نشر واشاعت کے تمام ذرائع سے کام لے کر لوگوں کے ذہنوں کی از سر نو تعمیر کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ ایسے قانونی احکام بھی نافذ کئے جائیں جن کی رو سے ملازمین کے ساتھ اہانت آمیز روّیہ اختیار کرنا قابل تعزیر جرم ہو۔ اس سے جہاں معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہوگی وہاں سادہ طرز معیشت کے قیام میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

آخر میں ہمیں ایک بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ظلم واستحصال درحقیقت اس بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جو خدا کے خوف، آخرت کی فکر اور انسانی اخلاق سے بے نیاز ہو لہٰذا ہماری معیشت میں جو بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا اصل سبب خود غرضی، سنگدلی، کنجوسی اور مفاد پرستی کی وہ انسانیت سوز صفات ہیں جو ہمیں مغرب کی مادہ پرست ذہنیت سے ورثے میں ملی ہیں، اور ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھا چکی ہیں۔ اگر اسلام کا نظام حیات قائم ہو تو چونکہ اس کی بنیاد ہی خدا کے خوف اور آخرت کی فکر پر ہے لہٰذا یہ ضروری ہوگا کہ قانون کے ساتھ ساتھ قلب اور ذہن کی اصلاح کی طرف

پوری توجہ کی جائے۔ تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل کو کام میں لا کر ان اسلامی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلایا جائے جو دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کریں، جن کے ذریعے باہمی اخوت اور ایثار و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں' اور جن سے ایسے ذہن تیار ہوسکیں جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح کو دنیا کی ہر مادی منفعت پر فوقیت دیتے ہوں۔

دنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کا ڈنڈا کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کرسکا، اور جب تک قانون کی پشت پر ایک مضبوط روحانی عقیدہ نہ ہو، ظلم واستحصال کو روکا نہیں جاسکتا۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایثار و مروت' انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت واستغنا کے جو فقید المثال واقعات ملتے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی خدا کا خوف اور آخرت کی فکر تھی جو قوم کے ہر ہر فرد کے رگ وپے میں سما گئی تھی، اگر آج پھر اس جذبے اور عقیدے کو نئی زندگی دی جائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا دور آج بھی لوٹ سکتا ہے۔

قلب وروح اور ذہن ودماغ کا یہ انقلاب بعض لوگوں کو مشکل نظر آتا ہے' لیکن اگر حکومت اس انقلاب کو اپنا واقعی نصبُ العین بنا کر صحیح خطوط پر کام کرے تو ہم دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ چند ہی سال میں ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ جائے گی۔ ہم موجودہ حالات میں خواہ کتنے برے سہی لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ الحمد للہ ہمارے دلوں میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور اگر کوئی اس چنگاری کو ہوا دینے والا مل جائے تو یہ آن کی آن میں بھڑک کر شعلہ بن سکتی ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ میں اسی قوم نے دو مرتبہ بڑا حسین اور قابل فخر کردار پیش کیا ہے، ایک قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے موقع پر اور دوسرے ستمبر ۱۹۶۵ء کے

جہاد کے وقت، ان دونوں مواقع پر اِسی گئی گزری قوم کا ایسا حسین رخ نکھر کر سامنے آیا ہے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ جس قوم نے ۴۷ء اور ۶۵ء میں شجاعت وجوانمری، نظم وضبط، فرض شناسی، ایثار وہمدردی اور سخاوت وفیاضی کا یہ حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا تھا، کیا یہ وہی قوم نہیں تھی جس کی کام چوری، خودغرضی، بدنظمی اور بخل ومفاد پرستی کا آج رونا رویا جارہا ہے؟ جب یہ وہی قوم ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت اس میں اتنا بڑا انقلاب کیوں کر رونما ہوگیا تھا؟

اس سوال پر جتنا بھی غور کیجئے، اس کا صرف ایک جواب ہے کہ درحقیقت ان مواقع پر قوم کے رہنماؤں نے سچّے دل سے ایمان کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوادی تھی اور قوم کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ اسے اسلام کے صرف نام پر نہیں بلکہ اس کے حقیقی کام پر دعوت دی جارہی ہے۔ اس اطمینان نے قوم میں اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا اور یہ دکھلا دیا کہ ؏

ایسی چنگاری بھی یارب میرے خاکستر میں تھی

مگر افسوس کہ اس چنگاری کو ہوا دینے والوں نے آئندہ اس سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور عوام کا یہ ابھار ایک وقتی ابال ثابت ہوا۔ لیکن اگر مستقل طور سے اس چنگاری کو بھڑ کا دیا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قومی شعور دیر پا ثابت نہ ہو لہٰذا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر صحیح معنیٰ میں اسلامی نظام قائم ہو اور اس کے لئے قوم سے قربانیاں طلب کی جائیں تو یہی قوم چند سالوں میں ایسی عظیم الشان قوت بن کر ابھرے گی جس کا کوئی مدِّ مقابل نہ ہوگا۔ جو قوم جنگ کے زمانے میں یرموک وقادسیہ کی یاد تازہ کرسکتی ہو، وہ امن کے زمانے میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے دور کو کیوں زندہ نہیں کرسکتی؟

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ:۔

❶ ملک کے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنایا جائے [1]
اور طلباء کی تربیت خالص اسلامی خطوط پر کی جائے۔

❷ ملک کے حکمران مغربی طرزِ زندگی کو چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کریں اور قومی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کی واضح اور روشن مثالیں عوام کے سامنے لائیں۔

❸ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو خواہ وہ ریڈیو ہو یا اخبارات، اسلامی رنگ میں رنگا جائے، فحاشی، عریانی اور عیش پرستی پر ابھارنے والے پروگراموں کو بالکل بند کر کے ان کی جگہ ایسے پروگرام وضع کیے جائیں جو قومی شعور، اجتماعی فکر، ایثار، خدا ترسی اور فکرِ آخرت کے جذبات پیدا کریں۔

❹ انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے امیدوار کے مطلوبہ دینی و اخلاقی معیار کو شرط لازم قرار دیا جائے، اور نری کاغذی ڈگریوں کو دیکھنے کے بجائے امیدوار کے دینی و اخلاقی کردار پر کڑی نظر کی جائے۔

❺ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو دین دار، خدا ترس اور ملّت کا درد رکھنے والے مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اپنی تمام توانائیاں لوگوں میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے پر خرچ کرے۔

❻ مساجد اسلامی معاشرے کے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو آباد کرنے پر پوری توجہ دی جائے۔ اعلیٰ حکام ''اقامتِ صلوٰۃ'' کی تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں۔

اگر اس قسم کے چند اقدامات حکومت کی طرف سے کر لئے گئے تو یہ بات

---

[1] نظامِ تعلیم سے متعلق اپنی مفصل تجاویز ہم البلاغ کے شمارہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں پیش کر چکے ہیں۔ اور ان کا خلاصہ مرکزی جمعیت علماء اسلام کراچی ڈویژن نے الگ شائع کر دیا ہے۔

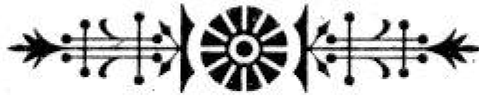
دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس ملک کی بالکل کایا پلٹ جائے گی اور یہاں ایک ایسی قوم تیار ہوگی جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی سعی و عمل اور اپنے افکار و جذبات کے لحاظ سے دنیا کے لئے قابل صد رشک ہوگی، افراد سازی کے اس کارنامے کے بعد ظلم واستحصال بالکل خاتمہ ہوجائے گا، اور دنیا خود کھلی آنکھوں دیکھ لے گی کہ جس معاشی بے چینی نے پورے کرۂ زمین کو تہ وبالا کیا ہوا ہے، وہ اسلامی نظام کے تحت کتنی خوبصورتی کے ساتھ سکون واطمینان اور عمومی خوشحالی کے ساتھ بدل گئی ہے۔

مشکلات دنیا کے ہر اہم کام میں ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ کام جو انقلابی نوعیت رکھتا ہو، چنانچہ اسلامی انقلاب لانے میں بھی بلاشبہ مشکلات ہوں گی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس ملک میں کوئی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں لایا جاسکتا جتنی آسانی سے یہاں اسلامی انقلاب آسکتا ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ اسلام کی بنیاد پر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ فی نفسہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ پاکستان کی سرزمین اسلام کے لئے دنیا کے ہر خطے سے زیادہ سازگار ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں انقلاب لانے میں سب سے زیادہ مؤثر قوت اس قوم کے جذبات اور اس کا انقلابی شعور ہوتا ہے، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی محبت وعظمت اور اسے روبہ عمل دیکھنے کی آرزو یہاں کے عوام کی رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے، اور اگر انہیں یہ احساس ہو کہ یہاں سچے دل سے اسلامی انقلاب کی کوشش ہورہی ہے تو وہ ہر کڑی سے کڑی مشکل کو جھیل جائیں گے۔

اس کے برخلاف اگر یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا، اس کے نافذ کرنے میں اس قدر مشکلات ہوں گی کہ سالہا سال تک ملک کا امن اور چین رخصت ہوجائے گا، سوشلزم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے لائے ہوئے انقلاب میں کشت وخون، جبر وتشدد اور بدامنی وہنگامہ خیزی

جزولازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اس حقیقت سے کوئی شخص ہزار جھوٹ بول کر بھی شاید انکار نہ کر سکے کہ سوشلزم یہاں کے عوام کی آرزو نہیں ہے۔ اسے لانا نہیں، تھوپنا پڑے گا، اور یہاں کے عوام ہزار طرح کے پروپیگنڈے اور جبر وتشدد کے باوجود اپنے قلبی جذبات کے ساتھ سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ اور صدیوں تک حکومت اور عوام کی رسہ کشی بند ہونے میں نہیں آئے گی۔

اس کے علاوہ سوشلزم کے قیام سے تقسیم دولت کی موجودہ ناہمواری کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ زمینوں یا کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے سے ایک غریب انسان کی معاشی مشکلات دور نہیں ہوں گی، کچھ اور بڑھ جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کے وکلاء ہمیشہ ''قومی ملکیت'' کا ایک مبہم نعرہ لگاتے رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی مربوط، منظّم اور سوچا سمجھا معاشی پروگرام نہیں ہے۔ (بحوالہ ماہنامہ البلاغ دسمبر ۱۹۶۹ء کراچی)



آدابُ السفر

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصًا علیٰ سیدنا محمد المجتبیٰ و من یھدیہ اھتدیٰ

زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
یہ اقامت تجھے پیغامِ سفر دیتی ہے

اہلِ بصیرت کے نزدیک تو دنیوی زندگی ساری ہی سفر ہے اور ہر انسان قیامَت تک مسافر ہے۔ اُس کا وطن اصلی وہ جگہ ہے جہاں پہنچ کر ارشاد ہوگا کہ (خلود لاموت) یعنی اب یہ حالت دائمی ہے جس کے بعد موت نہیں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو جیسے پردیسی مقیم یا راہ رَو مسافر حقیقی کی ایک مثال ہے جو عبرت و یادگار کے طور پر دنیا میں لائی گئی۔ عقلمند کا فرض ہے، کہ وہ اس سے سبق لے اور خدا کی ان نشانیوں پر اندھوں کی طرح نہ گزر جائے اور ہر وقت سفر آخرت کی تیاری میں مشغول رہے اور اپنے سفر و حضر کو نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے موافق بنانے کی کوشش کرے۔

اسی مقصد کے لئے سیدی وسندی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم دیوبند نے رسالۂ نافعہ (رفیقِ سفر) کے نام سے تصنیف فرمایای جو بیسیوں مرتبہ چھپ کر مقبول خاص وعام ہو چکا ہے۔

لیکن یہ رسالہ صرف ان اہم مسائل پر مشتمل تھا جن سے عموماً لوگ غافل ہیں۔ معمولی مسائلِ سفر اس میں درج نہ تھے لیکن آج کل احکام اسلامیہ سے عام غفلت

کی وجہ سے معمولی مسائل سے بھی عام لوگ بے خبر نظر آتے ہیں اس لئے احقر نے باقی ماندہ ضروری احکام وآداب کو جمع کر کے اُس کا جزو بنادیا اور آداب السفر کے نام سے موسوم کیا۔

جس میں اذکار السفر یعنی وہ دعائیں بھی جمع کردی گئی ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے مختلف مناظر ومنازل میں پڑھا کرتے تھے اور جو تمام دینی اور دنیوی مقاصد کی کنجی ہیں۔ امید کہ جو حضرات اس سے نفع اٹھائیں احقر کو بھی دعاءِ خیر سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

نیّتِ سفر

عادتاً سفر دو قسم کے ہوسکتے ہیں۔ (اوّل) خالص دین کے لئے۔ (دوم) دنیا کے لئے۔ اوّل کی مثال سفر حج، سفر جہاد، سفر طلب علم کے لئے۔ سفر علماء وصلحاً کی زیارت کے لئے، سفر اپنے دینی بھائی کی زیارت کے لئے خواہ رشتہ دار ہو یا نہ ہو وغیر ذٰلک، ان میں جس درجہ کا مقصد ہے اُسی درجہ میں سفر فرض یا واجب یا مستحب ہوتا ہے اور بہر حال ان میں ہر قدم پر ثواب ملتا ہے۔

دوسرا سفر دنیا کے واسطے جیسے تجارت کے لئے یا کسب معاش کی کسی دوسری صورت کے لئے یا محض تفریحِ طبع کے لئے۔ یہ بھی ایک حد تک فرض و واجب و مستحب ہوتے ہیں اور ضرورت سے زائد مباح اور جائز لیکن عقلمند کے لئے مناسب ہے کہ اس سفر میں بھی نیت دین کی رکھے کیونکہ تمام دنیا کے کاروبا دین کی نیت کرنے سے عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً

تجارت کے لئے نکلے تو یہ نیت کرے کہ جن لوگوں کا نان نفقہ، حق تعالیٰ نے میرے ذمہ واجب کیا ہے وہ ادا کروں گا اور اس سے جو بچے گا اُس میں اپنے مفلس بھائیوں کی امداد یا دوسری مذہبی ضرورتوں میں صرف کروں گا اور سال پورا ہونے پر

زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، ادا کروں گا، قربانی کروں گا، سفر حج کے لئے کافی جمع ہوگیا تو حج کروں گا۔

❶ سفر کے لئے جمعرات یا شنبہ کا دن زیادہ مبارک اور بہتر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں دنوں میں سفر کرنے پر برکت کی دعا فرمائی ہے (تخریج العراقی علی الاحیاء بسند ضعیف)

❷ جمعہ کے دن جمعہ سے پہلے سفر کرنا بہتر نہیں مگر جائز ہے اور بعد اذان کے قبل نماز جمعہ سفر کرنا حرام ہے (عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کنز ص ۳۴۵ ج ۳)

❸ علی الصباح سویرے سفر کرنا بھی مبارک ہے، حدیث میں اس کے لئے بھی دعا فرمائی ہے۔ (ترمذی بسند حسن)

❹ مناسب ہے کہ کوئی اپنا رفیقِ سفر تلاش کر لے (بالخصوص طویل سفر کے لئے) اس میں بہت سے دینی اور دنیوی فوائد ہیں۔ حدیث میں اس لئے اکیلے سفر کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ رفیق ایک بھی کافی ہے مگر چار رفیق ہونے زیادہ بہتر ہیں (کمارواہ الترمذی وابوداؤد عن ابن عباس)

❺ اگر چند آدمی مل کر سفر کرنا چاہتے ہیں تو چاہیئے کہ کسی ایک کو اپنا امیر بنالیں اور جب آپس میں کوئی اختلاف رائے پیش آئے اس کے فیصلہ پر عمل کریں اگرچہ خلافِ طبع ہو۔

حدیث میں اس کا حکم فرمایا گیا ہے۔ (ابوداؤد عن ابی ہریرۃ غ ص ۳۴۰ ج ۳)

❻ سفر سے پہلے ضروری سامانِ سفر تیار کر لے تاکہ دوسروں کو اس کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچے۔ سفر میں سُرمہ، کنگھا، مسواک، قینچی ساتھ رکھنا سنت ہے (تخریج عراقی علی الاحیاء عن الطبرانی بضعف)

❼ مستحب ہے کہ سفر سے پہلے استخارہ کرے یعنی دو رکعت نماز پڑھ کر یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ نَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَنَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ وَلَا نَعْلَمُ وَتَقْدِرُ وَلَا نَقْدِرُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا السَّفَرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَقَدِّرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا السَّفَرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ اَوْ دُنْيَايَ اَوْ عَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ ثُمَّ قَدِّرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِيْ بِهٖ.

تنبیہ: عرب کی عادت تھی اور اب بھی قدیم طرز کے ہندوؤں کی عادت ہے کہ سفر کے لئے کوئی طالع نجوم دیکھتا ہے اور کوئی جانوروں سے فال لیتا ہے۔ ہزاروں درود ہوں ہمارے نبی امی ﷺ پر جن کی بدولت ہمیں اللہ تعالیٰ نے ان در در کی ٹھوکروں سے نجات دی اور سب کے قائم مقام استخارہ کو فرما دیا۔ جس کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے **ماخاب من استخره** (یعنی جو شخص استخارہ کر کے کام کرتا ہے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا)۔

سفر کے وقت

اپنے مقامی دوستوں اور اعزاء واقرباء سے رخصت ہو۔ (ابن ماجہ)

دوستوں عزیزوں سے رخصت ہوتے ہوئے یہ دعا پڑھے۔ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ. (نسائی فی عمل الیوم واللیلۃ) وَاَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا تَضِيْعُ وَدَائِعُه (ابن ماجہ) جو شخص بوقت رخصت یہ دعا پڑھے گا انشاء اللہ تعالیٰ اُس کی تمام چیزیں محفوظ رہینگی، اور رخصت کرنے والے مقیم لوگوں کو چاہئے کہ بوقت رخصت یہ دعا پڑھیں۔

فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَ فِيْ كَنَفِهٖ زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰى وَ غَفَرَ ذَنْبَكَ وَ وَجَّهَكَ فِي الْخَيْرِ حَيْثُ مَا كُنْتَ.

ترجمہ: تم اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں سفر کرو، اللہ تمہیں توشہ تقویٰ عطا

فرمائیں اور تمہارے گناہ بخشدیں اور جس جگہ تم جاؤ تمہیں خیر کی طرف متوجہ فرمائیں۔

جب سفر کے لئے کپڑے پہنے

حدیث میں ہے کہ سفر میں جانے والے کا بہترین خلیفہ جس کو وہ اپنے گھر بار کی نگرانی کے لئے چھوڑتا ہے وہ چار رکعتیں ہیں۔ جو لباس سفر پہننے کے بعد اپنے گھر میں پڑھتا ہے جس میں سورہ فاتحہ کے بعد قُل ھواللہ احد پڑھی جاتی ہے اور چاہئے کہ یہ چار رکعت پڑھ کر یہ دُعا پڑھے:۔

اللّٰھُمّ انی اتقرب بھن الیك فاخلفنی بھن فی اھلی و مالی.

(تخریج العراقی علی الاحیاء)

ترجمہ: یا اللہ میں ان رکعتوں کے ذریعہ تجھ سے قرب حاصل کرتا ہوں تو ان کی وجہ سے میرے اہل وعیال اور مال کی حفاظت فرما۔

حدیث میں ہے کہ یہ چار رکعت اور دعاء اُس کے واپس ہونے تک اس کے گھر بار اور اہل وعیال کی محافظ ہوں گی اور نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب سفر کے لئے اٹھتے تو یہ دعاء پڑھتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ بِكَ اِنْتَھَزْتُ وَ اِلَیْكَ تَوَجَّھْتُ وَ بِكَ اِعْتَصَمْتُ وَعَلَیْكَ تَوَکَّلْتُ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ ثِقَتِیْ وَاَنْتَ رِجَائِیْ اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ مَا اَھَمَّنِیْ وَ مَا لَا اَھْمَّ لَهٗ وَمَا لَهٗ وَ مَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُ كَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُكَ اَللّٰھُمَّ زَوِّدْنِی التَّقْوٰی وَوَجِّھْنِیْ لِلْخَیْرِ اَیْنَما، تَوَجَّھْتُ.

(زاد المعاد عن البیہقی ص ۲۸۷)

ترجمہ: یا اللہ میں تیری ہی مدد سے اُٹھتا ہوں اور تیری ہی طرف توجہ کرتا ہوں اور تجھ سے ہی وقت حاصل کرتا ہوں۔ اور تجھ پر ہی توکل کرتا ہوں یا اللہ تو ہی میرا اعتماد ہے اور تُو ہی میری اُمید ہے، یا اللہ تو کفیل ہو جا اس کام کے لئے جس کی میں کوشش کرتا ہوں۔

اور اس کے لئے بھی جس کا میں اہتمام نہیں کرتا اور اس کے لئے بھی جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ تیری پناہ میں آنے والا قوی ہو جاتا ہے اور تیری تعریف بڑی ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں یا اللہ مجھے توشۂ تقویٰ عطا فرما اور جس طرف متوجہ ہوں میرا رُخ خیر اور بھلائی کی طرف پھیر دے۔

جب گھر سے نکلے

تو یہ دعا پڑھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْاَزِلَّ اَوْاَظْلِمَ اَوْاُظْلَمَ اَوْاَجْهَلَ اَوْيُجْهَلُ عَلَيَّ.

ترجمہ: میں اللہ کے نام پر سفر کرنا شروع کرتا ہوں اور اللہ پر توکل کرتا ہوں اور کسی کام کی قوت نہیں۔ بجز اللہ تعالیٰ کے۔ اے میرے رب میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں گمراہ ہو جاؤں یا دوسروں کو گمراہ کروں اور اس سے کہ میں لغزش کروں یا کسی دوسرے کو لغزش دوں اور اس سے کہ میں کسی پر ظلم کروں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے اور اس سے کہ میں کسی سے بد خلقی کروں یا کوئی مجھ سے بد خلقی کرے۔

جب سواری پر سوار ہو

تو تین بار اللہ اکبر کہے اور یہ پڑھے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَ اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ.

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے اس سواری کو تابع بنا دیا حالانکہ ہماری طاقت نہ تھی کہ اس کو تابع بنا لیتے اور ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اور پھر یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ فِیْ سَفَرِیْ ھٰذَالبِرَّ التَّقْوٰی وَمِنَ الْعَمَلِ مَا رَضٰی اَللّٰھُمَّ هَوِّنْ عَلَیْنَا السَّفَرَ اَطْوِلْنَا الْبُعْدَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْاَھْلِ اَللّٰھُمَّ اَصْحِبْنَا فِی سَفَرِنَا وَاخْلُفْنَا فِی اَھْلِنَا.

(زاد المعاد ص ۲۸۷ ج۱)

ترجمہ: یا اللہ میں تجھ سے طلب کرتا ہوں اس سفر میں نیکی اور تقویٰ اور وہ عمل جس سے تو راضی ہو۔ یا اللہ مجھ پر یہ سفر سہل فرمادے اور میرے بعد مسافت کو طے فرمادے یا اللہ تو ہی سفر میں میرا ساتھی ہے اور تو ہی وطن میں میرے اہل وعیال کا نگران ہے، یا اللہ سفر میں ہمارے ساتھ ہو اور ہمارے اہل وعیال کا نگراں ہو۔

اور صحیح مسلم کی روایت میں اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَأبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَمِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الکَوْرِ وَمِنْ دَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ وَمِنْ سُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ.

ترجمہ: یا اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں سفر کی شدت ومشقت سے نا کام لوٹنے سے اور ترقی کے بعد منزل سے اور مظلوم کی بد دعا سے اور اہل عمال میں کوئی نا گوار بات دیکھنے سے۔

راستہ میں

جب کسی بلندی پر چڑھے تو اللہ اکبر کہے اور کہے اللّٰھم لك الشرف علی کل شرف ولك الحمد علی کل حال. اور جب پستی میں اترے تو سبحان اللہ کہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کرام کی یہی عادت تھی۔

(زاد المعاد مصری ص ۲۸۰)

مسئلہ۔ اپنے رفیق کے ساتھ نہایت نرمی سے پیش آوے وہ اگر تکلیف بھی

پہنچائے تو صبر کرے اور اگر حجت سے زائد خرچ یا کھانا وغیرہ پاس ہو تو غریب رفقاء کی امداد کرے۔

مسئلہ۔ کتا اور گھنٹا سفر میں ساتھ نہ رکھے، حدیث میں ہے کہ اس جماعت کے ساتھ نیکی کے فرشتے نہیں جاتے جس کے ساتھ کتا یا گھنٹا ہو۔ (لیکن آجکل جو گھنٹی بائیسکل وغیرہ میں لوگوں کو ہٹانے کے لئے لگائی جاتی ہے۔ وہ اسمیں داخل نہیں اس کا مضائقہ نہیں) (بندہ محمد شفیع غفرلہ)

مسئلہ۔ اگر سواری کسی جانور پر ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر رکھنا جائز نہیں (احیاء)

مسئلہ۔ جانور کے مُنہ پر نہ مارے کہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔

مسئلہ۔ جانور کی پیٹھ پر سوئے نہیں کیونکہ اُس سے جانور کو تکلیف پہنچتی ہے۔

مسئلہ۔ صبح وشام کچھ دیر کے لئے جانور کی پشت سے اتر کر پیادہ بھی چلے، یہی سلفِ صالح کی سنت ہے اس میں جانور بھی کچھ آرام حاصل کرلے گا اور اپنے بھی ہاتھ پاؤں کھل جائیں گے۔

مسئلہ۔ ضروری ہے کہ جس کا جانور کرایہ کیا جائے اس کو ٹھیک ٹھیک بتلا دیا جائے کہ فلاں فلاں سامان اس پر لادوں گا۔

مسئلہ۔ حدیث میں ہے کہ جب کوئی سوار اللہ کے ذکر میں مشغل ہوتا ہے تو فرشتہ اس کے ساتھ ہو جاتا ہے اور اگر فضول اشعار اور گانے میں مشغول ہو جاتا ہے تو شیطان ساتھ میں جاتا ہے۔ (طبرانی فی الاوسط عن عقبة بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز ص ۱۴۱ ج ۳)

جب کسی منزل پر اُترے

تو مستحب ہے کہ دو رکعتیں نفل پڑھے اور یہ دعا پڑھے اَعُوذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ

التَّامَاتِ مِنْ شَرِّمَا خلق۔ جب رات ہوجائے تو یہ دعاء پڑھے۔
یَا اَرْضِ رَبِّی وَرَبُّكِ اللّٰہِ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِكَ وَشَرِّمَا خلق نِیْكِ وَشَرِّ مَادَبَّ عَلَیْكِ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ کُلِّ اَسَدٍ وَاَسْوَدَ وَحَیَّةٍ وَعَقْرَبَ وَمِنْ شِرِسَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ شَرِّ مَا وَالِدِمَا وَلَدَ۔ (زاد المعاد عن مسند احمد)

اور جب صبح ہوجائے تو یہ دعاء پڑھے۔ سَمِعَ سَامِعٌ بحمدالله وَنعمتهٖ وحسن بلائه علینا ربّنا صاحِبنا و افضل علینا عائذٌ ابالله من النار اس کو تین مرتبہ بلند آواز سے کہے۔

(زادالمعاد)

جب دُور سے کسی بستی کو دیکھے جہاں جانیکا ارادہ ہے

تو یہ دعا پڑھے۔
اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْاَرْضِیْنَ السَّبْعِ وَمَا اَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّیَاطِیْنِ وَمَا اَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّیَاحِ وَمَا ذَرَیْنَ اِنَّا نَسْئَالُكَ خَیْرَ ھٰذِہِ الْقَرْیَةِ وَخَیْرَ اَھْلِھَا وَخَیْرَمَا فِیْھَا وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّمَا فِیْھَا (زدالمعاد)

ترجمہ: یا اللہ پروردگار سات آسمانوں اور ان تمام چیزوں کے جو آسمان کے نیچے ہیں اور رب سات زمینوں کے اور ان تمام چیزوں کے جو زمین کے اُوپر ہیں اور رب شیاطین کے اور ان لوگوں کے جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہے اور رب ہواؤں کے اور اس چیز کے جس کو ہواؤں نے اڑایا ہے ہم تجھ سے اس بستی کی اور اُس کے رہنے والوں کی اور اُن چیزوں کی جو اس میں ہیں خیر اور بھلائی طلب کرتے ہیں اور اس کے شر سے اور ان چیزوں کے شر سے جو اس میں ہے پناہ مانگتے ہیں۔

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں۔
اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنا جَنَا ھا وَجَبِّبْنَا اِلیٰ اَھلِھَا وَجَبِّبْ صَالِحِی اَھْلِھَا اِلَیْنَا۔

ترجمہ: یا اللہ ہمیں اس بستی کے فوائد سے متمتع فرما اور ہمیں اس کے باشنوں کے قلوب میں محبوب بنا دے اور اس کے نیک باشندوں کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔

جب اُس بستی میں داخل ہو تو حسبِ گنجائش اچھا لباس پہنے، حدیث میں اس کا ارشاد وارد ہے۔ (کنز ص ۱۴۱ ج ۳ رواہ فی مسند احمد والحاکم وابوداؤد)

سفر سے واپسی

نبی کریم ﷺ مسافروں کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ جب سفر میں اپنی حاجت سے فارغ ہو جاؤ تو پھر دیر نہ لگاؤ فوراً وطن واپس آ جاؤ۔ (رواہ احمد وابن ماجہ از کنز ص ۱۴۱ ج ۳)

❷ مستحب ہے کہ جب سفر سے لوٹے تو اپنے اہل وعیال اور دوستوں کے لئے کوئی تحفہ کھانے پینے وغیرہ سے اپنی گنجائش کے موافق ساتھ لیتا آئے۔ حدیث میں اس کی یہاں تک تاکید آئی ہے کہ اگر اور کچھ نہ ملے تو اپنی جھولی میں کوئی ڈھیلا ہی ڈال کر لے آئی) رواہ الدار قطنی والبیہقی من حدیث عائشہؓ ابن عساکر عن ابی الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنز العمال ج ۲ ص ۳۲، اور بعض روایات میں ہے کہ اگر لکڑیوں کا گٹھا ہی لے آئے۔ تاکہ گھر والے خوش ہوں)۔ (کنز العمال ص ۲۴۰ وا)۔ ڈھیلا پتھر اُٹھالانے سے یا تو غرض محض تاکیدی مبالغہ ہے اور یا یہ کہ وہ ڈھیلا پتھر وغیرہ جس سے گھر والوں کو کچھ نفع ہو۔

❸ واپسی میں بھی جب کسی بلندی پر چڑھے تو تین مرتبہ تکبیر کہے پھر یہ دعا پڑھے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ ط آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْن لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (زاد تخریج الاحیاء)

ترجمہ: کوئی معبود نہیں مگر ایک اللہ اُس کا کوئی شریک نہیں اُسی کا ملک ہے اور اُسی کی حمد ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم لوٹنے والے ہیں اور توبہ کرنے والے اور اپنے رب کی عبادت کرنے والے اور حمد کرنے والے اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ جر مایا اور اپنے بندہ (نبی کریم ﷺ) کی مدد فرمائی اور احزاب کفار کو تنہا شکست دی۔

اور جب اپنی بستی پر نظر پڑے تو یہ دعا پڑھے۔

اللّٰھم اجعل لنا بھا قرارًا ورزقًا حسنا (احیاء)

ترجمہ: یا اللہ ہمارا یہاں قرار بنادے اور عمدہ رزق عطا فرما۔

مسئلہ۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اس سے منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص سفر طویل سے واپس آکر اچانک رات کو اپنے گھر پہنچ جائے (رواہ السنۃ عن جابر بالفاظ مختلف کنز ص ۳۴۰ ج ۳) لیکن اگر پہلے سے اپنے پہنچنے کے اطلاع دے چکا ہے یا سفر مختصر تھا تو رات ہی کو گھر پہنچ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ خود بعض الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح اگر کوئی خاص ضرورت رات ہی میں پہنچنے کی ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ۔ جب اپنی بستی میں داخل ہو تو مسجد میں جائے اور دو رکعتیں نماز پڑھے کہ یہی سنت ہے نبی کریم ﷺ کی۔

اور جب گھر میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے۔

توبًا توبًا لربنا اوبًا لا یغادر علینا حوبًا (ابن السنی عمل الیوم واللیلۃ)

ترجمہ: ہم توبہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں اور اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ہم پر کوئی گناہ نہ چھوڑے گا۔

مسئلہ۔ سفر سے واپس آنے والوں کے ساتھ معانقہ اور مصافحہ کرنا سنت ہے۔

قرآن مجید سورۂ نساء میں حق تعالیٰ نے جہاں اپنا حقِ عبادت انسان پر لازم فرمایا ہے وہیں والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور یتیموں مسکینوں کے ساتھ اور نزدیک و دور کے پڑوسیوں کے ساتھ اِحسان اور حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اسی کے

ساتھ و الصاحب بالجنب فرما کر اس شخص کو بھی شامل کیا ہے جو ریل یا جہاز یا اور کسی مجلس میں آپ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس لئے مسافر پر ضروری ہے کہ ہمسفر رفیقوں کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کا معاملہ کرے۔ کم از کم ان کو تکلیف پہنچانے سے پورا احتراز کرے۔

مسئلہ۔ ریل یا جہاز میں یا ریلوے پلیٹ فارم پر یا ویٹنگ روم میں جہاں سب مسافروں کا حق برابر ہے اُس میں کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسرے مسافروں کو تکلیف ہو جائز نہیں۔ مثلاً گندگی پھیلانا، پھل وغیرہ کھا کر چھلکے بکھیر دینا، پان کی پیک یا سگریٹ کا دھواں اس طرح چھوڑنا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو، سخت گناہ ہے۔ حدیث میں ایسے کام کرنے والے پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں۔

مسئلہ۔ ریل کی کھڑکیوں سے پان کی پیک یا پانی وغیرہ اس طرح ڈالنا جس سے پچھلی کھڑکیوں میں بیٹھنے والوں پر چھینٹا پڑ جائے۔ یہ سب اُسی ایذاء رسانی میں داخل اور حرام ہیں۔

مسئلہ۔ ریل اور جہاز کے غسل خانوں کو گندا کر دینا جس سے بعد میں آنے والے کو نفرت ہو یہ بھی اُسی درجہ کا گناہ ہے۔

مسئلہ۔ اونٹ گھوڑے وغیرہ کی سواری پر نماز فرض بلا عذر جائز نہیں۔ لیکن اگر اونٹ سے اترنے پھر چڑھنے پر قدرت نہ ہو یا قافلہ چلے جانے کا خطرہ ہو تو شعذف میں ہی نماز پڑھ لینا جائز ہے۔ (امدادی الفتاویٰ ج/ ص ۳۵)

مسئلہ۔ ریل گاڑی کھڑی ہو یا چل رہی ہو۔ اس میں نماز جائز ہے[1]۔

[1] (امدادی الفتاویٰ ص ۳۵۱ ج ۱)۔

ریل میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

ریل میں بلا عذر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ قیام فرض سے بلا عذر شرعی

کے بیٹھ کر پڑھنے سے نماز فرض ادا نہ ہوگی۔ (شرح منیہ وامداد الفتاویٰ ص ۳۵۱ ج ۱)

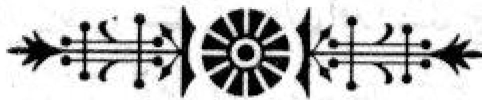
مسئلہ۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی مرض یا کمزوری کے سبب ریل کی حرکت میں کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا، گر جانے کا خطرہ ہے اس کے لئے بیٹھ کر نماز جائز ہے جیسے زمین پر نماز پڑھنے کا حکم ہے کہ جو قیام پر قدرت نہیں رکھتا بیٹھ پڑھے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ عام حالات میں۔۔۔لوگ ناواقفیت سے بلا وجہ بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں ان کی نماز ادا نہیں ہوتی، اعادہ واجب ہے۔

مسئلہ۔ اگر کھڑے ہونے پر قدرت تو ہے مگر ریل میں اتنی جگہ نہیں کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکے تو مناسب یہ ہے کہ اس وقت تو بیٹھ کر نماز ادا کرلے مگر بعد میں اس کو قضاء کرنا پڑے گا۔ کیونکہ تنگئ جگہ کی وجہ سے۔۔۔قیام ساقط نہیں ہوتا۔ (بحرالرائق)

ریل میں جانبِ قبلہ کا استقبال

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ریل میں استقبال قبلہ شرط نہیں۔ جس طرف کو چاہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے، عام حالات کی طرح ریل میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔

مسئلہ۔ اگر درمیان میں نماز کے ریل کا رُخ بدل جانے کا علم ہو جائے تو نمازی کو چاہیئے کہ اسی حالت میں اپنا رُخ قبلہ کی طرف پھیر لے۔



از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

احکامِ سفر

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مسافرِ شرعی کی تعریف

سفرِ شرعی جس کے لئے احکام مخصوص ہیں تین شرطوں پر موقوف ہے۔ اول یہ کہ سفر کم از کم اتنی دور کا ہو جس کو پیادہ چلنے والے بسہولت تین دن میں قطع کر سکیں، خواہ ریل وغیرہ کے ذریعہ ایک دو گھنٹہ ہی میں قطع ہو سکتا ہو جس کی مقدار آج کل تقریباً اڑتالیس میل ہے مگر پہاڑ اور دریا میں یہ تعداد معتبر نہ ہوگی بلکہ تجربہ سے جو مقدار تین روز کی مسافت ثابت ہو وہی ٹھیک سمجھی جاوے گی۔

فَائِدَہ: میلوں کی تعداد اکثر ریلوے ٹکٹ پر لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس سے معلوم کر لیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ابتداء سفر ہی سے اتنی دور جانے کا قصد ہو۔ اور اگر ابتداً دس، بیس میل کے سفر کا قصد کر کے گھر سے نکلا اور وہاں پہنچ کر پھر آگے جانے کی ضرورت پیش آگئی اور یہاں سے تیس میل اور آگے چلا گیا اور وہاں پہنچ کر پھر آگے جانے کی ضرورت ہوئی تو یہ شخص اس وقت تک شرعی مسافر نہ کہلائے گا جب تک کہ ایک دفعہ اڑتالیس میل کا قصد نہ کرے۔ خواہ ساری عمر پھرتا رہے اور ساری دنیا میں پھر آئے۔ (شامی) تیسری شرط یہ ہے کہ سفر کا قصد کر کے اپنی جائے اقامت کی آبادی سے باہر نکل جائے۔ محض قصد کر لینے سے مسافر نہ ہوگا۔ اپنی بستی

سے باہر نکلتے ہی اس پر مسافر کے احکام جاری ہو جائیں گے اگر چہ اپنی بستی کے باغات یا ریلوے اسٹیشن کے حدود میں ہو۔ جبکہ آبادی سے باہر ہو۔ ورنہ اگر اسٹیشن آبادی کے اندر یا اس سے ملا ہوا ہے تو اسٹیشن پر وہ مسافر شرعی نہ ہوگا۔

سفرِ شرعی کے مخصوص احکام

جو شخص تین منزل یا زائد کے سفر کا قصد کر کے اپنی بستی سے نکل گیا وہ شرعاً مسافر ہے اس پر واجب ہے کہ ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں بجائے چار چار رکعتوں کے صرف دو دو پڑھے اور اگر قصداً چار رکعتیں پڑھے گا تو اگر درمیانی قعدہ میں بیٹھا ہے اور آخر میں سجدہ سہو کر لیا ہے تو نماز ادا ہو جائے گی مگر گنہگار ہوگا، اور اگر پہلے قعدہ میں نہیں بیٹھا تو نماز ہی نہ ہوگی (شامی، بدائع) نبی کریم ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہی عادت تھی کہ سفر میں چار رکعت والی نماز کو قصر کر کے دو پڑھتے تھے)۔ کما رواہ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بدائع ۹۲ ج ا) وروی ابن جریر عن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مثلہ وصححہ کذا فی الکنز ص ۲۴۵ ج ۳)

مسئلہ: اگر ایک شخص کسی نماز کے ابتدائی وقت میں مقیم تھا اور نماز پڑھنے سے پہلے سفر شروع کر دیا۔ تو یہ نماز بھی مسافرانہ نماز پڑھے گا اسی طرح اگر ابتداء وقت میں مسافر تھا اور نماز پڑھنے سے پہلے مقیم ہو گیا تو یہ نماز بھی مقیم کی طرح پوری پڑھے گا۔ (بدائع ص ۹۵ ج ا)

مسئلہ: مسافر کو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر بھی مسافرانہ نماز پڑھنی چاہیئے۔ جانے کے وقت بھی اور لوٹنے کے وقت بھی بشرطیکہ اسٹیشن شہر کے اندر نہ ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سے مروی ہے کہ آپ بصرہ سے واپس اپنے وطن کوفہ میں تشریف لائے اور اتنے قریب ہو گئے کہ کوفہ کے مکانات نظر آتے تھے۔ لیکن آپ نے نماز قصر ہی پڑھی۔ (بدائع)

مسئلہ۔ مسافر اگر کسی مقام پر اطمینان سے ٹھہرا ہوا ہے تو سنن مؤکدہ سب پڑھنی چاہیئے۔ اور اگر چلنے کی عجلت ہے یا ریل چھوٹنے والی ہے یا کوئی اور بے اطمینانی ہے تو سنتوں کا ترک کر دینا ہی اولیٰ ہے۔ (شامی باب صلوٰۃ المسافر) بعض لوگ اس میں سخت غفلت کرتے ہیں اور خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور ساتھیوں کو بھی پریشان کرتے ہیں۔

مسئلہ: مقیم کی نماز مسافر کی امامت میں اور مسافر کی نماز مقیم کی امامت میں جائز ہے لیکن جب مسافر امام ہو تو نماز سے پہلے مقتدیوں کو اطلاع کر دے کہ میں مسافر ہوں دو رکعتیں پڑھوں گا تم اپنی نماز پوری کر لینا اور بعد سلام کے بھی یہ اعلان کر دے اور خود اپنے دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر لے اور جو مقتدی مقیم ہیں وہ اپنی باقی دو رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ قیام میں سورہ فاتحہ نہ پڑھیں بلکہ اتنی دیر خاموش کھڑے رہیں جتنی دیر میں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ (شامی)

مسئلہ: مسافر شرعی کو اختیار ہے کہ رمضان المبارک کے روزے سفر میں رکھے یا افطار کرے مگر درصورت افطار بعد واپسی کے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی بشرطیکہ بعد واپسی کے اتنی مہلت ملے کہ قضا کر سکے۔

مسئلہ: اگر سفر سے واپسی کے بعد روزے قضا کرنے کی مہلت نہ ملی۔ اسی حالت میں انتقال ہو گیا تو یہ روزے معاف ہیں۔

مسئلہ: اگر سفر میں روزہ رکھنے سے ضعف و مشقت میں پڑ جانے کا خوف ہو تو افطار کرنا افضل ہے اور اگر یہ خوف نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ (بدائع فصل الصوم ص ۹۶ ج ۲)

مسافر کا مقیم ہونا

مسافر چار چیزوں سے مقیم ہوجاتاھے

اول: کسی ایک قابل اقامت جگہ شہر یا گاؤں میں پندرہ دن ٹھہرنے کی خود نیت کر لینا۔

دوسرے: بطریق تبعیت نیت اقامت ہوجانا یعنی ایسے شخص کا نیت اقامت کرلینا جس کا اتباع سفر واقامت میں اس کے لئے ضروری ہو جیسے کوئی غلام آقا کے ساتھ ہو یا عورت اپنے خاوند کے ساتھ ہو یا لشکر اپنے امیر کے ساتھ۔

تیسرے: اپنے وطن اصلی میں داخل ہوجانا۔

چوتھے: ایسی جگہ سے واپسی کا ارادہ کرلینا جو اس کے وطن سے مسافت قصر ۴۸ میل سے کم ہو، ان چاروں نمبروں کی تشریح ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

شرح نمبر اول

نمبر اول چار جزو سے مرکب ہے۔ اول نیت اقامت اس کے بغیر کوئی شخص مقیم نہ کہلائے گا اگر چہ ساری عمر ایک جگہ گذار دے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی شہر میں پہنچا اور روزانہ یہاں سے چلنے کا قصد کرتا رہا مگر اتفاقاً یہ قصد پورا نہ ہوا اور اسی طرح مہینے گزر گئے تو یہ شخص مقیم نہ ہوگا۔ بلکہ نماز مسافر ادا کرتا رہے گا۔ (بدائع) دوسرا جزو مدت اقامت ہے جس کی مقدار پندرہ دن ہے۔ اگر اس کے کم ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ مقیم نہ کہلائے گا۔ تیسرا جزو یہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت ہو۔ اور اگر مختلف بستیوں میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کی تو قابل اعتبار نہیں۔ اور شخص بدستور مسافر رہے گا۔

(نوٹ) ایک شہر کے مختلف محلے مختلف بستیوں کے حکم میں نہ ہوں گے۔ بلکہ ایک ہی جگہ سمجھی جاوے گی۔ اور مختلف محلوں میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرنے والا مقیم سمجھا جاوے گا۔ لیکن آس پاس کے گاؤں اور جداگانہ بستیاں جن کے نام اور احکام اور تمام کاروبار جدا ہوں، ایک جگہ متصوّر نہ ہوں گے، جن شہروں میں شہر اور چھاؤنی کی بستیاں اور بازار اور اسٹیشن وغیرہ بالکل جدا ہیں وہ بھی مختلف شہر شمار کئے جاویں گے۔ چوتھا جزو یہ ہے کہ جس مقام میں اقامت کی نیت کی ہے

وہ اس قابل ہو کہ اس میں عادتاً وعموماً انسان ٹھہر سکتے ہوں، جیسے شہر اور گاؤں وغیرہ اور اگر کسی جنگل غیر آباد میں یا کسی کشتی یا جہاز میں پندرہ روز ٹھہرے رہنے کی نیت کر لی تو اس سے مقیم نہ ہوگا۔

مسئلہ۔ جو لوگ خانہ بدوش ہیں اور ہمیشہ جنگلوں میں خیمے ڈال کر رہتے ہیں ان کے لئے خیمے بھی جائے اقامت سمجھے جائیں گے اور اسی لئے ان لوگوں کو ہمیشہ نماز پوری چار رکعت پڑھنی چاہیئے۔ کیونکہ عادتاً یہ دوسری بستی کی طرف منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ البتہ اگر ایسا کریں کہ اڑتالیس میل کے سفر کا دفعتہً ارادہ کر کے نکلیں تو مسافر سمجھے جائیں گے۔ (ہذا صحیح کما فی البدائع ص ۱۰۱ ج ۱)

شرح نمبر دوم

جو شخص سفر میں کسی دوسرے کا تابع ہو تو اقامت میں بھی اس کی نیت معتبر ہوگی۔ مثلاً غلام اپنے آقا کے ساتھ، یا عورت اپنے خاوند کے ساتھ، یا لشکر اپنے امیر کے ساتھ یا اہلکار اپنے حاکم کے ساتھ دورہ میں ہوں تو ان سب صورتوں میں آقا اور خاوند اور امیر اور حاکم کی نیت معتبر ہوگی اگر وہ پندرہ دن کسی ایک جگہ ٹھہرنے کی نیت کر لیں گے جو لوگ ان کے تابع ہیں وہ بھی مقیم ہو جائیں گے۔ اگرچہ وہ خود نیت اقامت نہ کریں۔

مسئلہ۔ مگر یہ لوگ تبعاً مقیم اس وقت سمجھے جائیں گے جس وقت ان کو اپنے امیر وآقا کے نیت اقامت کا علم ہو جائے اور علم سے پہلے اگر انہوں نے نماز مسافرانہ طور پر قصر کے کے پڑھ لی تو جائز ہوگی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں (ہوا صحیح کما فی البدائع) شرح نمبر سوم مسافر اپنے وطن اصلی میں داخل ہو جانے سے فوراً مقیم ہو جاتا ہے خواہ ایک ہی منٹ کے لئے داخل ہو۔ اور پھر فوراً واپس چلے جانے کی نیت ہو۔

وطن کی تین قسمیں اور ان کے احکام

وطن کی تین قسمیں ہیں۔ایک وطن اصلی۔دوسرے وطن اقامت۔تیسرے وطن سکنی۔وطن اصلی وہ ہے، جہاں پر آدمی اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہو۔اور اس میں زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

مسئلہ وطن اصلی متعدد بھی ہوسکتے ہیں۔مثلاً ایک شخص کے متعدد اہل وعیال مختلف شہروں میں رہتے ہیں،اور وہیں زندگی گزارنے کا خیال ہے تو یہ تمام شہر اس شخص کے لئے وطن اصلی سمجھے جائیں گے اور یہ شخص جب ان میں سے کسی شہر میں داخل ہوگا تو بلانیت کے محض داخل ہونے سے مقیم ہوجائے گا۔(بدائع)

مسئلہ:اگر کسی شخص کے ماں باپ وخویش واقارب ایک شہر میں رہتے ہیں اور اس کے اہل وعیال دوسرے شہر میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔اور ہیں زندگی گزارنے کا خیال رکھتے ہیں تو اس کا وطن اصلی وہ شہر ہوگا۔جس میں اہل وعیال ہیں۔وطن کی دوسری قسم وطن اقامت ہے۔وطن اقامت اس کو کہتے ہیں جس میں مسافر پندرہ روز یا زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرکے مقیم ہوجائے۔بشرطیکہ یہ جگہ عادتاً عموماً ٹھہرنے کے قابل ہو۔جنگل یا کشتی وغیرہ نہ ہو۔اور تیسری قسم وطن کی وہ ہے جس میں مسافر پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کی نیت کرے۔وطن اصلی کا حکم یہ ہے کہ مسافر اس میں خواہ کسی طرح داخل ہوجائے مقیم سمجھا جائے گا،اقامت کی نیت کرے یا نہ کرے،قصداً داخل ہو یا بلاقصد۔(مسئلہ۔جن شہروں کے اسٹیشن وسط شہر میں واقع ہیں ان شہروں کے باشندے اگر ریل میں بیٹھے ہوئے اس شہر سے گزریں گے۔تو یہاں پہنچتے ہی مقیم ہو جائیں گے۔پھر اگر آگے مسافت وقصر یعنی اڑتالیس ۴۸ میل جانے کا قصد ہے تو اس شہر کی بستی سے نکل کر پھر مسافر ہوجائیں گے اور اگر اس سے کم مسافت کا ارادہ ہے تو بعد میں بھی بدستور مقیم رہیں گے مثلاً ایک دہلی کا رہنے والا بمبئی سے اپنے وطن دہلی کو واپس آتا ہے لیکن کسی ضرورت سے یہ چاہتا ہے کہ اول سیدھا غازی آباد چلا جائے اور

پھر اپنے وطن دہلی کو واپس آتا ہے تو جس وقت ریل گاڑی اسٹیشن دہلی پر پہنچے گی یہ اسی وقت سے مقیم ہو جائے گا۔ غازی آباد کے زمانہ میں بھی اس کو پوری نماز اقامت پڑھنی چاہئے اور اگر بجائے غازی آباد کے اسی طرح مراد آباد کا قصد ہے تو دہلی اسٹیشن کے حدود تک تو یہ مقیم رہے گا۔ اور جب گاڑی یہاں سے نکل جائے گی تو پھر از سرِ نو مسافر ہو جائے گا۔ اسٹیشن دہلی پر اگر نماز پڑھے گا تو چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی۔ اور اسٹیشن گزرنے کے بعد پڑھے گا تو دو رکعت بشرطیکہ وقت نماز باقی ہوگی۔

مسئلہ: اور اگر مثلاً عصر کے وقت دہلی اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تھی۔ اور نماز پڑھنے نہ پایا تھا کہ اسٹیشن پر غروب ہو گیا۔ اب اسٹیشن دہلی گزرنے کے بعد عصر کی قضا نماز پڑھنا چاہتا ہے تو پوری چار رکعتیں پڑھنی ہونگی۔

مسئلہ: اگر سفر کی قضا شدہ نماز کو بعد اقامت کوئی شخص ادا کرنا چاہے تو دو رکعتیں پڑھے گا۔ اس طرح اگر حالت اقامت کی قضا شدہ نمازوں کو سفر میں ادا کرنا چاہے پوری چار رکعتیں ادا کرنی ہونگی۔

مسئلہ۔ وطن اصلی سفر سے باطل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ساری عمر سفر میں رہے پھر بھی جو اس کا وطن اصلی ہے وہ وطن ہی سمجھا جائے گا وہاں ایک گھنٹہ کے لئے بھی آئے گا تو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ (بدائع)

مسئلہ: انسان کا وطن اصلی بدلنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر یا بستی میں مع اہل وعیال کے منتقل ہو جائے اور وہیں عمر گزارنے کی نیت کرلے تو اب یہ وطن اصلی بن گیا۔ اور جس جگہ کو چھوڑ دیا ہے وہ وطن نہیں رہا جب وہاں پہنچے تو نماز قصر ادا کرنی ہوگی۔ (بدائع) اور جب تک پہلے وطن کو چھوڑنے اور دوسری جگہ کو وطن بنانے کی نیت نہ کرے پہلا وطن ہی وطن اصلی رہیگا۔ (درمختار)

مسئلہ: یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ایک شخص کے دو یا زائد مقام بھی وطن اصلی ہو سکتے ہیں۔ جب کہ دونوں جگہ اس کے اہل وعیال ہوں اور دونوں جگہ

اہل وعیال کی نیت عمر گزارنے کی ہو۔

وطن اقامت: جس میں پندرہ روز یا اس سے زیادہ قیام کی نیت کی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہاں مقیم رہے نماز پوری مثل مقیم کے ادا کرے۔ اور جب یہاں سے سفر شرعی یعنی اڑتالیس ۴۸ میل کے سفر کے نیت کر کے نکلے تو سفر شروع ہوتے ہی مسافرانہ نماز ادا کرے (درمختار) پھر اگر کبھی اس وطن اقامت میں داخل ہو تو جب تک یہاں پندرہ دن یا اس سے زائد قیام کی دوبارہ نیت نہ کرے، اسوقت تک مسافر ہی رہے گا۔ مسافرانہ نماز پڑھنا چاہیئے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وطن اقامت میں خواہ کتنا ہی طویل زمانہ گزرا ہو۔ جب یہاں سے سفر کرے گا یہ وطن باطل ہو جائے گا۔

وطن سکنیٰ: جس میں پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کی نیت کی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں قیام کے باوجود انسان مسافر کے حکم میں رہے گا نماز قصر ادا کرے گا۔ جب تک بیک وقت پندرہ روز کے قیام کی نیت کر کے اس کو وطن اقامت نہ بنائے اس وقت تک نماز قصر ہی ادا کرنا ہوگی۔

مسئلہ: اگر اول دس دن کے قیام کی نیت کی پھر چھ دن گزرنے کے بعد پانچ دن کی اور نیت کرلی اور اسی طرح دو دو چار چار دن کی نیت بڑھاتا رہا مگر پورے پندرہ دن کی نیت بیک وقت نہ ہوئی تو نماز مسافرانہ ہی ادا کرنا ہوگی اگرچہ ساری عمر اسی طرح گزار دے (بدائع) خلاصہ یہ ہے کہ وطن سکنیٰ شرعی اعتبار سے کوئی وطن نہیں۔

بحری سفر کے احکام

دریا میں بذریعہ جہاز یا کشتی جو سفر کیا جائے اس کے بھی عام احکام وہی ہیں جو خشکی میں سفر کے ہیں، چند احکام کا فرق ہے ان کو بیان کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: خشکی میں تین دن کا سفر شرعی اعتبار سے اڑتالیس میل کا سفر سمجھا جاتا

ہے۔ لیکن دریا اور پہاڑ کے سفر میں یہ مسافت معتبر نہیں بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ متوسط درجہ کی کشتی تین دن میں کتنی مسافت طے کرتی ہے وہی مسافتِ قصر ہوگی، اگرچہ بڑا دخانی جہاز اس کو ایک ہی گھنٹہ میں طے کرتی۔ اسی طرح پہاڑ کی چڑھائی میں متوسط طاقت والا آدمی تین دن میں جتنی مسافت طے کرسکتا ہے وہ ہی مسافت سفر شرعی ہوگی اور نماز کا قصر اس پر لازم ہوگا۔ اگرچہ ہوائی جہاز یا کسی دوسری سواری میں وہ ایک گھنٹہ میں طے ہوسکے۔

مسئلہ: دریا کے سفر میں کشتی یا جہاز پر امام اعظم کے نزدیک بغیر عذر کے بھی نماز فرض بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے لیکن کھڑے ہوکر پڑھنا سب کے نزدیک افضل ہے۔ (شرح منیہ ص ۲۷۰) ریل کو اس پر قیاس کرنا جائز نہیں۔ ریل میں بغیر عذر شرعی کے بیٹھ کر نماز پڑھ لی تو اعادہ لازم ہوگا۔ اور اگر کشتی یا جہاز لنگر ڈالے ہوئے کھڑا ہے تو اس میں بلا عذر کے بیٹھ کر نماز جائز نہیں۔

مسئلہ: جیسے ریل کی سواری میں بوقت نماز قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے اسی طرح کشتی اور جہاز میں بھی استقبال قبلہ فرض ہے۔ قبلہ کی شناخت دریا میں چاند سورج اور دوسرے ستاروں سے بھی ہوسکتی ہے اور قطب نما سے بھی۔

مسئلہ۔ جس شخص کو جہاز یا کشتی میں متلی اور چکّر آتے ہوں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی قدرت نہ رہے وہ لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے۔

ہوائی سفر کے احکام

ہوائی سفر کے بھی عام احکام وہ ہی ہیں جو زمین پر سفر کے ہیں۔ البتہ ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ جب تک ہوائی جہاز زمین پر کھڑا ہے یا زمین پر چل رہا ہے اس وقت تک تو وہ ریل کے حکم میں ہے اس پر نماز باتفاق جائز ہے۔

لیکن جب وہ پرواز کررہا ہو تو اس حالت میں بھی عذر کی وجہ سے نماز جائز ہے

ورنہ قواعد فقہیہ کی رو سے اس میں نماز جائز نہ ہونی چاہیئے مگر یہ عذر ایسا ہے جو ہوائی جہاز کے سفر کے لئے تقریباً لازمی ہے کیونکہ نہ ہوائی جہاز کو ہر جگہ اتارا جا سکتا ہے اور نہ اس کا اتارنا ہر مسافر کے اختیار میں ہے اور بغیر جہاز کو زمین پر اتارے ہوئے خود اُترنے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اگر یہ اندیشہ ہو کہ جہاز کے منزل پر پہنچنے تک نماز کا وقت ختم ہو جائے گا تو نماز ہوائی جہاز میں جائز ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق مع دلائل کے امداد الفتاویٰ مبوب جلد اول ص ۳۶۵ تا ص ۳۶۸ میں مذکور[1] ہے۔

مسئلہ: اگر کھڑے ہو کر ہوائی جہاز میں نماز پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر ادا کرے ورنہ بیٹھ کر پڑھے۔

مسئلہ: ہوائی جہاز میں اکثر تو وضو کے لئے پانی مل جاتا ہے اور اگر پانی نہ ملے تو تیمّم جائز ہے بشرطیکہ منزل پر اترنے تک نماز کا وقت فوت ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مسئلہ: جس شخص کا ہوائی سفر طویل ہو اور یہ خطرہ ہو کہ بعض اوقات پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کی ضرورت پڑے گی اس کو چاہیئے کہ کوئی مٹی کا برتن ساتھ رکھ لے اس پر تیمم ہو سکتا ہے یا کپڑے کے تھیلہ میں مٹی بھی کر ساتھ رکھ لے، تھیلہ کے اوپر تیمّم ہو جائے گا جب کہ مٹی کی گرد کپڑے کے اوپر تک پہنچی ہوئی ہو۔

مسئلہ: جس طرح ریل اور بحری جہاز کے سفر میں استقبالِ قبلہ، نماز کے لئے ضروری ہے اسی طرح ہوائی جہاز میں بھی ضروری ہے اگر قبلہ کا رخ کا پتہ نہ چلے اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو اندازہ اور اٹکل سے کام لے کر رُخ سیدھا کرے جس طرف اس کا اندازہ قائم ہو جائے تو وہ ہی اس کے لئے سمت قبلہ ہے اگر بعد میں بالغرض اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہو گئی، لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۱ صفر ۱۳۷۷ھ

[1] یہ کتاب اور ہر قسم کی مذہبی کتابوں کا مرکز دار الاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مواقیتِ احرام کا مسئلہ

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے تمام عالم میں سے بیت اللہ کی زمین عزت وشرف کے لئے مخصوص فرما کر اس پر اپنا بیت بنایا جو دنیا میں سب سے زیادہ معظم ومکرم ہے، اس کی تعظیم وشرف کے اظہار کے لئے اس کے گرد یکے بعد دیگرے کئی حلقے قائم فرمائے اور ہر ایک حلقے کی ساتھ کچھ آداب واحکام مخصوص فرمائے۔

سب سے پہلا اور بیت اللہ سے متصل حلقہ مسجد حرام کا ہے جس کے اندر بیت اللہ واقع ہے، اس کے خاص آداب واحکام ہیں، جن میں کچھ تو وہ ہیں جن میں دنیا کی دوسری مساجد بھی شریک ہیں، اور کچھ اس مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً اس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف مسجد کے اندر ہوتا ہے اور مسجد حرام سے باہر کوئی سات چکر لگائے، طواف ادا نہیں ہوگا (غنیۃ الناسک)

دوسرا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع شہر مکہ مکرمہ کا ہے، اس کے بھی خاص آداب واحکام اور پابندیاں ہیں مثلاً یہ کہ پورا شہر بھی میں مسجد حرام کی طرح عام پناہ گاہ ہے۔ اس میں کسی مجرم کو بھی جو حرم سے باہر جرم کر کے حرم میں داخل ہو گیا وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے نکلے، نکلنے کے بعد سزا دی جائیگی، اس

میں کسی جانور کا شکار جائز نہیں۔ اس کے درختوں کا اور عام گھاس کا کاٹنا بھی جائز نہیں، مگر اس کی پابندیاں پہلے حلقے یعنی مسجد حرام سے کم ہیں۔

تیسرا بڑا حلقہ حرم کا ہے جو پہلے دونوں حلقوں پر مشتمل ہے، حرم شریف کے حدود مکہ کے چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے سے معیّن ومحدود ہیں۔

جدّہ کی طرف سے جانے والوں کے لئے حد حرم حدیبیہ [1] کے قریب ہے جہاں دو ستون علامت حرم کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں، اس تیسرے حلقے کے احکام وآداب اور شرعی پابندیاں بھی تقریباً وہی ہیں جو دوسرے حلقے کی بیان ہو چکی ہیں البتہ شرف مکانی کے درجات بیت اللہ کے قرب وبعد کے اعتبار سے متفاوت ہوں گے۔

حدود حرم مکہ مکرمہ کے چاروں طرف متعین ہیں کسی طرف کم اور کسی طرف زیادہ سب سے قریب حد حرم تنعیم ہے جو مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور سب سے بعید نو میل پر ہے۔

چوتھا حلقہ ان سب سے وسیع تر ہے جس میں یہ پہلے تینوں حلقے سمائے ہوئے ہیں، وہ حدود مواقیت ہیں، مواقیت میقات کی جمع ہے۔ حرم محترم کے تمام اطراف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مقامات متعین فرما دیئے ہیں، جہاں سے مکہ مکرمہ میں آنے والے پر لازم کیا گیا ہے کہ بغیر احرام کے آگے نہ بڑھے احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک کو میقات کہتے ہیں اور پورے حلقۂ مواقیت کو فقہاء کی اصطلاح میں حِل کہا جاتا ہے۔ اس حلقے سے باہر تمام کو آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حل صغیر کے بھی کچھ خاص آداب واحکام ہیں، مگر پہلے تینوں حلقوں سے کم ہیں، اس حلقے کی پابندی صرف اس قدر ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل

[1] آجکل اس جگہ کو شمیسیہ کہتے ہیں۔۱۲

ہونے والا اس حلقے میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہوسکتا ہے، اگر کوئی بغیر احرام کے داخل ہوجائے تو اس پر دم یعنی قربانی واجب ہوجاتی ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی، اس مقالہ میں زیر بحث یہی چوتھا حلقہ ہے۔

اس کے احکام کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے کچھ اصطلاحی الفاظ کی تشریح بیان کردینا ضروری ہے۔

اصطلاحی الفاظ کی تشریح

پہلے حلقہ کا اصطلاحی نام مسجد حرام ہے، دوسرے کو مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے، تیسرے کا اصطلاحی نام حرم ہے، چوتھا حلقہ حدود حرم سے باہر مگر حدود مواقیت کے اندر ہے، اس کا اصطلاحی نام حلّ ہے یعنی اس میں شکار وغیرہ حلال ہے۔ حدود مواقیت سے باہر سارا عالم آفاق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ حرم کی پابندیٔ شکار وغیرہ کی جیسے حل میں نہیں ہے ایسے ہی حل سے باہر آفاق میں بھی نہیں، اس لئے حل کے مفہوم میں آفاق بھی داخل ہے۔ اسی لئے بعض علماء حلقہ مواقیت کے اندر حرم سے باہر کے حل کو حل صغیر کہتے ہیں اور حدود مواقیت سے باہر آفاق کو حلّ کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مواقیتِ حج کی تعیین

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ حدیث منقول ہے۔

وقت رسول الله صلى الله عليه وسلم لاهل المدينة ذاالحليفة ولاهل الشام الجحفة ولاهل نجدقرن المنازل ولأهل اليمن يلملم.

(بخاری کتاب الحج)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ اور اہل شام کے

لئے جحفہ اور اہل نجد کے لئے قرن المنازل اور اہل یمن کے لئے یلملم میقات مقرر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار میقات متعین فرمائے، ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل اور یلملم، ان مواقیت کی تفصیلی تحقیق آگے آجائے گی۔

اور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ بھی منقول ہے کہ جب فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں عراق فتح ہونے کے بعد اس کے دوشہر، بصرہ اور کوفہ بسائے گئے تو اہل عراق حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لئے میقات قرن المنازل کو مقرر فرمایا ہے اور وہ ہمارے راستہ سے بہت دور ہے، اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو ہماری مسافت اور مشقت بہت بڑھ جاتی ہے، اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا۔

فانظروا احذوها من طریقکم فحدّلهم ذات عرق. (صحیح البخاری کتاب الحج)

ترجمہ: اپنے راستہ سے اس کی محاذات دیکھ لو، چنانچہ (اس طریقہ سے) فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان لوگوں کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ پانچواں میقات ذات عرق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقرر نہیں فرمایا تھا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اجتہاد سے مقرر فرمایا۔

لیکن صحیح مسلم کی روایت میں شک وتردد کے ساتھ اور نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں بغیر شک کے یہ بھی منقول ہے کہ اہل عراق کے لئے ذات عرق کی تعیین خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، یہ روایتیں قوت وصحت کے اعتبار سے اگرچہ بخاری کی روایت کی ہم پلہ نہیں ہیں، مگر ان کو غیر معتبر بھی نہیں کہا جاسکتا، اسی لئے شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح القدیر میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی بعید نہیں

کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس واقعہ سے پہلے وہ حدیث نہ پہنچی ہو جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذات عرق کو اہل عراق کا میقات مقرر فرمانا مذکور ہے اس لئے انہوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیکر متعین فرمایا اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خصوصی فضائل میں سے ہے کہ ان کا اجتہاد ٹھیک حدیث کے مطابق واقع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل عراق کا میقات ذات عرق قرار پایا خواہ اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہو یا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس، لئے کل مواقیت پانچ ہوگئے، ان پانچوں مواقیت اور ان کے مقامات کی ضروری تشریح یہ ہے۔

مواقیتِ خمسہ کی ضروری تشریح

ذوالحلیفہ اہل مدینہ کا میقات ہے۔ مصر اور شام کے مسافر جو تبوک کے راستہ سے آتے ہیں ان کا میقات بھی یہی ہے، یہ مدینہ طیبہ سے مکّہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔ جس کو آبار علی یا بیر علی بھی کہا جاتا ہے اور آجکل یہی نام مشہور ہوگیا ہے (حاشیۂ ارشاد الساری) اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ تک نو یا دس مرحلے ہیں۔ (البحر الرائق)

اور مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حیات القلوب میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ایک سو اٹھانوے میل بتلایا ہے اس مقام سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد شجرہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہاں ایک درخت تھا اس کے نیچے آپ نے احرام باندھا تھا پھر اس جگہ مسجد بنادی گئی، افضل واولیٰ یہی ہے کہ سنت کے مطابق احرام اسی مسجد سے باندھا جائے، اگرچہ یہ ذوالحلیفہ کے ابتدائی حصّہ کے بعد ہے اور عام مواقیت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ میقات کے ابتدائی

حصہ پر احرام باندھا جائے، تا کہ پوری میقات پر اس کا گزر بحالت احرام ہو جائے' مگر ذوالحلیفہ بوجہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں ابتداء ذوالحلیفہ کے بجائے مسجد شجرہ سے احرام افضل ہے۔

سید نورالدین سمہودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی سے مسجد شجرہ تک ہاتھ سے پیائش کی تو مسجد نبوی کے دروازے باب السلام سے مسجد شجرہ تک انیس ہزار سات سو بتیس (۱۹۷۳۲) ہاتھ پایا، حاشیۂ ارشادالساری میں یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے یہ فاصلہ پانچ میل سے کچھ کم ہوا، کیونکہ میل ہمارے نزدیک چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے اس لوہے کے ذراع سے جو آجکل مستعمل ہے۔ (حاشیہ ارشاد ص ۵۴)

جحفہ یہ رابغ کے قریب ایک گاؤں تھا جس کو مہیعہ بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کے فاصلہ میں شدید اختلاف ہے۔ ارشادالساری میں ملاعلی قاری نے بتیس میل بتلایا ہے' اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بحوالہ علامہ مرشدی بیاسی میل لکھا ہے' اس طرح مراحل کے اعتبار سے فتح الباری شرح البخاری میں بحوالہ شرح مہذبؒ نووی اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تین مرحلے بتلایا اور شیخ عبداللہ بن سالم نے شرح بخاری میں مکہ مکرمہ تک پانچ منزل کا فاصلہ لکھا ہے اور مدینہ منورہ تک سات منزل (حیات القلوب قلمی ص ۲۱) غالباً وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ جحفہ سے مکہ مکرمہ کے لئے راستے مختلف ہیں، کسی راستہ سے مسافت کم ہے، کسی سے زیادہ، یہ گاؤں جحفہ یا مہیعہ عرصہ دراز سے ویران اور بے نشان ہو گیا ہے، اس لئے اس طرف آنے والے رابغ سے احرام باندھتے ہیں کیونکہ رابغ جحفہ سے کچھ پہلے ہے، یہاں سے احرام باندھنے والا گویا اصل میقات سے کچھ پہلے احرام باندھتا ہے جو سب کے نزدیک جائز ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے۔

اور رابغ ساحل سمندر پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والوں کے

راستہ پر مشہور قصبہ ہے اور آجکل تو اچھا شہر بن گیا ہے جس میں مسافروں کے قیام کے لئے بڑے بڑے ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔

قرن المنازل یہ اہل نجد کا میقات ہے جس میں نجد یمن، نجد حجاز ونجد تہامہ شامل ہیں لغت فقہ المغرب میں ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو میدان عرفات کے اوپر ہے اور شرح مصابیح میں ہے، بیضہ کی مانند ایک چکنا صاف اور مدور پہاڑ ہے عرفات کے اوپر آیا ہوا ہے، اہل مکہ اور ان اطراف کے لوگ اس پہاڑ کو کرا بفتح الکاف کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کہ قرن اس پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے متصل وادی کو بھی قرن کہتے ہیں اور اس وادی کے اندر ایک گاؤں جو طائف کے قریب ہے اس کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔ (حاشیۂ ارشاد الساری ص ۵۵)

البحر الرائق میں ہے کہ قرن کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے، اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بھی بحوالہ نہایہ شرح ہدایہ دو مرحلہ کا فاصلہ اور باقانی شرح ملتقی الابحر کے حوالہ سے پچاس میل کا فاصلہ بتلایا ہے۔ (حیات القلوب قلمی ص ۲۱)

یلملم، اہل یمن تہامہ کا میقات ہے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے، اس زمانہ میں اس کو سعدیہ کہا جاتا ہے علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے۔ (حیات القلوب ۲۱)

علامہ عینی نے لکھا ہے۔

قال ابن حزم هو جنوب مكة و منه الىٰ مكة ثلاثو ن ميلا (عمدہ ص ۱۴۰ ج ۵)

ابن حزم کہتے ہیں کہ یلملم مکہ مکرمہ کے جنوب میں ہے اور اس سے مکہ مکرمہ تک تیس میل کا فاصلہ ہے۔

اور شیخ عبدالرحمن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام ونور الظلام ص ۵۷ ج ۱ میں اس کا فاصلہ چالیس میل بتلایا ہے، اور قسطلانی شرح بخاری، فتح القدیر شرح ہدایہ اور معجم

البلدان وغیرہ میں میلوں کا فاصلہ بتلانے کے بجائے مرحلتین یا لیلتین کہا گیا ہے۔

ذات عرق اہل عراق کا میقات ہے، ایک گاؤں کا نام ہے جو عراق کی طرف سے عقیق کے بعد مکہ مکرمہ سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا، آجکل ویران ہو گیا ہے، اسی لئے اب اس کے بجائے عقیق سے احرام باندھا جاتا ہے کیونکہ ذات عرق کا صحیح تعین نہ رہا۔ عقیق سے احرام باندھنے میں اصل میقات سے کچھ پہلے احرام ہو گا اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ عابد مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہدایۃ الناسک میں فرمایا کہ ذات عرق مکہ مکرمہ کے دو مرحلے کے فاصلہ پر طائف کے ایک راستہ سے گاؤں تھا جو اب ویران ہو گیا ہے اس کا محل وقوع اس مقام کے قریب تھا جس کو آجکل سَیل کہا جاتا ہے۔

(حاشیۂ ارشاد الساری ص ۵۵)

قسطلانی نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے بیالیس ۴۲ میل بتلایا ہے، اسی طرح فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس ۴۲ کا فاصلہ لکھا ہے، نووی، ابن حجر مکی نے فرمایا کہ اس کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کا ہے جیسا کہ قرن اور یلملم کا فاصلہ دو مرحلے ہیں (حیات القلوب) ومثلہ فی البحر۔

مواقیت خمسہ کے احکام

جو لوگ آفاق یعنی اطراف عالم سے آنے والے ان میقاتوں کے راستے سے گزرتے ہیں، اگر وہ مکہ مکرمہ میں جانے کے مقصد سے ان مواقیت سے آگے، حلّ صغیر کی طرف جائیں جو مواقیت کے اندر اور حرم سے باہر کے علاقے کا نام ہے تو ان پر لازم ہے کہ ان مقامات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آگے بڑھیں، بغیر احرام کے آگے بڑھنا گناہ ہے اور جو ایسا کرے گا اس کے ذمہ دم (قربانی) دینا واجب ہو گا۔

(ہدایہ، ارشاد الساری)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آفاق یعنی حلِ کبیر سے آنے والا جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے خواہ یہ ارادہ کسی دنیوی غرض تجارت یا عزیزوں سے ملاقات وغیرہ کی نیت سے کیا ہو، مگر بیت اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو اور بیت اللہ کا یہ حق ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص میقات سے آگے مکہ کیطرف بغیر احرام کے نہ بڑھے۔ (ہدایہ)

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ پابندی صرف اس شخص کے لئے ہے جو عبادت حج یا عمرہ کے قصد سے مکہ مکرمہ کا ارادہ کررہا ہے۔ کسی تجارتی غرض یا عزیزوں سے ملاقات یا تفریحی طور سے جانے والے پر احرام باندھ کر جانے اور کم از کم عمرہ ادا کرنے کی پابندی نہیں ہے۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ)

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہے جو آفاق کے کسی علاقے سے آئے مگر کسی میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لئے حل صغیر میں داخل ہوتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جو لوگ پانچ میقاتوں میں سے کسی میقات پر نہیں گزرتے، دوسرے راستوں سے حلّ صغیر پھر حرم میں داخل ہوتے ہیں ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس پابندی ہی سے آزاد ہیں اور بغیر احرام کے حرم میں داخل ہوسکتے ہیں، اور اگر ان پر بھی یہ پابندی ہے تو ان کو کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا، ملا علی قاری نے اپنے شرح مناسک میں اس کے متعلق فرمایا ہے۔

وعين هذه المواقيت ليست بشرط ولهٰذا يصح الاحرام قبلها بل الواجب عينها أو حذوها اى محاذاتها ومقابلتها فمن سلك غير ميقات اى طريقا ليس فيه ميقات معين برا أو بحرا اجتهد واحرم حرم اذا حاذى ميقاتا منها اى من المواقيت المعروفة ومن حذوالا بعداولى فان الافضل ان يحرم من اول الميقات وهو الطرف الأبعد

عن مكة حتّى لا يمرّ بشيءٍ مما يقال ميقاتا غير محرم ولو احرم من الطرف الاقرب إلى مكة جاز باتفاق الاربعة. وإن لم يعلم المحاذات فانهٗ لايتصور عدم المحاذات. فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد السارى ص ٥٦) وقال فى حاشيةٍ قوله كجدة فانها على مرحلتين عرفتيين من مكته وثلاث مراحل شرعيهٍ ووجهه ان المرحلتين اوسط المسافات والا فالأ حتياط الزيادة كذافى شرح نظم الكنز واقول لعل وجههٗ ايضا ان اقرب المواقيت الىٰ مكة على مرحلتين عرفيتين من مكة فقدر بذلك

(الارشاد السارى ص ٥٦)

یہی مضمون دوسری تمام کتب فقہ میں مختصرًا یا مفصلاً مذکور ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ جولوگ کسی میقات معین کے اوپر سے نہیں گزرتے بلکہ درمیانی راستوں میں سے کسی راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہیں، احرام کی پابندی ان پر بھی لازم ہے اور طریقہ ان کے لئے یہ ہے کہ وہ جس راستہ سے حِلّ صغیر کے اندر داخل ہورہے ہیں اس راستہ کا جو حصہ کسی میقات کے محاذات میں ہواسی جگہ سے احرام باندھ لیں۔اگر راستہ ایسا ہے کہ ایک سے زائد میقاتوں کی محاذات راستہ میں آتی ہے تو افضل یہ ہے کہ میقات ابعد کی محاذات سے احرام باندھیں اور اگر اس سے آگے بڑھ کر قریبی میقات کی محاذات سے احرام باندھ لیا تو یہ بھی جائز ہے۔اور اصل بنیاد اس حکم کی صحیح بخاری کی وہ حدیث مذکور ہے جس میں اہل عراق نے یہی سوال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش کیا اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا۔

انظروا حذوها من طريقكم ثم حدّلهم ذات عرق (بخاری)

اپنے راستہ سے ان کی محاذات دیکھو، پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اس

طریقے سے) ان کے لئے ذاتِ عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے راستوں سے گزرنے والوں کے لئے ایک ضابطہ بتادیا کہ ان کا راستہ جو حِل صغیر میں داخل ہونے کا ہے اس راستہ پر جہاں کسی میقات کی محاذات آجائے وہی ان لوگوں کے لئے میقات کے حکم میں ہے۔ یہاں سے مکہ کی طرف آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں۔

پھر اس ضابطہ کی رو سے اہل عراق کے لئے ان کے راستہ کے اس حصّہ کو میقات قرار دیدیا جو قرن المنازل کے محاذات میں ہے یعنی ذات عرق۔

محاذاتِ میقات کس طرح معلوم کی جائے؟

محاذات کے لغوی معنی مسامت کے ہیں جس کی تشریح شیخ ابن حجر ھیثمی مکی نے تحفۃ المحتاج شرح منہاج میں بالفاظ ذیل کی ہے۔

(ومن سلك طريقًا لا ينتهي الى ميقات فان حاذیٰ) بالمعجمة (ميقاتا) ای سامته بان كان علی يمينه اويساره ولا عبرة بما امامه او خلفه (احرم من محاذاته) (تحفۃ علی ہامش الحواشی للشروانیۃ ص ۱۴۱ ج ۴)

ترجمہ: محاذات کا مطلب یہ ہے کہ میقات اس کے دائیں یا بائیں آجائے، سامنے اور پیچھے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

مطلب ظاہر ہے کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ میقات مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے مسافر کی دائیں یا بائیں جانب آجائے۔ اور جب تک میقات اس کے آگے رہے تو محاذات نہیں ہوئی اور جب اس کے پیچھے پڑجائے تو محاذات سے تجاوز ہوگیا، مسائل نماز میں بھی محاذات کا یہی مطلب ہوتا ہے، اس کتاب میں اس کے بعد فرمایا ہے۔

(لم تجز مجاوزته) الی جهة الحرم (بغير احرام) وخرج بقولنا

الی جهة الحرم ما لوجاوزه يمنة اويسرة فله ان يؤخر احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله الماوردى وجزم به غيره وبه يعلم ان الجائ من اليمن فى البحر لهٗ ان يؤخر احرامه الى جدّة لان مسافتها الى مكة كمسافة يلملم انتهىٰ.

عبارات مرقومہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مسافر جب راستہ میں کسی میقات کی محاذات پر پہنچا مگراس کوکسی وجہ سے اس میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانا نہیں ہے بلکہ اس کا راستہ کسی دوسری سمت سے ہے تو اس کے لئے اس محاذات پر احرام باندھنا واجب نہیں ہے بلکہ جس راستہ سے اس کو مکہ مکرمہ کی طرف جانا ہے اس راستہ پر محاذات کو دیکھا جائے گا۔ کیونکہ محاذات میقات سے بغیر احرام تجاوز کرنا جو شرعاً ممنوع ہے اس تجاوز سے مراد تجاوز الی جہت الحرم ہے دوسری کسی سمت میں تجاوز ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ تحفہ کی عبارت مذکورہ سے واضح ہوگیا۔

اور غنیۃ الناسک میں مواقیت کی تعریف ہی اس طرح کی ہے۔

هى المواضع التى لا يجوز ان يتجاوزها الى مكة والحرم ولو لحاجة الامحرماً.

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا احرام تجاوز ممنوع وہ ہے جو تجاوز الی الحرم ہو دوسری کسی جہت کی طرف تجاوز ممنوع نہیں۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس دوسری محاذات میں یہ ضروری ہے کہ اس محاذات سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ کم سے کم اتنا ہی ہو جتنا اصل میقات سے فاصلہ ہے۔ مثلاً کوئی شخص یلملم کی محاذات سے جدہ کی طرف بڑھا اور جدہ کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کو احرام اس جگہ باندھنا چاہئے جہاں سے مکہ

مکرمہ کا فاصلہ یلملم کے فاصلہ کی برابر ہو۔ اور حسب تصریح فقہاء یلملم کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرحلتین کا ہے اور جدہ کا فاصلہ بھی مرحلتین ہے تو دونوں فاصلے مساوی ہونے کی وجہ سے جدہ سے احرام باندھنا جائز ہوگا۔

محاذات کی یہ تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے بھی اقرب ہے اور فقہاء کی تفسیر سے بھی اس کی ترجیح ہوتی ہے۔ صاحب بدائع کی ایک عبارت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، وہ یہ ہے۔

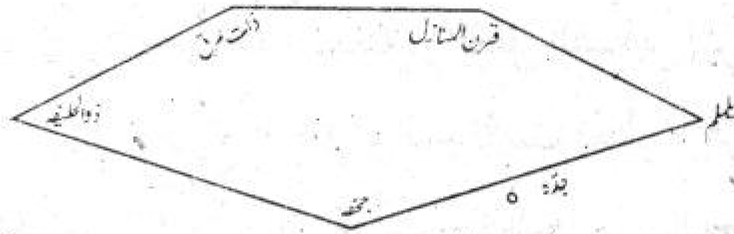
فاما اذا قصدها من طريق غير مسلوك فانه يحرم اذا بلغ موضعًا يحاذى ميقاتًا من هٰذه المواقيت لانه اذا حاذى ذلك الموضع ميقاتًا من المواقيت صارفى حكم الذى يحاذيه فى القرب من مكة . (بدائع ص۱۶۴ ج۲)

محاذات کی ایک دوسری تفسیر

علامہ وملا اخوند جان مرغینانی مہاجر مکی رحمہُ اللہُ تعالیٰ نے مواقیت حج کی تحقیق میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کی تاریخ تصنیف ۱۳۱۳ھ ہے اور ۱۳۲۳ھ میں تاشقند کے ایک پریس میں چھپا ہے یہ رسالہ حضرت حاجی شیر محمد صاحب سندھی رحمہُ اللہُ تعالیٰ مہاجر مدنی نے احقر کو عطا فرمایا تھا جو احقر کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح حدود حرم کے ذریعہ تمام حلقۂ حرم کی تعیین کی جاتی ہے کہ حد حرم سے دوسری حد تک ایک خط ملایا جائے اسی طرح تیسری چوتھی حدود کے باہم خطوط ملا کر ان خطوط کے درمیان جو رقبۂ زمین آتا ہے وہ حرم کہلاتا ہے۔

اسی طرح مواقیت کے حلقے کو سمجھنا چاہئے ایک میقات سے دوسرے میقات

تک خط ملا کر یہ خط محاذات ہوگا، خط سے باہر آفاق اور خط کے اندر حِلّ کہا جائیگا۔ اس خط محاذات سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کی شکل بھی رسالہ کے حاشیہ پر ایک مُخمّس کی صورت میں یہ دی ہے



اس تفسیر محاذات کے مطابق یلملم سے جو خط جحفہ کے ساتھ ملایا جائیگا تو جدہ اس خط سے باہر کافی فاصلہ پر رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر جدہ سے بھی آگے شجرہ کے قریب تک بلا احرام جا سکیں، محاذات کی یہ تفسیر اگرچہ قواعد محاذات کی رو سے تو معقول ہے مگر فقہاء کے کلام میں اس کی تائید نہیں ملتی بلکہ اس کے خلاف یہ تصریحات اوپر گزر چکی ہیں کہ اہل یمن و بلاد مشرق کے باشندے جب جدّہ کی طرف سے داخل حلِ ہوں تو ان پر یہ پابندی لازم ہے کہ جس قدر مسافت یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے اسی قدر مسافت اس طرف سے بھی ہونی چاہئے مثلاً وہ مرحلتین ہے تو ادھر سے بھی مرحلتین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ضروری ہے اور وہ جدہ پر ہی ہو سکتا ہے جدّہ سے آگے نہیں۔

واملا اخوند جان کی عبارت اس کے متعلق یہ ہے۔

ظاهر ان المسجد مشتمل علیٰ البیت و حاوٍله من کل جهة ومکة مشتمل بها والحرم مشتمل بالثلاثة ممتدمن کل جهة الی الحِلّ الصغیر المحیط بالحرم ولاشك ان الحرم غیر مختص بالعلامات الموضوعة فی الطریق بل هو السطح الممتدمن کل جهة قرباً وبعداً ولا یتوهم احل ان الحرم المکانات المتصلة بالعلامات فقط و کل عاقل یفهم ان الا ماکن بین العلامات من ارض الحرم مثلا العلامة

عندالتنعیم الی العلامة عندحدیبیة کلها حرم لایقتل صیده ولا یقطع شجره.

ثم الحل الصغیر یبتدء من اطراف الحرم من کل جهة الی المواقیت کانّها مخمّسة الشکل والحل الصغیر بین الحرم والحل الکبیر الذی هو جمیع الآفاق والمواقیت بعض اجزاء الحل ولهٰذا یجوز لاهلها تاخیر الاحرم الی قریب حدالحرم کما یجوز لاهل الحل الصغیر (الی قوله) فتحصل من ذلك ان حرم الحرم ای المواقیت مثل الحرم المحیط بما فی جوفه مثل الخطوط الممتدة بین التقاط فکما ان النقاط مواقیت فکذلك الخطوط بینها والا لجاز الدخول الی الحرم بلا احرام من بین المواقیت. (رساله اخوندجان ص ۱۶۳ طبع تاشقند)

پاکستان ہندوستان اور مشرقی ممالک سے آنیوالوں کا میقات

آج کل ان ممالک مشرقیہ سے آنے والے حجاج کے لئے راستے دو ہیں، ایک ہوائی دوسرا بحری، ہوائی جہازوں کا راستہ عموماً خشکی کے اوپر سے براہ قرن المنازل ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز قرن منازل اور ذات عرق دونوں میقاتوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے اول حل میں داخل ہوجاتے ہیں اور پھر جدّہ پہنچتے ہیں۔ اس لئے ہوائی سفر میں تو قرن المنازل کے اوپر آنے سے پہلے پہلے احرام باندھنا لازم وواجب ہے اور چونکہ ہوائی جہازوں میں اس کا پتہ چلنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس وقت اور کب یہ جہاز قرن المنازل کے اوپر گزرے گا اس لئے اہل پاکستان اور ہندوستان کے لئے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں اگر بغیر احرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ پہنچ گئے تو ان کے ذمہ دم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہوجائے گی اور گناہ اس کے علاوہ

ہوگا جس کی وجہ سے حج ناقص رہ جاتا ہے مقبول نہیں ہوتا۔ بہت سے حجاج اس میں غفلت کرتے ہیں۔

چین، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے ہوائی جہاز بھی اگر خشکی پر پرواز کریں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں اگر ان کے جہاز خشکی کے بجائے سمندر کے اوپر سے پرواز کر کے جدہ پہنچیں تو ان کا حکم وہ ہوگا جو بحری جہاز سے آنے والوں کا ابھی لکھا جائے گا۔

مشرقی ممالک کے لئے دوسرا راستہ بحری سفر کا ہے۔

اس راستہ سے جانے والے بحری جہاز قدیم زمانے میں تو یلملم کے ساحل پر اترتے تھے جو یمن کا ایک حصہ ہے اور اہل یمن کی طرح وہ بھی میقات یلملم سے گذر کر حل میں پھر حرم اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے، اسی لئے عام فقہاء کی تصریحات یہی ہیں کہ ہندوستان، پاکستان اور تمام بلاد مشرق کا میقات یلملم ہے۔ لیکن مدت دراز سے یہ ساحل متروک ہوگیا اب بحری جہاز یہاں نہیں ٹھہرتے بلکہ ساحل یلملم سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر محاذات یلملم سے گذرتے ہوئے سمندر ہی میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ساحل جدہ پر قیام کرتے ہیں۔ جدہ ہی سے سب مسافر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں

اس صورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ ان ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والے مسافروں کے راستے میں عین میقات تو کوئی پڑتا نہیں البتہ محاذات میقات یلملم سے دو جگہ ہوتی ہے، ایک درمیان سفر یلملم کے مقابل سے گزرتے ہوئے دوسرے سفر کے اختتام پر جدّہ میں، سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ کسی میقات یا اس کی محاذات سے بلا احرام تجاوز کرنا جو ممنوع و ناجائز اور موجب دم ہے وہ اس وقت ہے جبکہ یہ ان کا تجاوز الی جہت الحرم ہو۔ اور اگر ان محاذات سے سمندر ہی میں آگے بڑھتا ہوا آفاق ہی کے اندر سفر کرے تو یہ تجاوز عن المیقات اور موجب دم نہیں

ہوگا۔ جیسا کہ تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے اس کی تصریح پہلے آچکی ہے جس کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

وخرج بقولنا الى جهة الحرم مالو جاوزه يمنة اويسرة فله ان يؤخرا حرامه لكن بشرط ان يحرم من محلّ مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله الماوردى وجزم به غيره وبه يعلم ان الجائى من اليمن فى البحر له ان يؤخر احرامه من محاذاة يلملم الى جده لان مسافتها الى مكة كمسافة يلملم كما صرحوا به.

(تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص ۴۵ ج ۴)

اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرقی ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والوں کے لئے محاذات **یلملم** پر احرام باندھنا واجب نہیں، ہاں! کوئی یہیں پر احرام باندھے تو افضل ہونے میں شبہ نہیں، کیونکہ میقات سے جتنا پہلے کوئی احرام باندھے اُتنا ہی ثواب زیادہ ہے۔

اب قابل غور سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ان لوگوں پر محاذات **یلملم** سے احرام باندھنا واجب نہ ہوا تو پھر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا جہاں سے تجاوز بلا احرام جائز نہیں۔

جدّہ سے احرام باندھنے کا مسئلہ

یہ بات اوپر واضح ہوچکی ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ خشکی کے اوپر سے جدہ پہنچنے کے لئے میقات قرن المنازل اور میقات ذات عرق کے اوپر سے گزرنا ہوتا ہے اس لئے ہوائی جہاز کے مسافروں کو بلا احرام جانا جائز نہیں' پاکستان، ہندوستان والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔

البتہ غور طلب مسئلہ بحری جہازوں کا اور ان کے مسافروں کا ہے کہ جب

میقات یلملم کی محاذات سے احرام واجب نہ ہوا تو اب کہاں واجب ہوگا۔

واملا اخوند جان کے تحریر کے مطابق تو یہ مقام جدہ شہر سے بھی کچھ آگے چل کر آئے گا، مگر فقہاء کی تصریحات اس سے مختلف ہیں۔ عام فقہاء کے نزدیک جدہ کی طرف سے جانے والے مشرقی مسافروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مقام پر احرام باندھیں جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے اس فاصلہ سے کم نہ ہو جو یلملم اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے، اب یہ مقام کونسا ہوگا؟ اس کے متعلق علامہ ابن حجر مکی کی کتاب تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے یہ تصریح ابھی گزر چکی ہے کہ یہ مقام جدہ ہے کیونکہ مسافت جدہ کی مکہ مکرمہ سے اتنی ہی ہے جتنی یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے۔

له ان يؤخر احرامه من محاذات يلملم

الىٰ جده لان مسافتها الىٰ مكة كمسافة يلملم

علامہ ابن حجر مکی کی تصریحات بالا سے تو یہ معلوم ہوا کہ حقیقی محاذات اس طرف سے معلوم کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ مسافت مرحلتین کا اعتبار کیا جائے جس طرح یلملم سے مکہ مکرمہ دو مرحلے پر ہے۔ اسی طرح جدہ سے دو مرحلہ ہے اس لئے مسافت برابر ہونے کی وجہ سے جدہ ہی محاذات یلملم قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ میں حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کسی قدر فرق کی ساتھ اس کی موافقت فرمائی وہ یہ کہ اگر حقیقی محاذات کا علم نہ ہو تو پھر دو مرحلے کی مسافت کا اعتبار کر کے جدہ ہی کو بحکم میقات سمجھا جائے گا، ان کے الفاظ مناسک ملّا علی قاری میں یہ ہیں۔

وان لم يعلم المحاذاة فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر. (ارشاد الساری ص ۵۶)

اسی طرح غنیۃ الناسک میں بحوالۂ طوالع لکھا ہے:

وان لم يعلم المحاذات فعلى مرحلتين عرفيتين من مكة كجدة

من طرف البحر فانها علی مرحلتین عرفیتین من مکة وثلث مراحل شرعیه. طوالع (غنیۃ الناسک ص ۲۶)۔

اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اب سے پچاس سال پہلے ۱۳۲۸ھ میں یہی فتوی دیا تھا کہ حقیقی محاذات معلوم نہ ہونے کے سبب جدہ ہی کو میقات قرار دیا جائے گا۔

امداد الفتاویٰ تتمہ خامسہ طبع قدیم کے ص ۱۴۹ پر اور طبع جدید کی جلد دوم ص ۱۴۰ میں ان کا یہ ارشاد بالفاظ ذیل منقول ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا کہ مدینہ کا راستہ بند ہونے کی صورت میں حج کا احرام کہاں سے باندھے گا؟ تو اس کے جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدّہ سے ہوگا۔ مناسک ملّا علی قاری میں عبارت موجود ہے۔

وان لم یعلم المحاذات فعلی رحلتین من مکة کجدّة المحروسة من طرف البحر.

اور یہ ظاہر ہے اہل ہند کے لئے یلملم کی محاذات کسی معتبر طریقے سے نہیں ہوتی لہذا جدّہ ان کے لئے میقات ہے۔ (۱۷ شعبان ۱۳۲۸ھ)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ان سے زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی کہ حضرت مولانا موصوف اہل ہند کے لئے بحری جہاز سے آنے کی صورت میں جدّہ ہی کو ان کا میقات قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اقوال سابقہ اس پر تو متفق ہیں کہ مکہ مکرمہ کی مسافت یلملم اور جدہ سے مساوی یعنی مرحلتین ہے۔ علامہ ابن حجر مکی اس مرحلتین کو عین محاذات قرار دے کر جدّہ سے احرام کو جائز لکھتے ہیں اور ملا علی قاری اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس بنا پر جدّہ کو قائم مقام محاذات کا قرار دیتے ہیں کہ اصل محاذات کا علم نہیں۔ اس لئے مسافت کا اعتبار کر کے مکہ مکرمہ

سے دومرحلہ پہلے احرام باندھنا واجب ہے اور جدّہ چونکہ دومرحلہ کی مسافت پر ہے اس لئے جدّہ سے احرام باندھنا صحیح ہوگیا۔

ان تمام عبارات مرقومہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرات فقہاء نے اس مسافت کی تعیین میں میلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا بلکہ مراحل کا اعتبار کیا ہے اور مراحل کی مسافت میلوں کے اعتبار سے کم وبیش ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فتح الباری وعمدۃ القاری میں بحوالہ ابن حزم یلملم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے، اور بعض علماء نے چالیس میل بھی فرمایا ہے اور آجکل کے پیمائش کرنے والوں نے باون تک بتلایا ہے۔ پھر اسی کو سب نے مرحلتین بھی فرمایا ہے۔ اور قرن المنازل کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے مخدوم ہاشم سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حیات القلوب میں بحوالہ باقانی شرح ملتقی الابحر پچاس میل بتلایا ہے اور اس کو بھی تمام فقہاء نے مرحلتین ہی فرمایا ہے کما فی البحر الرائق۔

اسی طرح ذات عرق کو بھی مکہ مکرمہ سے دومرحلہ پر لکھا ہے۔ (ارشاد الساری ص ۵۵ والنووی شرح مسلم تحفہ ابن حجر مکی)۔ اور میلوں میں اس کا فاصلہ قسطلانی اور فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل بتلایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ میلوں کے اعتبار سے فاصلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ تیس میل کو بھی دومرحلے قرار دیا۔ پچاس میل کو بھی بیالیس میل کو بھی۔ اور اعتبار مراحل کا کرکے ان کی مسافتوں کو مکہ مکرمہ سے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

جدہ کو میقات اہل یمن واہل مشرق قرار دینا اسی اصول پر مبنی ہے کہ مسافت مرحلتین پر ہے۔ اب میلوں کے اعتبار سے کتنا ہے اس کی تحقیق ضروری نہیں رہی۔ آجکل کی پیمائش کے اعتبار سے جدّہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تقریباً چھیالیس میل ہے۔

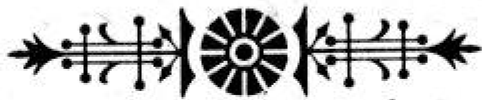
میقات یلملم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ

یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ فقہاء کے نزدیک اس جگہ مسافت میں مراحل کا اعتبار

ہے، میلوں کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میلوں کا فاصلہ بھی اکثر فقہاء وعلماء لکھتے چلے آئے ہیں، شرح بخاری عمدۃ القاری، فتح الباری وغیرہ میں تو بحوالہ ابن حزم یہ فاصلہ تیس میل بتلایا ہے۔ اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام الظلام ص ۵۷ ج ۱ میں یہ فاصلہ چالیس میل کا لکھا ہے اور آجکل بعض اہل فن نے یہ فاصلہ باون میل کا بتلایا ہے، اس اختلاف کا اصل منشا موجود ہے جو تحفہ شرح منہاج کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے بتلایا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد علمت ان يلملم جبل محاذ للسعدية وسمعت ان بحذاء السعدية جبلين احدهما بين طرفها المحاذى لمكة وبين مكة اكثر من مرحلتين والثانى ممتد لجهة مكة بينه وبين مكة باعتبار طرفه الذى بجهتها مرحلتان فاقل. (حواشی شروانیہ ص ۴۶ ج ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ یلملم اس پہاڑ کو کہا جاتا ہے جو سعدیہ کے محاذ میں واقع ہے اور وہ دو پہاڑ ہیں، ایک کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے میلوں کے اعتبار سے دو مرحلے سے زیادہ ہے دوسرے کا فاصلہ دو مرحلے سے بھی کم معلوم ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اس دوسرے فاصلہ کا اعتبار کر کے تیس میل بتلایا ہے اور جنہوں نے پہلے فاصلہ کو لیا انھوں نے چالیس پچاس میل تک کا فاصلہ قرار دیا۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء)



مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

دوسروں کے لئے حج

حج بدل کے مسائل سے پہلے ایک اصولی سوال کا جواب سمجھ لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے کوئی عبادت ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں یہ تفصیل ہے کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں، ایک عبادت بدنی جیسے نماز، روزہ ، دوسری عبادت مالی جیسے زکوٰۃ صدقۃ الفطر۔ تیسری وہ عبادت جو بدنی اور مالی کا مجموعہ ہے یعنی اس میں کچھ مال بھی خرچ ہوتا ہے کچھ جسمانی محنت بھی اٹھانی پڑتی ہے جیسے حج وعمرہ وغیرہ۔

ان تینوں قسم کے احکام یہ ہیں کہ عبادات بدنیہ میں تو ایک کا فرض کوئی دوسرا آدمی مطلقاً ادا نہیں کرسکتا۔ ایک کی نماز کوئی دوسرا ادا نہیں کرسکتا، ایک کا روزہ دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ اور عبادات مالیہ میں مطلقاً ایک کا فرض دوسرا ادا کرسکتا ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ کسی کو بھی اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ اس کے ذریعہ ادا کرسکتا ہے اس کا مسلمان ہونا بھی شرط نہیں اور کوئی دوسرا آدمی اپنے مال سے دوسرے کی زکوٰۃ اس کی اجازت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے اس میں کوئی شرط نہیں۔

تیسری قسم یعنی وہ عبادت جو مالی اور بدنی سے مرکب ہے اس کا حکم یہ ہے کہ خود ادائیگی پر قادر ہونے کی حالت میں تو کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرسکتا البتہ خود قدرت نہ ہو تو ضرورت کے وقت دوسرا آدمی اس کا فرض ادا کرسکتا ہے، حج اسی

قسم میں داخل ہے کیونکہ اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور محنت بھی اس تیسری قسم کے لئے کچھ شرائط ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

مسئلہ:۔ یہ حکم ان فرض اور واجب عبادات کا ہے جو مالی اور بدنی دونوں عبادات پر مشتمل ہوں کہ ایک کا فرض دوسرا آدمی ادا کردے۔ لیکن نفلی عبادات میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی عبادات کا ثواب جس کو چاہے بخش دے۔ خواہ عبادت بدنی نماز روزہ ہو یا مالی صدقات ہوں یا حج وغیرہ جو دونوں سے مرکب ہیں، وہ ہوں ہر قسم کی نفلی عبادت کا ثواب ہر آدمی کو حق ہے کہ جس کو چاہے بخشش کرسکتا ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، جس کا طریقہ یہ ہے کہ عبادت کرنے کے بعد دل سے نیت کرلے اور زبان سے کہہ دینا زیادہ بہتر ہے کہ اس عبادت کا ثواب فلاں شخص کو پہنچے، اس میں بھی اختیار ہے کہ عبادت کا ثواب چند آدمیوں کو پہنچادے۔ اہلسنت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ جو شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی کو بخش دے تو وہ اس کو پہنچتا ہے البتہ بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک بدنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو نہیں بخشا جاسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص نفلی طور پر اپنے حج یا عمرہ کا ثواب دوسرے کو بخش دے تو یہ بھی جائز ہے اور اس کے لئے کوئی شرط نہیں جبکہ یہ حج وعمرہ اپنے مال سے کیا ہو۔ اور اگر کوئی اپنا مال خرچ دے کر اپنی طرف سے نفلی حج یا عمرہ کرنے کے لئے کسی کو بھیجے تو اس میں چند شرائط اور ضروری ہیں۔

حجِ بدل فرض کے احکام

مسئلہ:۔ جس شخص پر حج فرض ہوگیا اور اس نے ادائے حج کا زمانہ بھی پایا مگر باوجود قدرت سے کسی وجہ سے حج ادا نہ کیا پھر وہ حج سے معذور اور عاجز ہوگیا تو اس پر فرض ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو بھیج کر خود حج بدل کرائے یا وصیت کرے کہ میرے بعد میری طرف سے حج کرایا جائے۔

مسئلہ:۔ اگر حج کی مالی استطاعت حاصل ہونے کے بعد زمانہ حج آنے سے پہلے فوت ہوگیا تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ حج اس کے ذمہ سے ساقط ہوگیا۔ اسی طرح اگر یہ شخص پہلے ہی سال حج کے لئے روانہ ہوگیا، پھر حج سے پہلے فوت ہوگیا تو اس کے ذمہ سے بھی حج ساقط ہوگیا، وصیت کی ضرورت نہیں۔

حج سے عاجز معذور قرار دینے کی شرائط

حج سے عاجز و معذور ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جو اوپر گزری کہ حج کا موقع پانے سے پہلے انتقال ہوگیا۔ اس میں حج سرے سے ساقط ہو جاتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو کسی نے قید کرلیا، یا زبردستی مکہ معظمہ جانے سے روک دیا، تیسری یہ کہ کوئی ایسا مرض پیش آگیا جس سے صحت کی امید نہیں مثلاً اپاہج یا نابینا یا لنگڑا ہوگیا یا بڑھاپے کا ضعف ایسا ہوگیا کہ خود سواری پر سوار نہیں ہوسکتا۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ راستہ مامون نہیں، یا سفر کرنے میں جان و مال کا اندیشہ ہے۔ پانچویں صورت خاص عورتوں کے لئے یہ ہے کہ کوئی محرم ساتھ سفر کرنے کے لئے نہ ملا۔ ان سب سورتوں میں اس کو معذور سمجھا جائے گا بشرطیکہ یہ عذر موت تک مسلسل جاری رہا۔ اگر یہ اعذار قبل الموت رفع ہوجائیں مگر پھر خود زمانہ حج پانے کی صورت میں حج کرنے کی نوبت نہ آئے تو حج بدل کرنا یا اس کی وصیت کرنا واجب ہے اور اگر مرنے تک یہ اعذار قائم رہے تو حج بدل کی وصیت کرجائیں اور وارث حج کرادیں۔

حج بدل کی شرائط جس شخص کے ذمہ حج فرض ہو یا اس نے بذریعہ نذر (منت) اپنے اوپر حج یا عمرہ کو لازم کرلیا ہو پھر خود ادا کرنے کی قدرت نہ رہی جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، تو ایسے شخص کا حج یا عمرہ بطور بدل ادا کرانے کے لئے بیس شرطیں ہیں ان شرائط میں دو لفظ بار بار آئیں گے ان کے معنی سمجھ لیجئے۔ ایک آمر دوسرا مامور حج کرانے والے کو آمر کہتے ہیں اور جو دوسرے کے حکم سے حج بدل کرتا ہے اس کو مامور کہتے ہیں۔

پہلی شرط: جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جارہا ہو اس پر حج بدل کرنے کے وقت حج فرض ہو۔ اگر اس وقت اس پر حج فرض نہیں تھا اس حالت میں اپنی طرف سے حج بدل کرایا تو یہ نفلی حج ہوا اگر اس کے بعد اس کو حج کی استطاعت ہو تو حج فرض ہو گیا دوبارہ حج خود کرنا پڑے گا۔ خود نہ کر سکا تو حج بدل دوبارہ کرنا پڑے گا۔

دوسری اور تیسری شرط: دائمی عجز اور حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا یعنی جن اعذار کی وجہ سے انسان کو حج سے عاجز قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ ان اعذار کا موت تک باقی رہنا۔ حج بدل کرنے سے پہلے موجود ہونا فرض حج بدل کے لئے شرط ہے۔ اگر کسی معذور شخص کا حج بدل کرا دینے کے بعد عذر رفع ہو گیا۔ اور حج پر قدرت ہوگئی مثلاً بیمار تھا اچھا ہو گیا۔ عورت کو محرم مل گیا تو دوبارہ خود حج ادا کرنا ضروری ہوگا اور جو حج بدل کرایا ہے وہ نفلی حج ہو جائے گا۔ (مناسک ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ)

چوتھی شرط:۔ جس کا حج فرض ادا کرنا ہے اس کی طرف سے حج بدل کرنے والے کو حکم کیا گیا ہو یا کم از کم اجازت دی گئی ہو، اگر اس کے امر و اجازت کے بغیر کسی شخص نے اس کی طرف سے حج بدل کر دیا تو اس کا فرض ادا نہ ہوگا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جس پر حج فرض تھا اور اس نے ادا نہیں کیا اور ادا کرانے کے لئے وصیت بھی نہیں کی، تو کوئی آدمی اگر اس پر احسان کر کے اس کی طرف سے حج بدل کر دے تو اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث کی بناء پر فرمایا کہ اگر کسی شخص نے اپنے والدین کی طرف سے یا کسی اور وارث یا اجنبی نے اپنے مرنے والے عزیز کی طرف سے بغیر اس کے امر اور وصیت کے ہی حج بدل ادا کر دیا تو انشاء اللہ اس کا فرض ادا ہو جائے گا یہ اس لئے کہا کہ کسی واضح حدیث سے اس کا ادا ہو جانا یقینی طور پر ثابت نہیں۔

پانچویں، چھٹی، ساتویں شرط:۔ یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا مسلمان عاقل ہو مجنون پاگل نہ ہو۔ اگر نابالغ ہو تو ممیّز ہو یعنی احکام حج ادا کرنے اور سفر کے انتظام کی تمیز رکھتا ہو۔

مسئلہ:۔ معلوم ہوا کہ مامور کا بالغ ہونا شرط نہیں نابالغ بھی حج بدل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی تمیز اور صلاحیت ہو کہ احکام حج ادا کر دے یعنی قریب البلوغ ہو مگر اس میں بعض علماء کا اختلاف ہے اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نابالغ سے حج نہ کرایا جائے۔ (از مناسک ملا علی قاری)

آٹھویں شرط یہ ہے کہ حج بدل کرانے پر کوئی اجرت و معاوضہ نہ لیا جائے۔ اگر کسی نے باقاعدہ اجرت طے کر کے کسی سے حج بدل کرایا تو لینے اور دینے والے دونوں گناہگار ہوں گے مگر حج آمر کا ادا ہو جائے گا۔ اور جو معاوضہ حج پر لیا ہے وہ واپس کرنا واجب ہوگا البتہ بقدر اخراجات حج مامور کو آمر کی طرف سے مال دلایا جائے گا۔

نویں، دسویں شرط۔ یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جا رہا ہو اس کے مال سے حج کرے اور سواری پر کرے پیادہ نہ ہو اگر حج بدل کرنے والے نے اپنا مال خرچ کر کے اس کی طرف سے حج بدل کر دیا تو اس کا فرض ادا نہیں ہوگا اور شرط یہ ہے کہ اکثر حصہ مصارف حج کا اس کی طرف سے ہو اگر کچھ تھوڑا مال خود حج بدل کرنے والے نے اپنا خرچ کر لیا تو مضائقہ نہیں اسی طرح اگر پیادہ حج کیا آمر یعنی حج کرانے والے کا حج فرض ادا نہیں ہوگا۔ اس میں بھی اکثر سفر کا سواری پر کرنا کافی ہے، کچھ حصہ سفر کا پیادہ بھی طے کر لیا تو حرج نہیں۔

گیارھویں شرط: آمر یعنی حج کرانے والے کے وطن سے سفر شروع کیا جائے اگر حج کرانے والے کے کئی وطن ہوں تو اس وطن کا اعتبار ہوگا جو بہ نسبت دوسرے کے مکہ مکرمہ کی طرف قریب ہو۔

مسئلہ:۔ جو شخص ہندوستان میں فوت ہوا اور حج بدل کی وصیت کر گیا مگر بعد میں اس

کے اہل وعیال یا جس کو وصیت کی تھی وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تو وصی پر لازم ہے کہ اس کا حج ہندوستان کے وطن سے کرائے، ہندوستان ہی سے کسی آدمی کو حج بدل کے لئے مامور کردے لیکن اگر وہاں سے کسی کو حج بدل کے لئے بھیجنے پر قدرت نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ رقم وہاں بھیجنا مشکل ہو جائے یا وہاں سے کسی آدمی کا بھیجنا قدرت میں نہ ہو تو پاکستان ہی میں اس جگہ سے جہاں وصی ہجرت کر کے آیا ہے کسی کو حج بدل کے لئے بھیجدے تو امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا۔

یہ مسئلہ صراحتاً کتب فقہ میں موجود نہیں ہے مگر اس کی ایک نظیر یہ موجود ہے کہ میت کا مال اگر اس کے وطن سے حج کرانے کے لئے کافی نہ ہو تو جس جگہ سے کافی ہو وہاں سے حج کرا دینے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں بھی آمر کے وطن سے حج کرانے پر قدرت نہ رہی تو جہاں سے قدرت ہے وہیں سے حج کرا دینا انشاء اللہ کافی ہوگا۔

بارھویں شرط: ، مامور یعنی حج بدل کرنے والا احرام باندھنے کے وقت حج کی نیت آمر یعنی حج کرانے والے کی طرف سے کرے اگر احرام کے وقت نیت نہیں کی تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افعال حج شروع کرنے سے پہلے پہلے نیت کرنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ احرام کے وقت زبان سے کہے کہ میں فلاں شخص کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور پھر جب تلبیہ کہے تو اس میں یہ الفاظ کہے لبیک عن فلاں فلاں کی جگہ اس کا نام لے اگر نام یاد نہ رہے تو صرف اتنا کہہ دے کہ جس نے مجھے حج بدل کے لئے بھیجا ہے اس کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور لبیک عن الآمر کہہ دے اور اگر زبان سے کچھ بھی نہ کہے صرف دل سے نیت آمر کے حج کی کرے تو یہ بھی کافی ہے اگر احرام باندھنے کے وقت مطلق حج کی نیت کر لی اپنی یا دوسرے کی کوئی نیت نہیں کی تو افعال حج شروع کرنے سے پہلے آمر کی طرف سے نیت کر لینا کافی ہو جائے گا۔

تیرھویں اور چودھویں شرط: مامور یعنی جس کو حج بدل کے لئے کہا گیا ہے وہ خود ہی

اس کی طرف سے حج بدل کرے کسی دوسرے سے بغیر اجازت آمر کے کرانا جائز نہیں۔ اگر بغیر اجازت کے کسی کو بھیجا تو وہ حج مامور کا ہو جائے گا۔ آمر کا نہیں ہوگا اور آمر کی رقم واپس کرنا پڑے گی اس لئے بہتر یہ ہے کہ مامور کو اجازت عام دے دی جائے کہ وہ کسی وجہ سے خود نہ کر سکے تو دوسرے سے کروائے۔ اسی طرح مرنے والے نے حج بدل کی وصیت میں کسی خاص کو معین کہہ دیا کہ اس کے سوا میرا حج بدل کوئی اور نہ کرے تو کسی دوسرے سے اس کا حج بدل کرانا جائز نہیں اور اگر معین تو کیا مگر دوسرے کی نفی نہیں کی یعنی صرف اتنا کہا کہ میرا حج بدل فلاں سے کرادیں اس صورت میں بہتر تو یہی ہے کہ اسی معین شخص سے حج کرائیں، ہاں! اگر وہ انکار کردے یا کسی وجہ سے معذور ہو جائے تو دوسرے سے کرا سکتے ہیں اس کے انکار اور معذوری کے بغیر بھی اگر وصی نے کسی اور کو بھیج دیا تو حج فرض آمر کا ادا ہو جائے گا۔ (ملا علی قاری)

پندرھویں شرط: مامور حج کو فاسد نہ کرے فاسد ہونے کی صورت یہ ہے کہ وقوف عرفات سے پہلے جماع کرلے اور فوت کرنے کی صورت یہ ہے کہ احرام کے باوجود عرفات کا وقوف نہ کرے اگر فاسد کردیا یا فوت کردیا تو آمر کا حج ادا نہ ہوا اور فاسد کرنے والے پر واجب ہوگا کہ آمر کی رقم جتنی اس نے حج بدل کے لئے دی تھی واپس کرے اور آئندہ سال اپنے مال سے حج کی قضا کرے، یہ قضا بھی اسی مامور کی طرف سے ہوگی آمر کی طرف سے نہیں ہوگی۔ آمر کو اپنا حج بدل الگ کرانا ہوگا۔

اور فوت ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اپنی غفلت و کوتاہی سے ارکان حج ادا نہیں کئے اس صورت میں اسکو بھی آمر کی رقم کا ضمان دینا پڑے گا۔ اور اپنے فوت شدہ حج کی قضا اپنے مال سے الگ کرنا ہوگی۔ اس قضا سے بھی آمر کا حج فرض ساقط نہیں ہوگا اور خود مامور کا بھی حج فرض اس سے ادا نہیں ہوگا، اگر بعد میں اس کو حج پر قدرت ہو گئی تو اپنا فرض الگ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آسمانی آفت، بیماری یا قید ہو جانے وغیرہ کے سبب ارکان حج کی ادائیگی سے معذور ہو گیا اس

صورت میں اس پر لازم ہے کہ اگلے سال اس کی قضا کرے اور آمر کو کوئی ضمان دینا نہیں پڑے گا۔ مگر اگلے سال جو قضا کرے گا اس سے آمر کا حج ادا ہو سکتا ہے۔ اگر آمر اس کو حکم کرے اور یہ قضا میں آمر کی نیت کر لے۔

سترھویں اور اٹھارھویں شرط: مامور صرف ایک حج کا احرام باندھے ایسا نہ کرے کہ بیک وقت دو حج کی نیت کر کے احرام باندھے ایک اپنا ایک آمر کا۔ اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ ایک ہی شخص کی طرف سے احرام باندھے۔ ایسا نہ کرے کہ دو آدمیوں کے حج کی نیت کرے اور دونوں کے لئے احرام باندھے۔

انیسویں شرط: مامور یعنی حج بدل کرنے والا آمر یعنی کرانے والے کے میقات سے احرام باندھے یعنی اس کے وطن سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے جو میقات آتا ہے اس سے احرام حج بدل کا باندھے جیسے ہندو پاکستان والوں کے لئے بحری جہاز سے سفر کرنے میں یلملم ہے۔ اگر مامور نے یہاں سے احرام عمرہ کا باندھا، عمرہ ادا کر کے مکہ معظّمہ سے احرام حج کا باندھا جیسا کہ حج تمتع کا قاعدہ ہے تو چونکہ حج میقات آمر سے نہیں ہوا اس لئے آمر کا حج ادا نہ ہوا خود مامور کا ہو گیا۔ اس پر لازم ہے کہ آمر کی دی ہوئی رقم اس کو واپس کرے۔ **بیسویں شرط:** یہ ہے کہ مامور آمر کی مخالفت نہ کرے مثلاً آمر نے اس کو حج افراد کرنے کے لئے کہا تھا۔ اگر اس حج کے ساتھ عمرہ بھی ملا کر قران کر لیا تو آمر کا حج ادا نہیں ہوگا مامور پر ضمان آئے گا کہ آمر کی رقم واپس کرے۔

یہ حکم اس صورت میں تو متفق علیہ ہے جبکہ اس نے عمرہ کی نیت اپنی طرف سے اور حج کی نیت آمر کی طرف سے کی ہو اور اگر عمرہ بھی آمر کی طرف سے کیا حج بھی تو اس میں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول تو یہی ہے کہ مخالفت آمر کی وجہ سے یہ حج آمر کا نہیں مامور کا ہوگا اور اس پر ضمان لازم ہوگا۔ مگر صاحبین کے نزدیک آمر کا حج اس سے ادا ہو جائے گا۔ (مناسک ملا علی قاری)

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک چونکہ اس حکم کا مدار مخالفتِ آمر پر ہے اس

لئے اگر آمر نے خود ہی اجازت قران کی دے دی ہے تو مقتضائے کلام یہ ہے کہ بہ اتفاق حج آمر کا ادا ہوجائے گا۔ یہ حکم قران کا ہے۔ اگر مامور نے عمرہ کا اضافہ بصورتِ تمتع کرلیا کہ میقات آمر سے صرف عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کرلیا پھر مکہ مکرمہ سے احرام حج کا باندھا تو امام صاحب اور صاحبین دونوں کے نزدیک آمر کا حج ادا نہیں ہوا، مامور پر ضمان واجب ہے۔ یظہر کما فی البحر والفتح

خلاصۂ شرائط

شرائط مذکور میں چار شرائط تو آمر حج کرانے والے کی ذات سے متعلق ہیں۔ ❶ اس کا مسلمان ہونا اور اسپر حج فرض ہونا اور خود قادر نہ ہونا ❷ اس کے عجز کا دائمی ہونا ❸ حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا ❹ حج بدل کے لئے کسی کو خود مامور کرنا یا اس کے لئے وصیت کرنا۔ اور چار شرائط مامور کی ذات کے متعلق ہیں ❺ مسلمان ہونا ❻ عاقل ہونا ❼ اگر نابالغ ہو تو ممیّز قریب بلوغ ہونا ❽ حج بدل کی کوئی اجرت ومعاوضہ نہ لینا۔ باقی شرائط افعال حج سے متعلق ہیں کہ ❾ حج بدل کرنے میں اکثر مال حج کرانے والے آمر کا خرچ کرے کچھ تھوڑا اپنی طرف سے خرچ کردے تو مضائقہ نہیں۔ ❿ اکثر حصہ سفر کا سواری سے طے کرے، پیادہ حج کرے تو آمر کا حج نہیں ہوگا۔ ⓫ آمر کے وطن سے سفر شروع کرے ⓬ حج کو فاسد نہ کرے ⓭ آمر ہی کی طرف سے حج کی نیت بوقت احرام کرے ⓮ فوت بھی نہ کرے ⓯ آمر کی مخالفت نہ کرے۔ باقی پانچ شرطوں کا تعلق اسی شرط مخالفت سے ہے وہ درحقیقت الگ شرط نہیں۔

مسئلہ: یہ تمام شرائط فرض حج بدل کے لئے ہیں، نفلی حج اور عمرہ کے لئے دوسری شرائط ہیں۔
مسئلہ شرائط مذکورہ کے مطابق حج فرض جس کی طرف سے کیا گیا صحیح اور راجح فقہاء کے نزدیک یہی ہے کہ یہ حج وعمرہ آمر یعنی حج کرانے والے کا ہوگا اور حج وعمر کرنے

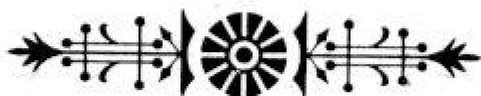
والے کو اس کی امداد کرنے کا ثواب ملے گا اور حج کے بعد زائد عمرے یا طواف وغیرہ جو کرے گا تو وہ خود اس کے ہوں گے عمرہ یا حج نفل میں بھی جبکہ آمر کے خرچ سے کیا گیا ہو یہی حکم ہے کہ آمر کا ہوگا مامور کو اس کے عمل کا ثواب ملے گا۔ کذافی الحاکم ارشاد الساری وغنیہ،

البتہ اگر نفلی حج یا عمرہ کسی نے اپنے خرچ سے کیا اور کرنے کے بعد کسی کو ثواب پہنچا دیا تو یہ حج وعمرہ خود کرنے والے کا ہوگا اور جس شخص کو ثواب پہنچایا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ (غنیہ)

مسئلہ جس شخص نے اپنا فرض ادا کرلیا ہے اس کے لئے نفلی حج کرنے سے بہتر اور افضل یہ ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے فرض کا حج بدل کرے۔ حدیث میں ہے جو شخص کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل کرتا ہے اس کو سات حجوں کا ثواب ملتا ہے۔ (غنیہ)

جس نے اپنا حج نہیں کیا اس سے حج کرانا

افضل اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ حج فرض کا بدل اس شخص سے کرایا جائے جو اپنا حج فرض ادا کر چکا ہو اور جس نے اپنا حج ادا نہیں کیا اگر وہ ایسا ہے کہ اس پر حج فرض ہی نہیں تو اس کا حج بدل کے لئے حکم کرنا جائز ہے مگر مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ ہے۔ اور اگر اس شخص کے ذمہ خود حج فرض ہے اور وہ بھی ادا نہیں کیا اس حالت میں دوسرا کوئی اس کو اپنے حج بدل کیلئے بھیجے تو بھیجنے والے کیلئے تو مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہی ہے مگر اس حج بدل پر جانے والے کے لئے مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے کیونکہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ جب اس کو حج کی سہولت میسر آجائے تو اپنا حج فرض ادا کرے۔ (غنیہ) (ماہانہ الاشرف کراچی اپریل ۱۹۹۶ء)



مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ (مؤسس وشیخ الجامعہ دار العلوم کراچی)

بدعت اور اُسکی خرابیاں

رسول کریم ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق آخر زمانہ میں فتنوں کی کثرت ہونے والی تھی وہ ہوئی اور ہم جیسے ضعیف القوۃ، ضعیف الھمۃ، ضعیف الایمان لوگوں کی نوبت اس دور میں آئی جبکہ دنیا کو فتنوں نے گھیر لیا ہے، روز وشب نئے نئے فتنوں کی بارش ہے۔

لیکن جیسے فتنوں کا زمانہ مشکلات کا خارزار ہے، ویسے ہی اس زمانہ میں صحیح طریق سنّت پر قائم رہنے اور دوسروں کو قائم رکھنے کے فضائل بھی بیحد وبے قیاس ہیں، حدیث میں ہے:۔

العبادة فی الهرج کهجرة الی رواہ مسلم (مشکوۃ)

فتنہ کے زمانہ میں عبادت کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ہجرت کر کے میرے پاس آجائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فسادِ امت کے زمانہ میں میری سنّت کو زندہ کرے اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں سنّت کے مطابق نیک عمل کرنے والے کا ثواب پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب رکھتا ہے' اور وہ پچاس آدمی آج کے نہیں بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے پچاس آدمی، اور جس وقت بدعات ومنکرات دنیا میں پھیل جائیں اس وقت اہل علم کے لئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ان کو اُس وقت اپنے علم کا اظہار کرنا چاہئے اور جو ایسا نہ کرے اس پر سخت وعید فرمائی ہے (کما اخرجه الآجرن فی کتاب

السنۃ عن معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ و سیأتی تمامہ) چنانچہ ہر زمانہ، ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں کے طوفان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے صحیح طریقہ کو روشن کیا اور بدعات ومحدثات کی تلبیس کو روک دیا۔ لیکن آج کل جن فتنوں کا طوفان ہے، ان میں ایک طرف لادینی، انکارِ خدا' انکارِ رسالت، انکار حدیث، انکار ختم نبوت کے وہ فتنے ہیں کہ جن کی ضرب براہ راست اسلام کی بنیادوں پر پڑتی ہے۔ راقم الحروف نے ہوش سنبھالنے کے بعد دینی تعلیم وتبلیغ اور فتویٰ وتصنیف وتالیف کے مثبت کام کے ساتھ جو کچھ بھی ہوسکا وہ انہی فتنوں کا مقابلہ کیا جو اعتقادی بدعات ہیں، عملی بدعات ومحدثات کے سلسلہ میں ابتک کوئی خاص کام نہ ہوسکا۔

حال میں ایک محترم دوست نے اپنے ماہنامہ کے لئے بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیوں پر مشتمل ایک مقالہ لکھنے کے لئے مجھے فرمایا اور خلاف عادت کچھ ایسے اصرار سے فرمایا کہ اپنی بے شمار ذمہ داریوں، مصروفیتوں اور اس پر طبعی ضعف کے باوجود وعدہ کرلینے کے سوا چارہ نہ رہا، کچھ لکھنا بھی شروع کیا لیکن صبح سے رات کے بارہ بجے تک تمام اوقات مشغول، وقت کہاں سے لاؤں؟ مگر ان حالات میں جو کچھ بھی ہوسکا' حاضر ہے۔

بدعت وسنت کی جنگ میں ایک لمحۂ فکریہ

بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیاں از روئے قرآن وسنت آگے آتی ہیں لیکن اس جگہ ایک بات ہر وقت پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص سنت کے اتباع اور بدعت کی مخالفت کی دعوت دیتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا منشاء بجز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور اس کے دین کی حفاظت اور کچھ نہیں۔ اسی طرح جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہے' منشاء اس کا بھی اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

اور ان کی رضا حاصل کرنا ہی ہے اور رسول کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق بدعت کو وہ بھی گمراہی کہتا اور برا سمجھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ علم صحیح نہ ہونے کی وجہ سے، وہ کسی بدعت کو بدعت نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عبادت اور اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان کی خیر خواہی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے ہمدردی وخیر واہی کے لہجہ میں مسلمانوں کو حقیقت الامر سے واقف کیا جائے۔ تشدد، طعنہ زنی، الزام تراشی کے طریقوں سے کلی اجتناب کیا جائے کہ ان سے کبھی کسی کی اصلاح نہیں ہوتی۔ بدعتی اور وہابی کے طعن آمیز خطابات سے پرہیز کیا جائے۔ اور کسی کے کلام کو توڑ مروڑ کر اس کے منشاء ومقصد کے خلاف اس پر الزام لگانا کھلا بہتان ہے جس کے حرام ہونے میں کسی کو تردد کی گنجائش نہیں۔ آخرت کے حساب کو سامنے رکھتے ہوئے ان حرکات سے باز رہا جائے۔

اس مختصر سی گذارش کے بعد اصل مقصد پر آتا ہوں اور چونکہ اصل خرابی واقفیت اور بدعت کو بدعت نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے پہلے بدعت کی تعریف اور پھر اس کی حقیقت لکھتا ہوں۔ ان اردت الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم.

بدعت کی تعریف

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو، یا عادات سے۔ اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقۂ عبادت کو بدعت کہتے ہیں جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو اور آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہے، نہ فعلاً نہ

صراحۃً نہ اشارۃً۔ بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوی کی کتاب ''الطریقة المحمدیة'' اور علامہ شاطبی کی کتاب ''الاعتصام'' سے لی گئی ہے

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لئے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیت ثواب نہیں کئے جاتے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہوں، نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً صراحۃً یا اشارتاً وہ بھی بدعت نہیں ہوسکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس کام کی ضرورت عہدِ رسالت میں موجود نہ تھی بعد میں کسی دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوگئی وہ بھی بدعت میں داخل نہیں، جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ اور تعلیمی، تبلیغی، وانجمنیں اور دینی نشر واشاعت کے ادارے اور قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے صرف ونحو اور ادب عربی، فصاحت وبلاغت کے فنون یا مخالف اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لئے منطق وفلسفہ کی کتابیں یا جہاد کے لئے جدید اسلحہ، اور جدید طریق جنگ کی تعلیم وغیرہ کہ یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد میں بھی موجود نہ تھیں مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لئے نہیں کہتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اس عہد مبارک میں موجود نہ تھی، بعد میں جیسے جیسے ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء امت نے اس کو پورا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کرلیں۔

اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا۔ بلکہ یہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث

فی الدین نہیں بلکہ احداث للدین ہے اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے احداث للدین کی نہیں۔ یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بضرورت زمان ومکان کوئی نئی صورت اختیار کرلینا ممنوع نہیں۔ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں زمان مابعد میں یکساں ہے ان میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا، اور یہ از روئے حدیث ممنوع وناجائز ہوگا۔

مثلاً درود وسلام کے وقت کھڑے ہوکر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنے کیلئے کھانے پر مختلف سورتیں پڑھنے کی پابندی، نماز جماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی بار دعا مانگنے کی پابندی، ایصال ثواب کے لئے تیجہ، چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب وشعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی نمازیں اور ان کے لئے چراغاں وغیرہ اور پھر ان خود ایجاد چیزوں کو فرض وواجب کی طرح سمجھنا، ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ درود وسلام، صدقہ وخیرات، اموات کو ایصال ثواب، متبرک راتوں میں نماز وعبادت نماز کے بعد دعا، یہ سب چیزیں عبادات ہیں، ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہد صحابہ میں بھی تھی۔ ان کے ذریعۂ ثواب آخرت اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذوق وشوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہوسکتا ہے، رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ان سب سے زائد تھا۔ کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کو صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ ذوقِ عبادت اور شوق رضائے الٰہی حاصل ہے۔

حضرت حذیفہ ابن رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمان فرماتے ہیں:

كل عبادة لم يتعبد ها اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

فلا تعيدوها، فان الأول لم يدع للآخر مقالاً فاتقوا الله يا معشر المسلمين وخذوا الطريق من كان قبلكم.

یعنی جو عبادت صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نہیں کی وہ عبادت نہ کرو کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں، اے علماء خدا سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقہ کو اختیار کرو۔'' اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہے (اعتصام الشاطبی ص ۳۱۰ ج ۲)

بدعت کے ناجائز وممنوع ہونے کی عقلی وجوہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ سب کام عہد صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں عبادت کی حیثیت سے جاری تھے تو ان کے ایسے طریقے اختیار کرنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اختیار نہیں کئے ان کا فلسفہ اور حکمت کیا ہے؟ کیا یہ مقصد ہے کہ ان عبادات کے یہ نئے طریقے معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو معلوم نہ تھے، آج ان دعویداروں پر انکشاف ہوا ہے، اس لئے انھوں نے اختیار نہیں کئے، یہ لوگ کر رہے ہیں۔

دین میں کوئی بدعت نکالنا رسول اللہ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے

اور اگر کہا جائے کہ ان کو معلوم تھے مگر لوگوں کو نہیں بتلایا تو کیا یہ معاذ اللہ ان حضرات پر دین میں بخل وخیانت اور تبلیغ رسالت میں کوتاہی کا الزام نہیں ہے، اسی لئے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ رسالت میں خیانت کی کہ پوری بات نہیں بتلائی۔

بدعت نکالنا یہ دعوی کرنا ہے کہ دین، عہدِ رسالت میں مکمل نہیں ہوا

ایک طرف تو قرآن کا یہ اعلان الیوم اکملت لکم دینکم یعنی میں نے آج تم پر اپنا دین مکمل کرلیا۔ دوسری طرف عبادات کے نئے نئے طریقے نکال کر عملاً یہ دعویٰ کہ شریعت اسلام کی تکمیل آج ہورہی ہے۔ کیا کوئی مسلمان جان بوجھ کر اس کو قبول کرسکتا ہے؟ اس لئے یقین کیجئے کہ عبادات کا جو طریقہ آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی بہترین اور دلکش نظر آئے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک اچھا نہیں اسی کو حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا. جو کام اُس زمانہ میں دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے ان طریقوں کو معاذ اللہ نہ تو ناواقفیت کی بنا پر چھوڑا تھا نہ سستی اور غفلت کی بناپر بلکہ ان کو غلط اور مضر سمجھ کر چھوڑا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ جو ثانی فاروق اعظم سمجھے جاتے تھے انھوں نے یہی مضمون اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

آج اگر کوئی شخص مغرب کی نماز میں تین کے بجائے چار رکعت اور صبح کی دو کی بجائے تین یا چار پڑھنے لگے یا روزہ مغرب تک رکھنے کے بجائے عشاء کے بعد تک رکھے تو ہر سمجھ دار مسلمان اسکو بُرا غلط اور ناجائز کہے گا، حالانکہ اس غریب نے بظاہر کوئی گناہ کا کام نہیں کیا، کچھ تسبیحات زیادہ پڑھیں، کچھ اللہ کا نام زیادہ لیا۔ پھر اس کو بالاتفاق بُرا اور ناجائز سمجھنا کیا صرف اس لئے نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بتلائے اور سکھلائے ہوئے طریقہ عبادت پر زیادتی کرکے عبادت کی صورت بدل ڈالی اور ایک طرح سے اس کا دعویٰ کیا کہ شریعت کو آنحضرت ﷺ نے مکمل نہیں کیا

تھا اُس نے کیا ہے۔ یا معاذ اللہ آپ ﷺ نے ادائے امانت میں کوتاہی اور خیانت برتی ہے کہ یہ نئے اور مفید طریقہائے عبادت لوگوں کو نہیں بتلائے۔

اب غور کیجئے کہ نماز کی رکعات تین کے بجائے چار پڑھنے میں اور نمازوں، دعاؤں، درود و سلام کے ساتھ ایسی شرطیں اور طریقے اضافہ کرنے میں کیا فرق ہے؟ جو آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول نہیں حقیقت یہ ہے کہ عبادات شرعیہ میں اپنی طرف سے قیدوں شرطوں کا اضافہ شریعت محمدیہ کی ترمیم اور تحریف ہے اس لئے اس کو شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔

بدعت تحریف دین کا راستہ ہے

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر عبادات میں اپنی طرف سے قیدیں شرطیں اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی اجازت دی جائے تو دین کی تحریف ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی پتہ نہ لگے گا کہ اصل عبادت جو رسولِ کریم ﷺ نے بتلائی تھی، کیا اور کیسی تھی؟ پچھلی امتوں میں تحریف دین کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر کی بتلائی ہوئی عبادات میں اپنی طرف سے عبادات کے نئے نئے طریقے نکالے اور ان کی رسم چل پڑی کچھ عرصہ کے بعد اصل دین اور ایجاد اشیاء میں کوئی امتیاز نہ رہا۔

شریعتِ اسلام میں نفل فرض سے جدا کرنے کا اہتمام

شریعت اسلام نے چونکہ ہر فتنہ کے دروازہ کو بند اور فساد دین کے راستے کو روکا ہے اسی لئے اس کا بھی خاص اہتمام فرمایا کہ فرائض اور نوافل میں پورا امتیاز رہے۔ حقیقت کے اعتبار سے بھی اور صورت کے اعتبار سے بھی نمازوں میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تو یہ معمول رہا کہ مسجد میں صرف فرض نماز جماعت سے

ادا فرماتے، باقی نوافل اور سنتیں بھی گھر جا کر پڑھتے تھے۔ اور جن نمازوں کے بعد سنت یا نفل نہیں ہے ان میں اگر نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے تو بصورت نماز قبلہ رخ نہیں بیٹھتے بلکہ داہنی یا بائیں جانب پھر کر بیٹھتے ہیں تاکہ دور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ نماز فرض ختم ہو چکی ہے اب امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اختیاری چیز ہے۔ اصل سنت تو یہی ہے کہ نوافل اور نفلی عبادات سب تنہائی میں اپنے گھروں میں ادا کی جائیں۔ اور اگر مسجد میں ہی سنتیں پڑھنی ہوں تو بھی مسنون طریقہ یہ ہے کہ جماعت فرض کی ہیئت کو ختم کر دیا جائے۔ صفیں توڑ دی جائیں۔ لوگ آگے پیچھے ہو کر سنتیں پڑھیں۔ اسی طرح روزہ شرعاً صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ لیکن چونکہ رات کو سب لوگ عادتاً سوتے ہیں اور سونے کی حالت میں بھی کھانے پینے سے آدمی ایسا ہی رکا رہتا ہے جیسا روزہ میں اس لئے سحری کھانا مسنون قرار دیا گیا تاکہ سونے کے وقت جو صورت روزہ کی ہو گئی تھی اس سے امتیاز ہو جاوے اور روزہ ٹھیک صبح صادق کے بعد سے شروع ہو۔ اسی لئے سحری کھانا بھی بالکل آخر وقت میں مستحب ہے اسی طرح غروب آفتاب کا یقین ہوجاتے ہی روزہ فوراً افطار کرنا چاہیئے، دیر کرنا مکروہ ہے تاکہ روزہ کی عبادت کے ساتھ زائد وقت کا روزہ میں اضافہ نہ ہو جائے۔

آج بھی یہ سب چیزیں بحمد اللہ مسلمانوں میں جاری ہیں مگر جہالت و ناواقفیت سے ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبری ہے صبح اور عصر کی نماز کے بعد عام طور پر ائمۂ مساجد قبلہ کی جانب سے مڑ کر تو بیٹھ جاتے ہیں مگر اس پر نظر نہیں کہ مڑنا کس غرض سے تھا کہ عملاً اس کا اعلان کر دیں کہ اب فرض ختم ہو چکے، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے، مگر یہاں پوری جماعت کو پابند کر لیا ہے کہ جب تک تین مرتبہ دعا جماعت کے ساتھ نہ کرلیں اس وقت تک سب منتظر رہیں۔ پھر ان دعاؤں میں بھی خاص خاص چیزوں کی ایسی پابندی ہے جیسے کوئی فرض ہو، جب تک وہ خاص دعائیں نہ پڑھی جائیں عوام یوں سمجھتے ہیں کہ نماز کا کوئی جزء رہ گیا۔

یہ رسول کریم ﷺ کی تعلیمات اور شریعت اسلامیہ کی احتیاط کی صریح مخالفت ہے، دعاؤں اور وظیفوں کو نماز فرض کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ وظیفے اور دعائیں بھی گویا نماز کا جزو ہیں جو امام یہ دعائیں اور وظائف تمام مقتدیوں کو ساتھ لے کر نہ پڑھے اس کی نماز کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔

بدعتِ حسنہ اور سیئہ

صحیح حدیث میں ہے کہ کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار ''یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاحِ شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے، کسی بدعت اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ لغوی معنی میں نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعتِ حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد مبارک میں نہیں تھی بعد میں کسی ضرورت کی بناء پر ان کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کہ اصل بنیاد تعلیم و تدریس اور مدرسہ کی تو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے آپ نے خود فرمایا انما بعثت معلماً یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں لیکن جسطرح کے مدارس کا قیام جس طرح کی تعلیم آج کل بضرورت زمانہ ضروری ہوگئی، آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی، آج ضرورت پیش آئی تو احیائے سنت کے لئے اس کو اختیار کیا گیا، جو تعریف بدعت کی اوپر لکھی جا چکی ہے اس کی رو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں، لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعت حسنہ [1]

[1] صرف لغوی اعتبار سے ورنہ حدیث میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے وہاں ہر بدعت کو گمراہی کہا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)۔

ہی کہا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تراویح کی یکجا جماعت کو دیکھ کر اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا: نعمت البدعة هذه. یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے۔ کیونکہ ان کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی اس لئے حقیقۃً اور شریعۃً تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص عذر کیوجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا جو بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق کیا گیا۔ اس لئے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام بھی نیا تھا اس کو نعمت البدعۃ فرما دیا۔ بدعت حسنہ کا اس سے زائد کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: من ابتدع بدعة يراها حسنة فقد زعم ان محمدا صلى الله عليه وسلم خان الرسالة لان الله تعالىٰ يقول اليوم اكملت لكم دينكم" فمالكم يومئذ دينا لايكون اليومُ دينا. (اعتصام ص ۴۸ ج ۱)

فاروقِ اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعت حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لئے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں۔ بعض سخت حرام قریب شرک کے ہیں بعض مکروہ تحریمی، بعض تنزیہی۔

قرآن وحدیث اور آثار صحابہ وتابعین وائمہ دین میں بدعات ومحدثات کی خرابی اور ان سے اجتناب کی تاکید پر بے شمار آیات وروایات ہیں ان میں سے بعض اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

بدعت کی مذمت قرآن وحدیث میں

علامہ شاطبی نے کتاب "الاعتصام" میں آیات قرآنیہ کافی تعداد میں اس موضوع پر جمع فرمائی ہیں۔ ان میں سے دو آیتیں اس جگہ لکھی جاتی ہیں۔

❶ ولا تکونوا من المشرکین ہ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا کل حزب بمالدیھم فرحون.

مت ہو مشرکین میں سے جنہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اپنے دین کو اور ہو گئے فرقے اور پارٹیاں۔ ہر ایک پارٹی اپنے طرز پر خوش ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ اس سے مراد اہل بدعت کی پارٹیاں ہیں۔ (الاعتصام ص ۶۵ ج ۱)

❷ قل ھل ننبئکم بالأخسرین اعمالاً الذین ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا

آپ فرمایئے کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ کون لوگ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں، وہ لوگ جن کی سعی وعمل دنیا کی زندگی میں ضائع اور بیکار ہو گئی اور وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا عمل کر رہے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے تفسیر اخسرین اعمالاً اہل بدعت سے کی ہے اور بلاشبہہ اس آیت میں اہل بدعت کی حالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خود تراشیدہ اعمال کو نیکی سمجھ کر خوش ہیں کہ ہم ذخیرہ آخرت حاصل کر رہے ہیں حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک ان کے اعمال کا نہ کوئی وزن ہے نہ ثواب بلکہ الٹا گناہ ہے۔

روایاتِ حدیث بدعت کی خرابی اور اس سے روکنے کے بارہ میں بے شمار ہیں ان میں سے بھی چند روایات لکھی جاتی ہیں۔

❶ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔

من احدث فی امرنا مالیس منہ فھو رد (اعتصام بحوالۂ بخاری)

جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے

❷ اور مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلالة اخرجه مسلم وفی روایة النسائی کل محدثة بدعة و کل بدعة فی النار (اعتصام ص ۷۶ ج ۱)

حمد وصلوٰۃ کے بعد سمجھو کہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ اور طرز عمل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ اور طرز عمل ہے۔ اور بدترین چیز نوایجاد بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ہر نوایجاد عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یہی خطبہ دیا کرتے تھے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود اپنے خطبہ میں الفاظ مذکورہ کے بعد یہ بھی فرماتے تھے۔ انکم ستحدثون ویحدث لکم فکل محدثة ضلالة و کل ضلالة فی النار.

(اعتصام ص ۷۶ ج ۱)

تم بھی نئے نئے کام نکالو گے اور لوگ تمہارے لئے نئی نئی صورتیں عبادت کی نکالیں گے خوب سمجھ لو کہ ہر نیا طریقہ گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

❸ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من دعا الی الهدی کان لهٗ من اجر مثل اجور من یتبعه لاینقص ذالك من اجورهم شیئا ومن دعاا لی ضلالة کان علیه من الاثم مثل اٰثام من یتبعهٗ لاینقص ذالك من اٰثامهم شیئا.

ترجمہ: جو شخص لوگوں کو صحیح ہدایت کی طرف بلائے تو ان تمام لوگوں کے عمل کا

ثواب اسکو ملے گا جو اس کا اتباع کریں بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اس پر ان سب لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس کا اتباع کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

بدعات کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے والے اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے اس کے انجام بد پر غور کریں کہ اس کا وبال تنہا اپنے عمل ہی کا نہیں بلکہ جتنے مسلمان اس سے متاثر ہوں گے ان سب کا وبال بھی ان پر ہے۔

۴ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ہمیں خطبہ دیا جسمیں نہایت مؤثر اور بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل ڈر گئے۔ بعض حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ! آج کا وعظ تو ایسا ہے جیسے رخصتی وصیت ہوتی ہے تو آپ ہمیں بتلائیں کہ ہم آئندہ کس طرح زندگی بسر کریں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللّٰہ والسمع والطاعة لولاة الامروان کان عبدا حبشیا فان من یعیش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنّتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین، تمسکوابها وعضّوا علیها بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة. (اعتصام)

ترجمہ: میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرنے کی اور حُکّامِ اسلام کی اطاعت کرنے کی۔ اگرچہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بڑا اختلاف دیکھیں گے اسلئے تم میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو اختیار کرلو اور اسکو مضبوط پکڑو۔ اور دین میں نوایجاد طریقوں سے بچو کیونکہ ہر نوایجاد طرز عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی۔

۵ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ:
جو شخص کسی بدعتی کے پاس گیا اور اس کی تعظیم کی تو گویا اس نے اسلام کو ڈھانے میں اس کی مدد کی۔" (اعتصام الشاطبی ص ۸۴ ج ۱)

۶ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اگر تم چاہتے ہو کہ پل صراط پر تمہیں دیر نہ لگے اور سیدھے جنت میں جاؤ تو اللہ کے دین میں اپنی رائے سے کوئی نیا طریقہ نہ پیدا کرو۔ (الاعتصام)

۷ آجری کی کتاب السنہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذاحدث فی امتی البدع وشتم اصحابی فلیظھر العالم علمه فمن لم یفعل فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین (اعتصام ص ۸۸ ج ۱)

جب میری امت میں بدعات پیدا ہو جائیں اور میرے اصحاب کو برا کہا جائے تو اس وقت کے عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کریگا تو اس پر لعنت ہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔

عبداللہ بن حسن نے فرمایا کہ میں نے ولید بن مسلم سے دریافت کیا کہ حدیث میں اظہار علم سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اظہار سنت"

۸ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

"مسلمانوں کے لئے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اس پر ترجیح دینے لگیں جو ان کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں،

سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اہل بدعت ہیں۔

۹ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

''خدا کی قسم آئندہ زمانہ میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص اس بدعت کو ترک کریگا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سنت چھوڑ دی۔'' (اعتصام ص۱۹۰ ج۱)

۱۰ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

''اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو، پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو، اس چیز کو اختیار کرو جو از روئے سنت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اس کو چھوڑو۔''

۱۱ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:۔

''آئندہ لوگوں پر کوئی نیا سال نہ آئے گا جس میں وہ کوئی بدعت ایجاد نہ کریں گے اور کسی سنت کو مردہ نہ کردیں گے یہانتک کہ بدعتیں زندہ اور سنتیں برباد ہوجائیں گی۔

(اعتصام ص۹۵ ج۱)

۱۲ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔

''بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ نماز میں مجاہدہ کرتا جائے اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے نیز حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صاحبِ بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کردے گا۔''

۱۳ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول وعمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں جب تک کہ وہ سنت کے مطابق نہ ہو۔''

۱۴ ابوعمرو شیبانی فرماتے ہیں کہ:

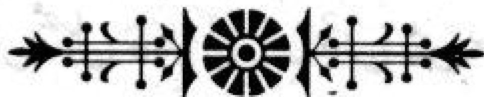
''صاحب بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوتی (کیونکہ وہ تو اپنے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا توبہ کیسے کرے)''۔

۱۵ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور تمام علماءِ وقت کے نزدیک ہمیشہ یادر کھنے کے قابل ہے!

سن رسول الله صلى الله عليه وسلم سننا وولاة الامر من بعده سننا الاخذبها تصديق لكتاب الله واستكمال لطاعة الله وقوة على دين الله ليس لاحد تغيرها ولاتبديلها ولا النظر فى شيئ خالفها من عمل بها مهتدومن انتصربها منصور ومن خالفها اتبع غير سبيل المؤمنين وولاة الله تولىّ واصلاه جهنم وسآءت مصير"

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں ان کو اختیار کرنا کتاب اللہ کی تصدیق اور اطاعتِ الٰہی کی تکمیل اور اللہ کے دین میں قوت حاصل کرنا ہے۔ نہ ان میں تغیّر کرنا کسی کے لئے جائز ہے نہ بدلنا اور نہ اس کے خلاف کسی چیز پر نظر کرنا جو ان پر عمل کریگا ہدایت پائیگا، جو ان سنتوں کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد حاصل کرنا چاہے گا اس کی مدد ہوگی اور جو ان کے خلاف کرے اس نے مسلمانوں کے راستہ سے مخالف راستہ اختیار کیا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اسکی تجویز واختیار پر چھوڑ دے گا اور پھر جہنم میں چلا جائے گا اور جہنم بُرا ٹھکانا ہے۔

(ماہنامہ فاران کراچی جون ۱۹۵۷ء)



ترجمہ وترتیب:۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

بدعات ومحدثات

حضرات صوفیائے کرام کی نظر میں

بدعات ومحدثات کے ایجاد کرنے والے اور اُن پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیائے کرام اور مشائخِ طریقت کی پناہ لیتے ہیں۔ اور اُنہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ طریقت وشریعت دو۲ متضاد چیزیں ہیں۔ بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں، اہل طریقت اُن کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد دین وایمان کی خیر نہیں۔ کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے۔ جب اُس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا۔ تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے۔

اسی لئے مناسب معلوم ہوا کہ حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ کے ارشادات بدعات کی مذمت اور اتباعِ سنّت کی تاکید میں بقدر کفایت جمع کر دیئے جائیں، تاکہ عوام اس دھوکہ سے بچ جائیں کہ مشائخ طریقت بدعات کو مذموم نہیں سمجھتے، یا اتباعِ سنّت میں متساہل ہیں۔

اس سلسلہ کے لئے علامہ شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب الاعتصام ص ۱۰۶ جلد اوّل میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس میں صوفیائے متقدمین کے ارشادات دربارۂ مذمت بدعات جمع کئے ہیں۔ ہمارے لئے اُن کا ترجمہ کر دینا کافی ہے۔

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

''جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے، اُس کو حکمت نصیب نہیں ہوتی۔''

حضرت ابراھیم بن ادھم:۔

آپ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دعا قبول فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔فرمایا اُدْعُوْنِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔مگر ہم بعض اہم کاموں کے لئے زمانہ دراز سے دعا کررہے ہیں، قبول نہیں ہوتی اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارے قلوب مر چکے ہیں۔اور مردوں کی دعا قبول نہیں ہوتی اور موت قلوب کی دس ۱۰ اسبب ہیں:۔

اوّل یہ کہ تم نے حق تعالیٰ کو پہچانا، مگر اُس کا حق ادا نہیں کیا۔

دُوسرے تم نے کتاب اللہ کو پڑھا اور اُس پر عمل نہیں کیا۔

تیسرے تم نے رسول اللہ ﷺ کی محبّت کا دعویٰ تو کیا۔مگر آپ کی سنّت کو چھوڑ بیٹھے۔

چوتھے شیطان کی دشمنی کا دعویٰ کیا، مگر اعمال میں اُس کی موافقت کی۔

پانچویں تم کہتے ہو کہ ہم جنّت کے طالب ہیں۔مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتے۔

اسی طرح پانچ چیزیں اور شمار کرائیں۔غرض اس حکایت کی نقل سے یہ ہے کہ حضرت ابراھیم ابن ادھم رحمہ اللہ تعالیٰ ترکِ سنّت کو موتِ قلب کا سبب قرار دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

حق تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ اخلاق واعمال اور تمام امور اور وسنن میں حبیب اللہ ﷺ کا اتباع کیا جائے اور فرمایا کہ لوگوں کے فساد کا سبب چھ ۶ چیزیں ہیں:

اوّل یہ کہ عملِ آخرت کے متعلق اُن کی ہمتیں اور نیتیں پست اور ضعیف ہوگئیں۔

دُوسرے یہ کہ اُن کے لئے نفوس اُن کی خواہشات کا گھوارہ بن گئے۔

تیسرے یہ کہ اُن پر طولِ اَمل غالب آ گیا، یعنی دُنیوی سامان میں قرنوں اور برسوں کا انتظام کرنے کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ عمر اُن کی قلیل ہے۔

چوتھے یہ کہ انہوں نے مخلوق کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا پر ترجیح دے رکھی ہے۔

پانچویں یہ کہ وہ اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے تابع ہوگئے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنّت کو چھوڑ بیٹھے۔

چھٹے یہ کہ مشائخ سلف اور بزرگانِ متقدمین میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش صادر ہوگئی، تو اُن لوگوں نے اُسی کو اپنا مذہب بنالیا اور اُن کے فعل کو اپنے لئے حجت سمجھا۔ اور اُن کے باقی تمام فضائل ومناقب کو دفن کردیا۔

ایک شخص کو آپ نے نصیحت فرمائی کہ تمہیں چاہئے کہ سب سے زیادہ اہتمام اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرائض وواجبات کے سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے کا کرو۔ اور جس چیز سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں منع کیا ہے، اُس کے پاس نہ جاؤ۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عبادت کا وہ طریقہ جو اُس نے خود تعلیم فرمایا ہے، اُس طریقہ سے بہت بہتر ہے، جو تم خود اپنے لئے بناتے ہو۔ اور یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے لئے اس میں زیادہ اجر وثواب ہے۔ جیسے بعض لوگ خلاف سنّت، رہبانیت کا طریقہ اختیار کرلیتے ہیں۔

بندہ کا فرض یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آقا کے حکم پر نظر رکھے، اور اسی کو اپنے تمام معاملات میں حکم بنائے۔ اور جس چیز سے اُس نے روک دیا ہے، اُس سے بچے۔

آجکل لوگوں کو حلاوتِ ایمان اور طہارت باطن سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ فرائض وواجبات کو معمولی باتیں سمجھ کر اُن کا اتنا اہتمام نہیں کرتے، جتنا کرنا چاہیئے۔

حضرت بشر حافی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

میں ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے بشر! تم جانتے ہو کہ تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے سب اقران پر فوقیت وفضیلت کس سبب سے دی ہے؟ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں واقف نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ تم میری سنّت کا اتباع کرتے ہو۔ اور نیک لوگوں کی عزت کرتے ہو۔ اور اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کرتے ہو۔ اور میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اہلبیت سے محبت رکھتے ہو۔

حضرت یحیٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

لوگوں کے تمام اختلافات کی اصل تین چیزیں ہیں۔ اور اُن تینوں کی تین ضدیں ہیں۔ جو شخص ایک اصل سے علیحدہ ہے، اُس کی ضد میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

وہ تین اصل یہ ہیں:۔

ایک توحید اور اُس کی ضد شرک ہے۔ دوسرے سنّت اور اس کی ضد بدعت ہے۔ تیسرے طاعت، اس کی ضد معصیت ہے۔

حضرت ابوبکر دقاق رحمہ اللہ تعالیٰ:۔

حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہ جو حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ کے اقران میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اُس میدان میں گزر رہا تھا، جہاں چالیس سال تک اسرائیل قدرتی طور پر محصور رہے۔ اور نکل نہ سکتے تھے۔ جس کو وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے، اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ علمِ حقیقت علم شریعت سے مخالف ہے۔ اچانک مجھے غیبی آواز آئی:۔

كل حقيقة لاتتبع الشريعة فهي كفر

جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے۔

حضرت ابوعلی جوز جانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

بندہ کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ اُس پر خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت آسان ہو جائے اور اُس کے افعال مطابق سنّت ہو جائیں۔ اور اس کو نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہو جائے۔ اور اپنے احباب واخوان کے ساتھ اُس کو حُسن اخلاق کی توفیق ہو اور خلق اللہ کے لئے اُس کا نیک سلوک عام ہو۔ اور مسلمانوں کی غمخواری اس کا شیوہ ہو اور اپنے اوقات کی نگہداشت کرے، یعنی ضائع ہونے سے بچائے۔

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ اتباع سنت کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ بدعات سے اجتناب اور اُن عقائد اور احکام کا اتباع، جس پر علمائے اسلام کے صدر اوّل کا اجماع ہے اور اُن کی اقدار کو لازم سمجھنا۔

حضرت ابوبکر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

کمالِ ہمّت اس کے تمام اوصاف کے ساتھ سوائے اہل محبّت کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ درجہ اُن کو محض اتباع سنّت اور ترک بدعت کی وجہ سے حاصل ہوا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے زیادہ صاحبِ ہمّت اور سب سے زیادہ ساعی الی اللہ تھے۔

ہمّت اصطلاح صوفیہ میں توجہ اور تصرف کو کہتے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی تخیّل کی قوّت کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کی طرف جمع کرے، اس جگہ ممکن ہے کہ یہی مراد ہو مگر آنحضرت ﷺ سے تصرف اور ہمت اصطلاح کے استعمال کا صدور کہیں صراحۃً ثابت نہیں۔ اس لئے غالباً اس جگہ ہمّت کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی دین کے کاموں میں چُستی اور مضبوطی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

حضرت ابوالحسن ورّاق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

بندہ اللہ تک صرف اللہ ہی کی مدد اور اُس کے حبیب ﷺ کی اقتداء فی

الأحکام کے ذریعہ سے پہنچ سکتا ہے اور جو شخص وصول الی اللہ کے لئے سوائے اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے تو ہدایت حاصل کرنے کی خاطر گمراہ ہو گیا۔

حضرت ابومحمد عبدالوہاب ثقفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اللہ تبارک وتعالیٰ صرف وہی اعمال قبول فرماتے ہیں جو صواب ودرست ہوں۔ اور صواب ودرست میں بھی صرف وہی اعمال مقبول ہیں جو خالص اسی کے لئے ہوں اور خالص میں بھی صرف وہی مقبول ہیں جو سنّت کے مطابق ہوں۔

حضرت ابراہیم بن شیبان رحمہ اللہ تعالیٰ:

یہ بزرگ حضرت ابوعبداللہ مغربی اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب میں سے تھے، بدعات سے سخت متنفر اور مبتدعین پر سخت رد کرنے والے، کتاب وسنت کے طریقہ پر مضبوطی سے قائم اور مشائخ ائمہ، متقدمین کے طرز کا التزام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن منازل اُن کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن شیبان رحمہ اللہ تعالیٰ تمام فقراء اور اہل آداب ومعاملات پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حجّت ہے۔

حضرت ابوعمر زجاجی رحمہ اللہ تعالیٰ:

یہ عباد وزہاد کے مشہور امام حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصحاب میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اُن چیزوں کا اتباع کرتے تھے جن کو اُن کی عقلیں مستحسن سمجھتی تھیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تو آپ نے اُن کو اتباع شریعت کا ارشاد فرمایا۔ پس عقل صحیح وسلیم وہی ہے جو مستحسنات شرعیہ کو اچھا اور مکروہات شرعیہ کو ناپسند سمجھے۔

حضرت ابو یزید بسطامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

میں نے تین سال مجاہدات کئے مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباع علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہوا۔ اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں مصیبت میں پڑ جاتا۔ بلاشبہ علماء کا اختلاف رحمت ہے (مگر وہ اختلاف جو تجرید توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں۔) اور اتباع صرف اتباع سنت کا نام ہے۔ کیونکہ علم سنت کے علاوہ دوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ اُن کے وطن تشریف لائے۔ شہر میں اُن کی ولایت و بزرگی کا چرچا ہوا۔ حضرت ابو یزید رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے بھی زیارت کا قصد کیا۔ اور اپنے ایک رفیق سے کہا کہ چلو اُن بزرگ کی زیارت کر آئیں۔ ابو یزید رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اپنے رفیق کے ساتھ اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ بزرگ گھر سے نماز کے لئے نکلے، جب مسجد میں داخل ہوئے تو جانبِ قبلہ میں تھوک دیا۔ ابو یزید رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ یہ حالت دیکھتے ہی واپس ہو گئے اور اُن کو سلام بھی نہ کیا۔ اور فرمایا: یہ شخص نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے، اس سے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کوئی ولی اللہ ہو۔

امام شاطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اس واقعہ کو کتاب الاعتصام میں نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو یزید رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا یہ ارشاد ایک اصل عظیم ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تارک سنّت کو درجۂ ولایت حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ ترک سنّت بوجہ ناواقف ہونے کے ہوا ہو۔

اب آپ اندازہ کریں کہ جو علانیہ ترک سنت اور احداث بدعت پر مُصر ہوں، اُن کو بزرگی اور ولایت سے کوئی دُور کا واسطہ بھی ہو سکتا ہے؟

نیز ابو یزید رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی شخص کی کُھلی کُھلی کرامات دیکھو۔ یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگے، تو اُس سے ہرگز دھوکا نہ کھاؤ، اور اُس کی

بزرگی وولایت کے اس وقت تک معتقد نہ ہو، جب تک کہ یہ نہ دیکھ لو کہ امرونہی اور جائز وناجائز اور حفاظت حدود اور آدابِ شریعت کے معاملہ میں اُس کا کیا حال ہے۔

حضرت سہل تستری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

بندہ جو فعل بغیر اقتداء (رسول) کے کرتا ہے، خواہ وہ (بصورت) طاعت ہو یا معصیت، وہ عیش نفس ہے۔ اور جو فعل اقتداء واتباع سے کرتا ہے۔ وہ نفس پر عتاب اور مشقت ہے۔ کیونکہ نفس کی خواہش کبھی اقتداء واتباع میں نہیں ہوسکتی۔ اور اصل مقصود ہمارے طریق (یعنی سلوک) کا یہی ہے۔ کہ اتباعِ ہوا سے بچیں

نیز فرمایا کہ ہمارے (یعنی صوفیائے کرام کے) اصول سات ۷ ہیں۔

① کتاب اللہ کے ساتھ تمسک۔

② سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء۔

③ اکلِ حلال (یعنی کھانے پینے اور استعمال کرنے میں اس کا لحاظ کہ کوئی چیز حرام وناجائز نہ ہو)

④ لوگوں کو تکلیف سے بچانا۔

⑤ گناہوں سے بچنا۔

⑥ توبہ۔

⑦ ادائے حقوق۔

نیز ارشاد فرمایا کہ تین چیزوں سے مخلوق مایوس ہوگئی:۔

① توبہ کا التزام۔

② سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع۔

③ مخلوق کو اپنی ایذا سے بچانا۔

نیز کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ فتوت (عالی ظرفی) کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ اتباعِ سنت۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رَحمہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

بسا اوقات میرے قلب میں معارف وحقائق اور علوم صوفیاء میں سے کوئی خاص نکتۂ عجیبہ وارد ہوتا ہے اور ایک زمانۂ دراز تک وارد ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں اس کو دو۲ عادل گواہوں کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا۔ اور وہ عادل گواہ کتاب وسنّت ہیں۔

حضرت احمد بن ابی الحواری رَحمہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

جو شخص کوئی عمل بلا اتباع سنت کے کرتا ہے، اُس کا عمل باطل ہے۔

حضرت ابو حفص حداد رَحمہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

جو شخص ہر وقت اپنے احوال وافعال کو کتاب وسنت کی میزان میں وزن نہیں کرتا اور اپنے خواطر (وارداتِ قلبیہ) کو متہم (نا قابلِ اطمینان) نہیں سمجھتا۔ اس کو مردانِ راہ تصوف میں شمار نہ کرو۔ نیز آپ سے بدعت کی حقیقت دریافت کی گئی، تو فرمایا۔ کہ احکام میں تعدی، یعنی شرعی حدود سے تجاوز کرنا، اور تہاون فی السنن یعنی آنحضرت ﷺ کی سنّتوں کے اتباع میں سُستی کرنا۔ اور اتباع الآراء والاھواء یعنی اپنی خواہشات اور (غیر معتبر) آراء رجال کی پیروی اور ترک الاتباع والاقتداء یعنی سلف صالح کے اتباع واقتداء کو چھوڑنا اور کبھی کسی صوفی کو کوئی حالتِ رفیعہ بغیر امر صحیح کے اتباع کے حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت حمدون قصّار رَحمہُ اللہُ تَعالیٰ:

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگوں کے اعمال پر احتساب اور دار وگیر کسی شخص کے لئے کس وقت جائز ہوتی ہے؟ فرمایا۔ جب وہ یہ سمجھے کہ یہ احتساب اور امر بالمعروف مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔ فرض ہونے کی صورت یہ ہے کہ جس کو امر بالمعروف کیا جائے، وہ اس کا ماتحت اور تحت القدرت ہو، یا یہ یقین ہو کہ وہ ہماری بات مان لے گا۔ وغیر ذالک۔ یا یہ خوف ہو کہ کوئی انسان بدعت میں مبتلاء ہو کر

ہلاک ہو جائے گا۔ اور اس کو یہ گمان ہے کہ ہمارے کہنے سننے سے اُس کو نجات ہو جائے گی۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص سلف صالح کے احوال پر نظر ڈالتا ہے۔ اُس کو اپنا قصور اور مردانِ راہ خدا کے درجات سے اپنا پیچھے رہنا معلوم ہو جاتا ہے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غرض اس کلام کی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ لوگوں کو سلف صالح کی اقتداء کی ترغیب دیں کیونکہ یہی حضرات اہل سنّت ہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ:۔

آپ کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ عارفین پر ایک حالت ایسی آتی ہے کہ وہ تمام حرکات واعمال چھوڑ کر تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہیں۔ حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اُن لوگوں کا قول ہے، جو اسقاطِ اعمال کے قائل ہیں۔ اور فرمایا کہ میں تو اگر ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں، تو اپنے اختیار سے اعمال (طاعات وعبادات) میں سے ایک ذرّہ بھی کم نہ کروں۔ ہاں مغلوب ومجبور ہو جاؤں تو وہ دوسری بات ہے۔

اور فرمایا کہ وصول الی اللہ کے جتنے راستے عقلاً ہو سکتے ہیں۔ وہ سب کے سب بجز اتباع آثار رسول اللہ ﷺ کے تمام مخلوق پر بند کر دیئے گئے ہیں۔ (یعنی بغیر اقتداء رسول اللہ ﷺ کے کوئی شخص ہرگز تقرب الی اللہ حاصل نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ کرے وہ کاذب ہے)

اور فرمایا کہ ہمارا یہ مذہب (یعنی سلوک وتصوف) کتاب وسنّت کے ساتھ مقیّد ہے۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کو حفظ نہ کرے اور حدیث رسول ﷺ کو نہ دیکھے۔ اس معاملہ (یعنی تصوف) میں اُس کی اقتداء نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا علم

کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔ اور فرمایا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابوعثمان حیسری رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

اللہ تَبارَکَ وَتَعالیٰ کے ساتھ معیت وصحبت تین چیزوں سے ہوتی ہے ایک ❶ حُسن ادب۔ دوسرے ❷ دوامِ ہیبت، تیسرے ❸ مراقبہ۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحبت ومعیت اتباعِ سنت اور ظاہر شریعت کے التزام سے حاصل ہوتی اور اولیاء اللہ کی صحبت ادب واحترام اور خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی وفات کے وقت آپ کا حال متغیر ہوا۔ تو صاحبزادہ نے بوجہ شدّتِ غم والم کے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، ابوعثمان رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ نے آنکھ کھولی۔ اور فرمایا۔ بیٹا! ظاہر اعمال میں خلاف سنّت کرنا یہ باطن میں ریا ہونے کی علامت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس پر قول وفعل میں سنّت کو حاکم بنائے گا، وہ حکمت کے ساتھ گویا ہوگا۔ اور جو قول وفعل میں خواہشات ہوا کو حاکم بنائے گا، وہ بدعت کے ساتھ گویا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وان تطیعوہ تھتدوا. یعنی اگر تم نبی کریم ﷺ کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے۔

حضرت ابوالحسین نووی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں:۔

جس کو تم یہ دیکھو کہ تقرب الی اللہ میں وہ کسی ایسی حالت کا مدعی ہے جو اس کو علم شرعی کے حد سے نکال دے تو تم اُس کے پاس نہ جاؤ۔

حضرت بن فضل بلخی رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

اسلام کا زوال چار چیزوں سے ہے:۔

❶ لوگ علم پر عمل نہ کریں۔

❷ علم کے خلاف عمل کریں۔

❸ جس چیز کا علم ہو، اس کو حاصل نہ کریں۔

④ لوگوں کو علم حاصل کرنے سے روکیں۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تو اُن کا ارشاد ہے اور ہمارے زمانہ کے صوفیوں کا عام طور سے یہی حال ہوگیا اور فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا وہ شخص ہے، جو اُس کے اوامر کے اتباع میں سب سے زیادہ مجاہدہ کرتا ہو۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ متبع ہو۔

حضرت شاہ کرمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

جو شخص اپنی نظر کو محارم سے محفوظ رکھے۔ اور اپنے نفس کو شبہات سے بچائے اور اپنے باطن کو دوام مراقبہ کے ساتھ معمور کرے اور ظاہر کو اتباعِ سنّت سے آراستہ کرے اور اپنے نفس کو اکلِ حلال کی عادت ڈالے۔ تو اُس کی فراست میں کبھی خطا نہیں ہوسکتی۔

ابوسعید خزّاز رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

ظاہر شریعت جس باطنی حالت کا مخالف ہو وہ باطل ہے۔

ابو العباس ابن عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ:

جو سید الطائفہ حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ کے اقران میں سے ہیں، فرماتے ہیں جو شخص اپنے نفس پر آداب الٰہیہ کو لازم کرلے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے قلب کو نور معرفت سے منوّر فرمادیتا ہے۔ اور کوئی مقام اُس سے اعلیٰ واشرف نہیں ہے، کہ بندہ حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور اعمال واخلاق میں اُن کا متبع ہو۔ نیز فرمایا کہ سب سے بڑی غفلت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے اوامر واحکام سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے آداب معاملہ سے غافل ہو۔

ابراہیم خوّاص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

علم کثرت روایت کا نام نہیں۔ بلکہ عالم صرف وہی شخص ہے جو اپنے علم کا متبع ہو اور اس پر عمل کرے۔ اور سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرے۔ اگرچہ اس کا علم تھوڑا

ہو۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ عافیت کیا چیز ہے؟ فرمایا:۔

"دین بلا بدعت وعمل بلا آفت وقلب بلا شغل ونفس بلا شہوت!"

دین بغیر بدعت کے اور عمل بغیر آفت کے یعنی بدعات ومخترعات کی آفتیں اُس میں شامل نہ ہوں اور قلب فارغ جس کو (غیر اللہ کا) شغل نہ ہو۔ اور نفس جس میں شہوت کا (غلبہ) نہ ہو۔! اور فرمایا کہ حقیقی صبر یہ ہے کہ احکام کتاب وسنت ہر مضبوطی سے قائم رہو۔

حضرت بنان حمال رحمہ اللہ تعالیٰ:۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ احوالِ صوفیہ کی اصل کیا ہے۔ فرمایا۔ چار چیزیں:۔

اوّل۔ جس چیز کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے۔ اُس میں اُس پر اعتماد وتوکل کرنا (یعنی رزق)۔

دوم۔ احکام الٰہیہ پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

سوم۔ قلب کی حفاظت (لایعنی تفکرات سے)۔

چہارم: کونین سے فارغ ہو کر توجہ محض ذاتِ حق کی طرف رکھنا۔

حضرت ابوحمزہ بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔

جس شخص کو حق کا صحیح راستہ معلوم ہو جاتا ہے اُس کو اُس پر چلنا بھی سہل ہو جاتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کے لئے کوئی رہبر ورہنما بجز سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احوال وافعال واقوال میں متابعت کے نہیں ہے۔

ابواسحاق رقاشی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ میں حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہوں، یا نہیں۔ تو علامت اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طاعت اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مطابعت کو سب کاموں پر ترجیح دے۔ اور دلیل اس کی

حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:۔

قل ان کنتم تحبو ن اللّٰہ فاتبعو نی یحببکم اللہ!

حضرت ممشاد دینوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

آداب مرید کا خلاصہ یہ ہے کہ مشائخ کے احترام وعظمت کا التزام کرے اور اخوانِ طریقت کی حرمت کا خیال رکھے۔ اور اسباب کی فکر میں (زیادہ) نہ پڑے اور آداب شریعت کی اپنے نفس پر پوری حفاظت کرے۔

ابوعلی روزباری قدس سرہٗ۔

آپ سے کسی نے ذکر کیا۔ بعض صوفیاء غناومزامیر سنتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے حلال ہے، کیونکہ میں ایسے درجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھ پر اختلاف احوال کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے یہ تو سچ کہا کہ وہ پہنچ گیا ہے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ تک نہیں، بلکہ جہنم تک۔

ابومحمد عبداللہ بن منازل رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

جو شخص فرائضِ شرعیہ میں سے کسی فریضہ کو ضائع کرتا ہے اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ سنن کی اضاعت میں مبتلاء فرمادیتا ہے اور جو شخص سنن کی اضاعت میں مبتلا ہوتا ہے وہ بہت جلد بدعات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

ابویعقوب نہر جوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

صوفی کا افضل ترین حال وہ ہے، جو علم شریعت سے زیادہ قریب ہو۔

ابوعمرو بن نجید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

جوحال علم کا نتیجہ نہ ہو، اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے!

حضرت بندار بن الحسین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

اہلِ بدعت کی صحبت حق سے اعراض پیدا کردیتی ہے۔

ابو بکر طمستانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

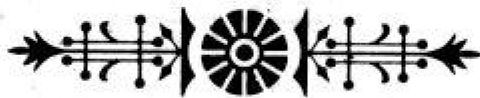
طریق تصوف کھلا ہوا ہے۔ اور کتاب وسنت ہمارے درمیان قائم ہے۔ اور فضیلت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بوجہ سبقت فی الہجرت اور صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلوم ہے۔ پس ہم میں سے جو شخص کتاب وسنت کا ساتھ دے۔ اور اپنے نفس اور مخلوق سے جدا ہو جائے اور اپنے دل سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہجرت کرے، صرف وہی شخص صادق اور مصیب ہے۔

ابو القاسم نصر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

تصوف کی اصل صرف کتاب وسنت کا التزام اور بدعات وہوا سے اجتناب اور مشائخ طریقت کی عظمت واحترام اور خلق اللہ کے اعذار پر نظر، اور ان پر مداومت اور تاویلات اور رخصتوں کا ترک ہے۔

احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ یہ چالیس سے زائد مشائخ صوفیہ کے اقوال اس بارہ میں نقل کئے گئے ہیں۔ جو سمجھدار کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ اس لئے انہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ورنہ اس مقدس جماعت کے اکثر افراد سے اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔ جن کے جمع کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ حق تبارک وتعالیٰ ان حضرات کی برکت سے اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرمائیں اور بدعات ومخترعات سے بچائے اور اس ناکارہ کو بھی ان حضرات کے زمرہ میں محشور فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ فاران کراچی حصے نمبر، جون ۱۹۵۷ء)



از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مَوتُ العَالِم موتُ العالَم

(مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ)

رفیق شفیق، اخی فی اللہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور رحمہ اللہ تعالیٰ اس وقت ان چند بزرگ ہستیوں میں سے تھے جو برصغیر پاک وہند میں انگلیوں پر گنی جاتی ہیں، جو مدتوں اکابر علماء ومشائخ کی نظروں میں پلے، ان کی صحبتوں سے مستفید ہوکر آفتاب و ماہتاب بنکر چمکے، جنہوں نے کتابوں سے زیادہ استادوں کو پڑھا آج دنیا میں انکی مثالیں کہاں اور کس طرح پیدا ہوں؟ مولانا محمد ادریس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ احقر کی رفاقت نصف صدی سے زائد کی رفاقت ہے جو ۷ رجب ۱۳۹۴ھ بروز دوشنبہ آپکی وفات حسرت آیات پر ختم ہوئی۔

فانا للہ وانا الیہ راجعون ط

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے اس دور کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ جب کہ ۱۳۳۷ھ میں ہم چند نوعمروں کو بیک وقت دارالعلوم دیوبند میں خدمت درس وتدریس سپرد کی گئی ان میں مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہوکر ۱۳۲۶ھ میں دوبارہ دورۂ حدیث کے لئے حضرت الاستاد مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس دارالعلوم دیوبند قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس

طرح مکرر دورۂ حدیث سے فارغ ہوکر ۱۳۳۷ھ میں خدمت درس وتدریس پر مامور ہوئے، اس سے ایک سال پہلے ۱۳۳۵ میں احقر دورۂ حدیث سے فارغ ہوا تو ۱۳۳۶ھ میں کچھ اسباق سپرد کئے گئے اور ۱۳۳۷ھ مستقلاً درس وتدریس کی خدمت پر مامور کیا گیا، ہم تینوں اس وقت کے نوعمر بچے تھے، جنکو اکابر اساتذہ ہی کی خدمت میں رہ کر تعلیمی خدمات انجام دینے کا موقع حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند ائمہ فن علماء اور اولیاء واتقیاء کا...... ایک بے مثال گہوارہ تھا۔

ایک طرف نمونۂ سلف، قدوۃ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس دارالعلوم کا حلقہ درس، حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نووی کے حلقہ درس کی مثال تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا حلقہ درس امام غزالی اور رازی کی یادتازہ کرتا تھا، ایک طرف شیخ المشائخ کل ہند مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا حلقۂ فتوی و درس حدیث وتفسیر اور اس کے ساتھ حلقۂ اصلاح وارشاد اور مالکانِ طریقت کی تربیت کا بے نظیر سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف یادگار سلف عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغرحسین صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعالیٰ کا درس حدیث وفقہ اور نہایت مفید و عام تصانیف کا سلسلہ تھا اسی کے ساتھ عام اصلاح خلق کے لئے ارشاد تربیت کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے ہزارہا بندگانِ خدا کی اصلاح ہوتی تھی اور ان میں دینی انقلاب نمایاں نظر آتا تھا۔

شیخ الأدب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اُس زمانے کے متوسط مدرسین میں شمار ہوتے تھے۔ رئیس المناظرین حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن صاحب (چاند پوری) اس وقت کے ناظم تعلیمات تھے۔ حجۃ الاسلام بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم کے

صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد صاحب دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے اور اس کے ساتھ ہمیشہ ایک سبق پڑھانے کا معمول تھا۔ ہدایہ اولین کا ابتدائی حصہ احقر نے انہیں سے پڑھا تھا۔ نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھے جن کے عربی قصائد اور عظیم الشان تصنیف ''دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا'' ہر طبقے کے علماء میں قبول عام حاصل کر چکے ہیں، غرض جس طرف دیکھو یہ بزرگان سلف کے نمونے پیکرِ علم وعمل ستاروں کی طرح درخشاں نظر آتے تھے۔ جن کے چہرے دیکھ کر خدایاد آتا تھا ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ؎

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

کسی شخص پر ان حضرات کی توجہ اور نظرِ عنایت ہو جانا بلاشبہ حق تعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر تھا۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس کے فضل سے ان سب بزرگوں کی نظرِ انتخاب نے ہم نوعمروں کو ان اکابر کی خدمت سے استفادہ کے مواقع فراہم فرمائے۔ ان حضرات نے ہم تینوں میں درس وتدریس کی خدمات کے ساتھ مسائل کی تحقیق اور علمی بحث ومباحثہ اور تصنیف وتالیف کا بھی ذوق پیدا کیا خصوصاً ۱۳۴۰ھ میں قادیانی فتنہ نے سر اٹھایا اور ان لوگوں کو یہ جرأت ہونے لگی کہ علماء کو مناظرہ اور مقابلہ کی دعوت دینے لگے۔ اس نے سنی علماء کو اس فتنہ کی روک تھام کیطرف متوجہ کیا خصوصاً حضرت الاستاد سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کے قلب مبارک میں اس کا اہتمام اس شان سے پیدا ہوا کہ جیسے کوئی مامور من اللہ کسی خاص خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ اس وقت درس وتدریس کے بعد حضرت موصوف کے تمام اوقات اسی فتنہ کے انسداد پر خرچ ہونے لگے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہم تینوں نوعمر مدرسوں کو اس کام پر لگایا کہ عقائدِ اسلامیہ کے خلاف تمام مسائل میں قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کیا جائے، مسئلہ ختم نبوت پر لکھنے کے لئے احقر کو مامور فرمایا اور نزول مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام وغیرہ کے مسائل کا کام مولانا سید بدر عالم میرٹھی اور

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے سپرد فرمایا۔ سب سے پہلے ہم تینوں میں وجہ ربط وارتباط یہ سلسلہ بنا، احقر نے حضرت اُستاد کی ہدایات کے مطابق پہلے عربی زبان میں مسئلہ ختم نبوت کی تحقیق پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام حضرت استاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے هدية المهديين في آية خاتم النبيين رکھا۔ اس کو عربی زبان میں لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ عرب بغداد وغیرہ عرب ممالک سے ایسی خبریں آتی تھیں کہ وہاں بھی ان لوگوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اس طرح کی تلبیس پھیلائی ہے پھر مزید تفصیل کے ساتھ مسئلہ ختمِ نبوت کو اُردو زبان میں تین حصوں میں لکھا۔ مولانا بدر عالم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے الكلام الفصيح في نزول المسيح کے نام سے ایک قابلِ قدر تصنیف فرمائی، مولانا محمد ادریس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے كلمة الله في حياة روح الله کے نام سے اس موضوع پر بہترین کتاب لکھی یہ سب کتابیں اسی زمانے میں چھپ کر شائع ہوئیں۔

اسی زمانے میں اکابر دارالعلوم کے ایک وفد نے جسکی قیادت اُستاد محترم حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرما رہے تھے عام مسلمانوں میں قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ملک کا دورہ کرنا تجویز کیا اس دورہ میں بھی ہم تینوں کو حضرات کا ہم سفر رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اسی زمانے میں یہ تجویز ہوا کہ سالانہ ایک جلسہ خود قادیان میں منعقد کیا جائے جس میں مرزا کے اوہامِ باطلہ کی تردید خود ان کے مرکز میں جا کر کیجائے، ان جلسوں میں بھی حضرات اکابر کے ارشاد کے مطابق ہم تینوں کو شریک رہنے کا موقع ملا۔

فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں نے مناظرہ کا چیلنج کیا تو ان کے مناظرہ کے لئے دارالعلوم کی طرف سے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سرکردگی میں ہم تینوں رفیق سفر رہے، خود حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بھی پہنچ گئے، تین روزہ یہ تاریخی مناظرہ جاری رہا۔

حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خاص توجہ اور مسلسل کوشش نے چند سال میں ایسا کر دیا تھا کہ علمی اعتبار سے مرزا ملعون اور قادیانیت نے دم توڑ دیا اور یہ لوگ مناظرہ، مباہلہ کا نام لینا چھوڑ کر زیرِ زمین سازشوں میں مشغول ہو گئے۔

اکابر دارالعلوم کی خاص نظرِ عنایت نے ہم تینوں کو ایسا مخلص رفیق بنا دیا تھا کہ نہ کبھی کوئی معاصرانہ چمک درمیان میں آئی نہ کوئی شکوہ شکایت۔

۱۳۴۶ھ کے ایک خاص واقعہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مع بعض دیگر اکابر واصاغر کے ڈابھیل تشریف لے گئے تو مولانا سید بدر عالم صاحب بھی ساتھ ہی تشریف لے گئے، دیوبند میں اب ہم تینوں میں سے احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب رہ گئے اور دیوبند میں ہماری یہ رفاقت بناء پاکستان کے وقت تک مسلسل رہی پاکستان بننے کے بعد پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم تینوں کو پاکستان جمع فرما دیا۔

اور مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ میرے پاکستان میں مستقل قیام کا سبب مولانا سید بدر عالم صاحب تھے کیونکہ احقر شروع میں جب پاکستان آیا تو ہجرت کی نیت سے نہیں بلکہ ایک کام دستورِ اسلامی کے سلسلہ میں انجام دینے کے لئے آیا تھا اسی لئے والدہ محترمہ اور اکثر عیال اس وقت تک دیوبند ہی تھے۔ رمضان ۱۳۶۸ھ میں ہمارا کام پورا ہو گیا تو میرا ارادہ واپس ہندوستان جانے کا تھا۔ یہ ماہ رمضان گرمی کے زمانے کا تھا۔ مولانا بدر عالم رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کئی مرتبہ گورا قبرستان کراچی سے میری جائے قیام وکٹوریہ روڈ پر پیدل چل کر اس لئے تشریف لائے کہ مجھے پاکستان میں مستقل قیام کے لئے تاکید کریں کیونکہ ان کی نظر میں اس وقت میرا قیام پاکستان کے لئے ضروری تھا۔ ان کی ایک مخلصانہ ہمدردانہ فہمائش ہی کی بناء پر احقر نے ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان کے مستقل قیام کا عزم کر لیا۔

مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب پاکستان تشریف لائے تو پہلے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے سربراہ کی حیثیت سے بہاولپور میں مقیم ہوئے اس عرصہ میں

بھی ملاقاتیں اور خط و کتابت ہوتی رہتی تھی پھر جلدی آپ جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث ہوکر تشریف لے آئے اور جامعہ میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دیتے ہوئے عمر گزاری کی آخری ساعات پوری فرمادیں۔ **الھم اغفر له مغفرة ظاهرة باطنة لاتغادر ذنبا۔**

قیامِ جامعہ اشرفیہ کے زمانے میں الحمد اللہ بار بار باہمی ملاقات اور مسلسل خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہمی تعلق روز بروز بڑھ رہا ہے، وہ ہر تصنیف مجھے سناتے اور چھپنے کے بعد عطا فرماتے تھے یہی سلسلہ کچھ احقر کی طرف سے جاری رہتا تھا۔ باوجود اس فوقیت کے جو اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ نے ہر علم و فن اور عمل اور اخلاق میں ان کو مجھ پر عطا فرمائی تھی اپنی تواضع کی بناء پر فتویٰ میں مجھ پر اعتماد فرماتے تھے اور میری تمام تصانیف کو اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے، وفات سے غالباً ایک سال پہلے جب میری تفسیر معارف القرآن مکمل ہوئی اور آخری آٹھویں جلد مولانا موصوف کی خدمت میں بھیجی تو اس پر اپنی انتہائی خوشنودی کا اظہار فرمایا جسکو دارالعلوم کے ماہنامہ البلاغ میں شائع کردیا گیا ہے اسی کے ساتھ ایک خط میں تحریر فرمایا کہ میں تمہاری ہر تصنیف کے دو نسخے رکھتا ہوں، اللہ نے فرمایا ہے۔ **ومن كل شي خلقنا زوجين** مولانا موصوف کی ہر مجلس میں علمی چاشنی اور قرآن و حدیث کے جملے بڑے برموقع ہوا کرتے تھے۔

ایک حج کے موقع میں اتفاقاً احقر بھی حاضر تھا، مکہ مکرمہ مدرسہ صولتیہ میں قیام تھا یہاں ہندوستان کے ایک عالم بھی ملاقات کے لئے آئے انہوں نے پاکستان کے سربراہ مملکت کے متعلق کچھ شکایت کی تو برجستہ فرمایا کہ وہ ہندوستان کے ہندو سربراہ مملکت سے بہرحال بہتر ہیں قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ **ولعبد مؤمن خير من مشرك ولو اعجبكم** اور ولو اعجبکم کے الفاظ کہتے ہوئے انکی طرف اشارہ کرکے مزید لطف بڑھادیا وہ ہندوستانی عالم بھی بے تکلف دوست تھے بہت محظوظ ہوئے،

میرے لڑکے مولوی محمد تقی سلمہ، اب سے چند ماہ پہلے لاہور گئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے بڑی شفقت کے ساتھ بٹھایا اور فرمایا کہ معاصرین میں باہم کچھ چشمک ہوا کرتی ہے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم میں اور مفتی صاحب میں کبھی اسکا نام نہیں آیا۔ جب کوئی مفتی صاحب کی تعریف ومدح کرتا ہے تو میں اس کو اپنی ہی تعریف سمجھتا ہوں کیونکہ ابن حاجب نے کافیہ میں توابع بیان کے تحت صفت کی دو قسمیں لکھیں ہیں جن میں ایک قسم صفت متعلق منعوت بھی ہے جیسے زید العالم اخوہ یعنی زید جسکا بھائی عالم ہے اس میں بھائی کے عالم ہونے کو خود زید کی صفت قرار دیا ہے تو میں مفتی صاحب کی صفت کو اپنی صفت کیوں نہ سمجھوں۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھ بے علم اور بے عمل کا تو کہنا ہی کیا مولانا کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے علمی کمالات میں اپنے بھی معاصرین میں خاص امتیاز اور تفوق عطا فرمایا تھا مگر ساتھ بزرگوں کی صحبت نے تواضع اور فروتنی کی بھی وہ صفت عطا کردی تھی جو قدیم علماء دیوبند کا خاص امتیاز تھا کہ نہ کبھی علم کے دعوے نہ دوسروں پر اپنی فوقیت کا کہیں کوئی شائبہ، مشہور مقولہ ہے کہ معاصرت مفاخرت کی بنیاد ہوتی ہے مگر اللہ والوں کی شان ان سب چیزوں سے بلند ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے مولانا موصوف کو ایسا ہی بنایا تھا جس کے آثار ان کے تمام اعمال وافعال میں ظاہر ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی کمالات بھی کبھی اپنا رنگ لاتے ہیں جب ان کے ساتھ تزکیۂ باطن اور تقویٰ وطہارت ہو، مولانا موصوف کو حق تعالیٰ نے جس طرح علمی کمالات میں فائق فرمایا تھا اسی طرح ان باطنی کمالات سے بھی مزین فرمایا تھا۔

مولانا موصوف کے عملی کمالات کا کچھ اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے حدیث کی کتاب مشکوٰۃ شریف پر آپکی مفصل شرح تو عرصۂ دراز سے علماء وطلباء میں خاص مقبولیت حاصل کرچکی ہے، بعد میں حل مشکلاتِ بخاری وغیرہ دوسری تصانیف بھی فن حدیث سے متعلق ہوتی رہیں جو آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق

ہیں۔ سیرت نبوی ﷺ کے متعلق آپ کی تصنیف سیرۃ المصطفیٰ تین جلدوں میں بہترین تصنیف ہے، قرآنِ کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ فرمایا تو معارف القرآن کے نام سے لکھنا شروع کیا بعض لوگوں نے کہا کہ اس نام کی تفسیر تو مفتی محمد شفیع صاحب کی چھپ رہی ہے تو فرمایا کہ میں اور وہ الگ الگ نہیں اسی طرح میرے رسالے دعاویٔ مرزا ہی کے نام پر اسی موضوع پر دو رسالے تصنیف فرمائے۔

افسوس ہے کہ مولانا کی تفسیر قرآن مکمل نہ ہوسکی مگر اس کی جتنی جلدیں چھپی ہیں وہ بھی اپنی جگہ علماء وطلباء کے لئے بڑا مفید ذخیرہ ہے، حق تعالیٰ قبول فرمائیں۔

مولانا کے علمی شغل اور علمی ذوق نے ہمیشہ ان کو دنیا کے ساز وسامان سے بے نیاز رکھا تھا۔ ایک روز خود مجھے فرمایا کہ میرے گھر والے کبھی کبھی مجھ سے کہتے ہیں کہ کچھ تو دنیا کا بھی خیال کرو۔ تو میں کہدیتا ہوں کہ دنیا نے میرا کیا خیال کیا ہے جو میں اس کے خیال میں مبتلا رہوں۔

دن رات کے عملی اشتغال کا یہ عالم تھا کہ میرے بڑے لڑکے مولوی محمد زکی سلمہ، جو لاہور ہی میں رہتے ہیں۔ اور مرض وفات میں تقریباً روزانہ ہی حاضر خدمت ہوتے تھے۔ وفات سے دو تین روز پہلے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ نیم بیہوشی کے عالم میں ضعف ونقاہت بے حد تھی اس حال میں آنکھ کھولی اور محمد زکی پر نظر پڑی تو پوچھا کہ حدیث کی کتاب مؤطا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا اردو ترجمہ وحید الزمان صاحب کا آپ کے پاس موجود ہے یا نہیں؟۔ محمد زکی سلمہٗ نے عرض کیا کہ وہ مکمل نہیں چھپا جسقدر چھپا ہے وہ موجود ہے تو فرمایا کہ وہ میرے پاس بھیج دینا اسوقت جب کہ سب طاقتیں جواب دے چکی تھیں، اب بھی اس دلدادۂ علم کو کتابوں کی تلاش تھی جس کی نظیریں ائمہ سلف ہی کے حالات میں ملتی ہیں۔

مولانا کے عملی کمالات بیان کرنے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب چاہئے اور امید ہے کہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد مالک صاحب اس کام کو انجام دیں گے۔ یہ

سطور اس تفصیل کی متحمل نہیں، یہاں تو اس وقتی تأثر اور نا قابل تلافی نقصان کا اظہار ہے جو مولانا کی وفات سے اُمّتِ مرحومہ کو پہنچا ہے، مولانا علمی اور مولانا عملی کمالات میں تو مجھ سے بہت فائق اور آگے تھے مگر عمر میں پانچ سال پیچھے اس لئے ظاہری اسباب کے اعتبار سے یہ اُمید تھی کہ ان کی وفات کا سانحہ میری زندگی میں پیش نہ آئے گا اور تمنا اور دعا تھی مگر بحکم قضاء قدر میدانِ ہستی کے قطع کرنے میں بھی وہ ہی مجھ سے سبقت لے گئے۔ وانّا الیہ راجعون مولانا کی وفات نے بالکل کمر توڑ دی اور اب اپنی زندگی بھی تلخ ہوگئی۔

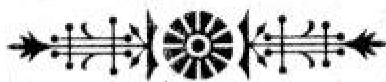
ذهب الذين يعاش فى اكنافهم

وبقيت منهم كالبعير الاجرد

ترجمہ: وہ لوگ چل بسے جن کے سائے میں لوگ زندہ رہا کرتے تھے اور میں ان میں سے ایک خارشتی اونٹ کی طرح باقی رہ گیا، ایک زمانہ تھا کہ اس طرح کے واقعات پر نظمیں اور مرثیے اور تاریخی قطعات لکھا کرتا تھا، افسوس ہے کہ اب دل و دماغ اس سے بالکل ہی کورا ہوگیا۔ اسی کو اپنی اس تحریر کا ضمیمہ بناتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا محمد ادریس صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے اہل وعیال کو صبر جمیل دے کے اپنا تکفل عطا فرمائے۔ صاحبزادوں کو مولانا کی علمی میراث کا سچا جانشین بنائیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

بندہ محمد شفیع، خادم دار العلوم کراچی

(بشکریہ البلاغ کراچی) (بحوالہ ماہنامہ الرشید مئی ستمبر ۱۹۷۴ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدظلہ

کچھ تلافیٔ مافات

حضرت مفتی صاحب مدظلہم بحمد اللہ اب روبصحت ہیں۔ آپ نے اپنی علالت کے دوران یہ مضمون تحریر کروا کر اپنے احباب اور متعلقین تک پہنچانے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے۔ قارئین سے دعائے صحتِ کاملہ کی اپیل ہے۔

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلامٌ علی عبادہٖ الذین اصطفیٰ امابعد!

احقر اس وقت اپنی عمر کا ستتر واں ۷۷ سال گزار رہا ہے، اور یوں تو انسان کی پوری زندگی ہی اس کام کے لئے ہے کہ اسے سفر آخرت کی تیاری میں صرف کیا جائے، کیونکہ اس سفر کے لئے جوانی یا بڑھاپے کی کوئی قید نہیں، کتنے بوڑھے ہیں جنہوں نے اپنے پوتوں پڑپوتوں کو مٹی دی ہے اور کتنے جوان ہیں جو اپنی اولاد بھی نہیں دیکھ پائے۔ لہٰذا واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں آخرت کی فکر سے غفلت برتی جاسکے لیکن خاص طور سے بڑھاپے کی اس عمر کا سب سے بڑا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ اگر اس نے ماضی میں غفلت برتی ہے تو کم از کم اب وہ مکمل طور سے سفرِ آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو جائے۔

سفرِ آخرت کی تیاری کے یوں تو بہت سے شعبے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ سنگین معاملہ حقوق العباد کا ہے، کیونکہ وہ صاحب حق کی معافی کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جس کے

ذمہ کسی (مسلمان یا کسی دوسرے انسان) بھائی کا کچھ حق ہو اسکی آبرو کے متعلق یا اور کسی قسم کا، وہ اس سے آج معاف کرالے ایسے وقت سے پہلے کہ نہ اس کے پاس دینار ہوگا نہ درہم۔ (مشکوٰۃ باب الظلم)

اسی لئے میرے شیخ ومرشد اور مربی سیدی وسندی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شوال ۱۳۴۴ھ کے ماہنامہ ''النور'' میں (یعنی وفات سے تقریباً آٹھ سال پہلے) ایک مضمون ''العذر والنذر'' کے نام سے چھپوایا تھا جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنے ذمہ جو حقوق العباد رہ گئے ہوں ان کا تصفیہ کیا جائے۔

عرصہ سے میرا بھی ارادہ تھا کہ اس قسم کا ایک مضمون تحریر کرکے، اپنے اعزہ، احباب اور متعلقین میں شائع کروں، لیکن گوناگوں مصروفیات میں یہ کام ٹلتا گیا۔ آج جبکہ دورۂ قلب کے حملہ کی وجہ سے میں تقریباً اٹھارہ روز سے ہسپتال میں زیرِ علاج ہوں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے طبیعت کو روبصحت کرکے اتنا افاقہ بخشا ہے کہ میں اپنا یہ مجوزہ مضمون لکھوا سکوں میں چاہتا ہوں کہ اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

حقوق العباد دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک مالی، دوسرے غیر مالی، جہاں تک مالی حقوق کا تعلق ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے کوشش ہمیشہ یہ کی ہے کہ اس قسم کے حقوق سے سبکدوش رہوں اور جن کی ادائیگی باقی ہے، ان کا بحمد اللہ انتظام کر رکھا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ کچھ حقوق میرے ذہن میں نہ رہے ہوں، لہٰذا اگر کسی صاحب کا کوئی مالی حق میرے ذمہ رہ گیا ہو جسے میں بھول گیا ہوں تو براہِ کرم وہ مجھے یاد دلادیں، اگر مجھے یاد آ گیا تو انشاء اللہ اسکی ادائیگی کردوں گا۔

رہے غیر مالی حقوق، مثلاً کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو، کسی کی دلشکنی کی ہو، خواہ روبرو یا پسِ پشت اور خواہ ابتداء ایسا کیا ہو یا انتقام میں جائز حدود سے تجاوز ہو گیا ہو یا کسی کو

ناحق بدنی ایذاء پہنچائی ہو (اور اس قسم کے حقوق کا احتمال زیادہ ہے) ان سب اہلِ حقوق کی خدمت میں دست بستہ نہایت لجاجت سے درخواست ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے معاوضہ لے لیں۔ (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبۃ للہ معاف فرمادیں۔ میں دونوں حالتوں میں ان کا شکر گزار ہوں گا کہ مجھ کو آخرت کے محاسبہ سے بری فرمایا۔ اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا۔ کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔

جن مسائل میں احقر کو دوسروں سے عملی نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے، ان میں اپنے شیخ و مربی سیّدی وسندی حکیم الامّت حضرت تھانوی قدس اللہ سرّہٗ کے مزاج کے مطابق احقر کا معمول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں نے اختلاف کو نظریہ، اصول اور مسلک کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے اور اشخاص وذوات کو اس کا ہدف بنانے سے حتی الوسع پرہیز کیا ہے، تاہم ان مسائل میں حدود کی رعایت آسان نہیں ہوتی، اس لئے ممکن ہے کہ کوشش کے باوجود کہیں حدود سے تجاوز ہوگیا ہو۔ اور میرا قلم یا زبان کسی کی ناحق دل شکنی کا سبب بنی ہو، اس لئے جن حضرات سے میرا علمی، نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے، ان سے بھی میری یہی درخواست ہے۔

حدیث میں کسی مسلمان بھائی کی معذرت قبول کر لینے اور اسے معاف کرنے کے بڑے فضائل آئے ہیں بلکہ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ: ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے اُس پر ایسا گناہ ہوگا، جیسا ظلماً محصول وصول کرنے والے پر ہوتا ہے'' (ابن ماجہ) اور ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ ''جس شخص سے اسکا بھائی معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے، وہ میرے پاس حوضِ کوثر پر نہ آنے پائے گا''

(ترغیب وترہیب منقول از العذر والنذر)

لہٰذا امید ہے کہ جن حضرات کے ایسے حقوق مجھ پر واجب ہیں۔ وہ ان

احادیث کے پیش نظر انشاء اللہ مجھے ضرور معاف فرمادیں گے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ کسی شخص کی غلطی معاف کرنے یا معذرت قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے دوستانہ اور خصوصی تعلقات بھی ضرور رکھے جائیں، کیونکہ ایسا کرنا بعض اوقات مشکل اور بعض اوقات خلافِ مصلحت ہوتا ہے، لہٰذا معافی کی اس درخواست کا مطلب دوستی، بے تکلفی اور خصوصی مراسم کی درخواست نہیں ہے، صرف حقوق شرعیہ سے سبکدوش کرنے کی درخواست ہے۔

اور جسطرح میں دوسروں سے معافی کا طلب گار ہوں، اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب اللہ تبارک وتعالیٰ سے عفو ودرگزر کی امید کرتے ہوئے اپنے وہ تمام غیر مالی حقوق بلا استثناء سب معاف کرتا ہوں جو کسی دوسرے مسلمان پر ہوں اور میرے جو مالی حقوق دوسروں پر واجب ہیں۔ اُن کے بارے میں یہ گزارش ہے کہ جن حضرات کو ادائیگی پر قدرت نہ ہو وہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرلیں۔ انشاء اللہ ان کے لئے کوئی آسان راستہ نکال دوں گا، خواہ معافی، خواہ تخفیف، خواہ مہلت، خواہ اور کچھ۔

آخر میں اپنے تمام اعزہ احباب اور متعلقین سے درخواست ہے کہ وہ احقر کو حتی الامکان دعاؤں میں یاد رکھیں۔

جزاھم اللّٰہ تعالٰی خیر الجزاء

احقر

(مفتی) محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ

(بحوالہ ماہنامہ الحق اگست ۱۹۷۲ء)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی

ابتداءً جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلاناً تبلیغ کے لئے مامور نہ تھے۔ بلکہ اس میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے احکام تھے۔ پھر کچھ دنوں سلسلۂ وحی منقطع رہنے کے بعد جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دوبارہ وحی شروع ہوئی تو اس میں تبلیغ اسلام کے لئے حکم ہوا۔ مگر دنیا میں جہالت وضلالت کی حکومت تھی، بالخصوص عرب کا تکبر اور غرور اور تقلید آبائی انہیں حق پر کان لگانے کی اجازت ہرگز نہ دیتی تھی اس لئے ابتدا میں حکمت الٰہیہ کا اقتضاء یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلاناً تبلیغ واشاعت اسلام کا امر نہ کیا جائے تا کہ اول ہی سے لوگ تنفر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء دعوتِ اسلام اپنی جان پہچان کے لوگوں ان شخصیتوں سے شروع کی جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فراست کے ذریعہ ان میں خیر وصلاوح کے آثار دیکھتے تھے، اس طریق پر سب سے پہلے زوجۂ مطہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و دیانت اور اخلاق سے خوب واقف تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رسالہ الیہ کی خبر دی تو انہوں نے تصدیق کی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی قوم کے مسلم بزرگ تھے۔ تمام معاملات میں لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے بھی ان لوگوں کو دعوت اسلام دینی شروع کی، جن میں کچھ صلاح وخیر کے آثار

دیکھے۔ چناں نچہ حضرت عثمان غنی اور عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن العوام اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دعوت قبول کی اور آپ ان سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور سب مسلمان ہوگئے۔

ان کے بعد ابوعبیدہ بن جراح اور عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب اور سعید بن زید عدوی اور ابوسلمہ مخزومی اور خلاد بن سعید بن العاص اور عثمان بن مظعون اور ان کے دونوں بھائی قدامہ اور عبداللہ اور ارقم بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مشرف باسلام ہوئے، یہ سب کے سب قریش میں سے تھے اور غیر قریش میں سے صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام میں داخل ہوئے اس وقت تک یہ دعوت اسلام محض خفیہ جاری تھی۔ عبادات اور اعمال شرعیہ بھی چھپ چھپ کر ادا کیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے چھپ کر نماز پڑھتا تھا جب مسلمانوں کی تعداد تیس سے بڑھ گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ایک وسیع گھر مقرر کردیا۔ جس میں وہ سب جمع ہوجایا کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم فرماتے تھے۔ اس طریقے کی دعوت اسلام تین سال تک جاری رہی۔ اس دوران میں قریش کی ایک خاصی جماعت اسلام میں داخل ہوگئی اور پھر اور لوگ بھی داخل ہونے لگے یہ خبر مکہ میں پھوٹ نکلی اور لوگوں میں جابجا اس کا چرچا ہونے لگا، اب اعلانًا دعوت حق کا وقت آ پہنچا۔

دعوتِ اسلام

تین سال کے بعد جب کثرت سے مرد وزن اسلام میں داخل ہونے لگے اور لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، تو خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ علی الاعلان لوگوں کو کلمہ حق پہنچاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کی تعمیل کی اور مکہ کی پہاڑی ''صفا'' پر چڑھ کر اور قبائل قریش کا نام لے کر آواز دی جب تمام قبائل جمع ہوگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے سب سے پہلے دریافت کیا کہ اگر تم کو خبر دوں کہ غنیم کا لشکر تم پر چڑھا چلا آ رہا ہے اور قریب ہے کہ تم پر ٹوٹ پڑے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے، یہ سن کر سب بہ یک زبان ہو کر بولے کہ بے شک ہم آپ ﷺ کی خبر کو بالکل حق سمجھیں گے، کیوں کہ ہم نے آج تک کبھی آپ ﷺ کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمھیں خبر دیتا ہوں کہ تم نے اپنے باطل عقائد کو نہ چھوڑا تو خدا تعالیٰ کا سخت عذاب تم پر آنے والا ہے اور فرمایا:

> ''جہاں تک مجھے معلوم ہے، دنیا میں کوئی انسان اپنی قوم کے لئے اس تحفہ سے بہتر لے کر نہیں آیا جو میں تمہارے لئے لایا ہوں میں تمہارے لئے دین و دنیا کی فلاح و بہبود لے کر آیا ہوں۔ اور خداوند عالم نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں خدا کی قسم اگر میں تمام دنیا کے انسانوں سے جھوٹ بولتا، تب بھی تمہارے سامنے جھوٹ نہ بولتا۔ اور اگر ساری دنیا کو دھوکہ دیتا تب بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا۔ اس ذات قدوس کی قسم ہے کہ جو ایک اور جس کا کوئی سہیم و شریک نہیں کہ میں تمہاری طرف خصوصاً اور تمام عالم کی طرف عموماً خدائے تعالیٰ کا رسول اور پیغمبر ہوں۔''

مخالفت و عداوت

یہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ عرب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی وحی میں ان بتوں کی حقیقت کھولی گئی ہے، ان کی پرستش کرنے والوں کی بے وقوفی ظاہر کی گئی ہے۔ تو آپ ﷺ کی عداوت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کی ایک جماعت آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس آئی کہ وہ آپ ﷺ کو اس قسم کی باتوں سے روک دیں اور یا آپ ﷺ کی حمایت کرنا چھوڑ دیں۔ ابو طالب

نے عمدہ پیرائے میں جواب دے کران لوگوں کولوٹا دیا۔آنحضرت ﷺ اسی طرح کلمۂ حق کی نشر واشاعت میں سرگرم رہے۔انہوں نے کہا کہ اپنے بھتیجے کو باز رکھو ورنہ ہم سب تمھارے خلاف جنگ کریں گے۔ یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک فنا ہوجائے۔ اب تو ابوطالب کو بھی فکر ہوئی اور آنحضرت ﷺ سے اس معاملے پر گفتگو کی آپ ﷺ نے فرمایا:

''خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب لا کر رکھ دیں، اور یہ چاہیں کہ میں خدا کا کلمہ اس کی مخلوق کو نہ پہنچاؤں تو میں ہرگز اس کے لے آمادہ نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ یہ خدا کا سچا دین لوگوں میں پھیل جائے اور یا کم ازکم میں اسی جدوجہد میں اپنی جان دے دوں۔''

ابوطالب نے جب یہ رنگ دیکھا تو کہا اچھا جاؤ۔تم اپنا کام کرتے رہو میں بھی تمہاری حمایت ونصرت سے کسی وقت ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

نصرت کا الٹا نتیجہ

جب قریش نے دیکھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب آپ ﷺ کے ساتھ ہیں، اور ادھر موسم حج قریب ہے اس موقع پر تبلیغ میں سرگرم کوشش کریں گے، اور آپ ﷺ کے کلام حق کی مقناطیسی کشش سے سب واقف ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ اب آپ ﷺ کا مذہب تمام دنیا کے اطراف میں پھیل جائے گا،تو سب نے جمع ہوکر طے کیا کہ مکہ کے تمام راستوں پر اپنے آدمی بٹھادیے جائیں تا کہ اطراف عالم سے جولوگ حج کیلئے آئیں انھیں دور ہی سے کہہ دیا جائے کہ یہاں ایک ساحر ہے جو اپنے کلام سے باپ بیٹے اور خاوند بیوی میں اور تمام رشتوں میں باہمی تفریق ڈال دیتا ہے تم اس کے پاس نہ جائیو لیکن ۔

چراغے راکہ ایزد برفروزد　　　کسے کش تف زند ریشش بہ سورد

خُدا کی قدرت ان کا یہ طرز عمل آنحضرت ﷺ کی تبلیغ کا کام کرگیا اگر وہ ایسا

نہ کرتے تو بہت ممکن ہے کہ بہت سے لوگ آپ ﷺ کا ذکر بھی نہ سنتے لیکن ان کی اس جدو جہد نے سب کو آپ ﷺ کا مشتاق بنا دیا۔

جب قریش اپنی تدبیروں میں نا کام رہے۔ اور دیکھا کہ روز آپ ﷺ کی دعوت عام ہوتی جاتی ہے اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اب ہر قسم کی ایذا رسانی شروع کی، مکہ کے چند اوباش لوگوں کو جمع کر کے اس پر آمادہ کیا کہ آپ ﷺ کا ہر مجلس میں استہزاء کریں اور جس صورت سے ممکن ہو آپ ﷺ کو تکلیف پہنچائیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کعبہ شریف کے پاس نماز پڑھ رہے تھے جب سجدے میں گئے تو ابو جہل نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ارادہ کیا کہ آپ ﷺ کا سر مبارک کچل ڈالے مگر۔

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

جب پتھر لے کر آپ ﷺ کے قریب پہنچتا ہے تو ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ پتھر ہاتھ سے گر جاتا ہے۔ رنگ فق ہو جاتا ہے اور بھاگ کر اپنی جماعت کے پاس آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب میں نے آپ ﷺ کے سر کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو ایک عجیب وضع کا اونٹ منہ کھولے ہوئے میری طرف جھپٹا، اور قریب تھا کہ مجھ کو کھا جائے۔ میں نے ایسا اونٹ آج تک نہیں دیکھا۔

ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط، ابولہب، عاص بن وائل، اسود بن یغوث، اسود بن عبد المطلب، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث یہ لوگ ہر وقت آنحضرت ﷺ کے درپئے آزار رہتے، ان میں سے کسی کو اسلام کی توفیق نہیں ہوئی۔

لالچ دینے کی تدابیر

جب کفار قریش نے دیکھ لیا کہ یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو سب نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ اپنے سب سے چالاک سردار عتبہ بن ربیعہ کو آپ ﷺ کے پاس بھیجیں تاکہ وہ آپ ﷺ کو ہر قسم کی دنیاوی طمع دلائے، شاید اس تدبیر سے آپ ﷺ اپنے دعوے سے خاموش ہو بیٹھیں، عتبہ بن ربیعہ آپ ﷺ کی میں خدمت حاضر ہوا۔ آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے پاس جا کر کہا: بھیجتے تم حسب ونسب کے اعتبار سے ہم سب میں بہتر ہو اور اس کے باوجود تم نے اپنی جماعت میں تفریق ڈال دی۔ اور ان کے معبودوں کو اور ان کو برا بھلا کہا، ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو جاہل ٹھہرایا، تم آج اپنے دل کی بات کہہ دو۔ اگر سارے قصوں سے تمہاری غرض یہ ہے کہ بڑی دولت جمع کرلو، تو سنو! ہم تمہارے واسطے اتنا مال جمع کر دینے کو تیار ہیں کہ تم اہل مکہ میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ گے۔ اور اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں سرداری حاصل ہو جائے، تو ہم اس پر راضی ہیں کہ تمام قریش کا سردار بنا دیں اور تمہارے حکم کے بغیر کوئی ذرہ نہ ہلائیں اور تمہاری غرض بادشاہت ہے تو ہم تم کو اپنا سب کا بادشاہ بھی بنا سکتے ہیں۔ اور اگر تم پر (معاذ اللہ) کسی جن کا اثر ہے، اور یہ اس کا کلام (وحی) تم لوگوں کو سناتے ہو، اور تم اس کو دفع کرنے سے عاجز ہو، تو ہم تمہارے لیے کوئی طبیب تلاش کریں جو تمہارا علاج کرے۔"

عتبہ اپنے کلام سے فارغ ہوا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی ساری داستان کے جواب میں ایک سورۃ قرآن کی سُنا دی۔ جس کو سن کر عتبہ ہکا بکا رہ گیا۔ اور اپنی قوم میں واپس آکر کہنے لگا کہ خدا کی قسم آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے اپنی عمر میں کبھی نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ وہ سحر ہے، نہ وہ نجومیوں کا کلام ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم سب اس شخص (آنحضرت ﷺ) کی ایذاء سے باز آجاؤ۔ کیوں

کہ ان کا جو کلام میں نے سنا ہے واللہ اس کی شان عظیم ظاہر ہونے والی ہے۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم میری بات مانو اور زیادہ نہیں تو کچھ دنوں انتظار کرو۔ اگر عرب ان پر غالب آ گئے تو تم مفت میں نجات پا جاؤ گے۔ اور اگر وہ عرب پر غالب آ گئے تو ان کی عزت ہماری عزت ہے کیوں کہ وہ ہمارے ہی قبیلے سے ہیں۔ قریش اپنے سب سے زیادہ ہوشیار سردار کی باتیں سن کر حیرت میں رہ گئے اور یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ اس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جادو کر دیا ہے۔

جب قریش کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا، تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور متعلقین و اقرباء کو بھی ستانا اور طرح طرح کی ایذائیں دینا شروع کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت ایذائیں دی گئیں۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ماجدہ اسی بنا پر نہایت درد ناک طریقے سے شہید کی گئیں اور یہ سب سے پہلا واقعہ شہادت ہے جو اسلام میں پیش آیا۔ (دروس السیر ۃ ص ۲۱)

ہجرتِ حبشہ کا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر ہر قسم کے مظالم اور تکالیف برداشت کرتے رہے۔ مگر جب صحابۂ کرام اور دیگر اقارب تک اس کی نوبت پہنچی، اور دیکھا کہ وہ نہایت صبر کے ساتھ تمام مظالم سہنے کو تیار ہیں، مگر اس کلمۂ حق اور نور الٰہی سے منہ موڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جو ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے وصول ہوا ہے تو ان حضرات کو اجازت دے دی کہ ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جائیں۔ عطاء نبوت سے پانچویں سال ماہِ رجب میں بارہ مرد اور عورتوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جن میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ مطہرہ رقیہ بھی تھیں۔

نجاشی: بادشاہ حبشہ نے ان مہاجرین کا احترام کیا۔ یہ سب امن وعافیت کے ساتھ وہاں رہنے لگے۔ جب قریش کو اس کی خبر ہوئی تو عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ یہ لوگ مفسد ہیں، ان کو اپنی قلمرو میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دو، بلکہ ان کو ہمارے سپرد کردو۔ نجاشی ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ اس نے ان کے جواب میں کہا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ان کے مذہب اور خیالات کی تحقیق نہ کرلوں۔ ان حضرات سے جب نجاشی نے یہ دریافت کیا کہ اپنا مذہب اور اس کے صحیح صحیح واقعات بتلائیں تو جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب نے آگے بڑھ کر فرمایا:

"شاہ ہم پہلے جاہلیت والے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے اور مردار جانور کھاتے تھے، فحش کاری کرتے تھے، بد خلقی میں مبتلا تھے، ہمارا قوی ضعیف کو کھاجاتا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا، جو ہمارے کنبے سے ہے۔ ہم ان کے نسب اور سچائی امانت وعفت کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور انھوں نے ہمیں اس کی دعوت دی کہ اللہ کو ایک سمجھیں اور اس کے ساتھ کسی کو سہیم وشریک نہ جانیں، اور بت پرستی چھوڑ دیں، سچ بولیں، عزیز واقارب کے ساتھ صلہ رحمی کریں، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ اور محرمات سے منع فرمایا۔ اور خون بہانے، جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے روکا۔ اور ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا حکم فرمایا۔ ہم نے جب یہ سنا تو اس پر ایمان لے آئے"۔

نجاشی یہ سن کر بہت متأثر ہوا اور قریش کے دونوں قاصدوں کو واپس کردیا اور مسلمان ہوگیا۔ مہاجرین تقریباً تین مہینے وہاں عافیت کے ساتھ قیام کرکے واپس آگئے۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی نفری، چالیس مرد اور گیارہ عورتوں سے زائد نہ تھی۔ فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے داخل

اسلام ہونے سے مسلمانوں کو ایک قسم کی شوکت حاصل ہوئی، اور جو لوگ دلائل واضح کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کا یقین کر چکے تھے، مگر قریش کے ایذا کے خوف سے اسلام ظاہر نہ کرتے تھے۔ اب علانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اسی طرح قبائل عرب میں اسلام پھیلتا اور ترقی کرتا رہا۔

شعب ابی طالب

جب قریش نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کی عزّت روز بروز ترقی کر رہی ہے اور بادشاہ حبشہ نے بھی مسلمانوں کا احترام کیا، تو انہیں اپنا انجام نظر آنے لگا۔ تمام قریش نے یہ طے کیا کہ بنی عبدالمطلب اور بنی ہاشم سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنے بھتیجے (محمد ﷺ) کو ہمارے سپرد کردیں ورنہ ہم ان سے قطع تعلق کردیں گے۔ بنی عبدالطلب نے اس مطالبے کو منظور نہ کیا تو اتفاق رائے سے یہ عہد نامہ لکھا گیا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے بالکل مقاطعہ کیا جائے۔ رشتے، ناطے، نکاح، بیاہ، خرید وفروخت سب بند کردیئے جائیں۔ اور یہ عہد نامہ بیت اللہ کے اندر معلق کردیا۔

ایک پہاڑ کی گھاٹی میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے تمام رفقاء اور اقرباء کو مقید کردیا گیا۔ اس وقت ابولہب کے سوا بنی ہاشم، اور بنی عبدالمطلب کے تمام افراد بلا امتیاز مسلم و کافر سب کے سب ابوطالب کے ساتھ رہے، اور اس گھاٹی میں محصور ہوگئے۔ سب طرف سے آمد ورفت کے راستے بند تھے۔ خورد ونوش کا جو سامان تھا ختم ہوگیا، تو سخت اضطراب پیش آیا۔ شدّت بھوک سے درخت کے پتّے تک کھانے کی نوبت آئی۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے لیے فرمایا۔ اس مرتبہ ایک بڑے قافلے نے ہجرت کی، جس کی تعداد تراسی آدمی اور بارہ

عورتیں بیان کی جاتی ہے۔ اور پھر ان کے ساتھ یمن کے مسلمان بھی مل گئے، جن میں حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ان کی قوم بھی تھی، ادھر نبی کریم ﷺ اور باقی آل واصحاب نے تقریباً تین سال انہی مظالم ومصائب کے ساتھ بسر کیے۔ اس کے بعد چند آدمی اس عہد کو توڑنے اور آپ ﷺ نے بیان فرمایا تھا الغرض آپ ﷺ سے محاصرہ اٹھادیا گیا۔

اسی عرصے میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ (جو نہایت شریف اور اپنی قوم کے سردار تھے) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی بدیہی حقانیت اور آپ ﷺ کے اخلاق کو دیکھ کر بہ رضا ورغبت مسلمان ہوگئے۔ اور عرض کیا، یارسول اللہ میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے میں جا کر ان کو بھی اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اپنے قبیلے میں پہنچ کر تبلیغ کی کچھ آدمی اپنی سعی سے مسلمان ہوئے۔ مگر کیوں کہ ان کے گمان کے مطابق زیادہ نہ ہوئے، اس لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ ﷺ دعا فرمایئے کہ میری سعی کامیاب ہو۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور ارشاد فرمایا: جاؤ تبلیغ کرو اور نرمی سے کام لو، طفیل بن عمرو لوٹے اور لوگوں کو پھر اسلام کی طرف بلایا اور خدا کے فضل سے ایسے کامیاب ہوئے کہ غزوۂ خندق کے بعد ستّر، اسی گھرانے مسلمان کر کے غزوۂ خیبر میں اپنے ساتھ لائے اور سب شریکِ جہاد ہوئے۔

ابوطالب کی وفات

اسی عرصے میں آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کی وفات ہوگئی۔ یہ سانحہ نبوّت سے دسویں سال ماہِ شوال کے نصف پر پیش آیا۔ اور اس کے تین دن بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہوگئی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سال کو غم کا سال فرمایا ہے ابوطالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا۔ آپ ﷺ

کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، جب آپ ﷺ کو اہلِ مکّہ کے قبولِ اسلام سے مایوسی کی صورت پیدا ہونے لگی تو اس سال یعنی ۱۰ نبوی میں آخر ماہِ شوال میں زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لے کر طائف تشریف لے گئے۔ اور اہل طائف کو کلمۂ حق کی دعوت دی اور ایک ماہ تک متواتر ان کی تبلیغ و ہدایت میں مصروف رہے۔ مگر ایک شخص کو بھی قبولِ حق کی توفیق نہ ہوئی۔ بلکہ ظالموں نے اپنے شہر کے چند اوباش لوگوں کو اکسادیا کہ آپ ﷺ کو تکلیف پہنچائیں۔ یہ سنگ دل بدنصیب اس طرح سرور کائنات کے درپے ہوگئے کہ اگر شانِ رحمۃ للعالمین مانع نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی ایک جنبشِ لب میں ان کی ساری بدمستیوں کا خاتمہ ہوسکتا تھا، اور طائف، اور طائف کے بسنے والوں کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹایا جاسکتا تھا۔ ان بدبخت لوگوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسانا شروع کردیئے، جن سے سرورِ عالم ﷺ کے قدم مبارک زخمی ہوگئے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس طرف سے پتھر آتا ہوا دیکھتے، اس طرف خود کھڑے ہوکر آنحضرت ﷺ کو بچاتے اور پتھر اپنے سر پر لیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر زخمی ہوگیا۔ بالآخر رحمتِ عالم ایک ماہ بعد طائف سے اس طرح واپس ہوئے کہ آپ ﷺ کے ٹخنے شریف لہولہان تھے مگر زبان پر حرفِ بددعا اس وقت بھی نہ آتا تھا۔

اسراء اور معراج

نبوّت کا پانچواں سال تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جس میں فخر الانبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کو معراج حاصل ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا۔ اور جب صبح ہوئی اور یہ خبر قریش میں پھیلی تو ان کا عجیب عالم تھا کوئی تالیاں بجاتا تھا اور کوئی تعجب سے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا، کوئی تمسخر سے ہنس رہا تھا پھر

سب نے بغرض امتحان آپ ﷺ سے سوالات شروع کر دیئے۔ اور دریافت کیا کہ اچھا بتلائیے کہ بیت المقدس کی تعمیر اور ہیئت کیسی ہے۔ اور پہاڑ سے کتنے فاصلے پر ہے؟ آپ ﷺ نے اس کا پورا نقشہ بتلا دیا۔ اس طرح وہ مختلف چیزیں دریافت کرتے رہے اور آپ ﷺ بتاتے رہے۔ یہاں تک کہ اب انہوں نے ایسے سوالات شروع کیے جو باوجود ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بھی کوئی شخص نہ بتلا سکے۔ مثلاً یہ کہ مسجد کے کتنے دروازے ہیں کتنے طاق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں کون شمار کرتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو سخت اضطراب ہوا مگر معجزۃً مسجد اقصیٰ آپ ﷺ کے سامنے کر دی گئی۔ آپ ﷺ شمار کرتے اور بتاتے جاتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اور قریش بھی اب تو سب کے سب چپ ہو گئے، اور کہنے لگے کہ حالات و صفات تو بالکل درست بیان کیے ہیں۔ اور پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خطاب کر کے کہنے لگے، کیا تم تصدیق کرتے ہو کہ آپ ﷺ ایک رات میں مسجد اقصیٰ تک پہنچ گئے اور لوٹ بھی آئے؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اس سے بھی زیادہ بعید چیزوں پر آپ ﷺ کی تصدیق کرتا ہوں۔ میں ایمان لاتا ہوں کہ صبح و شام ذرا سی دیر میں آپ ﷺ کو آسمانی خبریں پہنچ جاتی ہیں، تو پھر اس میں کیا تردّد ہو سکتا ہے۔ اس لیے بھی آپ کا نام صدیق رکھا گیا۔

اس کے بعد قریش نے پھر بغرض امتحان دریافت کیا۔ اچھا بتلاؤ ہمارا فلاں قافلہ جو شام کی طرف گیا ہوا ہے وہ کہاں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ فلاں قبیلے کے تجارتی قافلے پر مقام روحاء میں میرا گذر ہوا تھا۔ ان کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ سب اسی کی تلاش میں لگے ہوئے تھے میں ان کے کجاووں کے پاس گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اور ایک کوزے میں پانی رکھا ہوا تھا میں نے وہ پی لیا۔ اس کے بعد فلاں قبیلے

کے تجارتی قافلے پر فلاں مقام میں ہمارا گزر ہوا۔ جب براق اس کے قریب ہوا، تو اونٹ دہشت سے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اور ان میں ایک سُرخ اونٹ تھا۔ جس پر وہ خروار (گون) سیاہ وسپید تھے۔ وہ تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے بعد فلاں قبیلے کے تجارتی قافلہ سے فلاں مقام میں ہمارا گزر ہوا۔ جس میں سب سے آگے ایک خاکی رنگ کا اونٹ تھا۔ اور اس پر سیاہ ٹاٹ اور دو سیاہ خروار (گون) تھے۔ اور یہ قافلہ عنقریب تمہارے پاس آنے والا ہے، لوگوں نے دریافت کیا کہ کب تک؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدھ کے روز تک آجائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح ہوا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اور ان قافلوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی تصدیق کی۔

جب قریش پر خدا کی حجّت تمام ہوئی اور محیّر العقول سفر کی خود ان کی قوم نے شہادت دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاندین کے لیے بھی اس کے سوا انکار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سحر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ جادوگر کہہ کر کھڑے ہو گئے۔

مدینہ منوّرہ میں اسلام

دس سال تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب کو علی الاعلان دعوت اسلام دیتے رہے۔ اور عرب کی کوئی مجلس اور کوئی مجمع نہیں چھوڑا جس میں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ حق نہ کی ہو۔ موسم حج میں بازار عکاظ اور ذی المجاز وغیرہ میں گھر گھر جا کر لوگوں کو حق کی طرف بُلاتے رہے۔ مگر وہ اس کے جواب میں ہر قسم کی ایذائیں پہنچاتے اور مذاق اڑاتے تھے کہ پہلے اپنی قوم کو مسلمان بنایئے پھر ہماری ہدایت کے لیے آیئے۔ اسی پر ایک مدّت گزر گئی جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اسلام کی اشاعت وترقی ہو تو قبیلہ اوس کے چند آدمی مدینہ طیبہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں بھیج دیئے۔ ان میں سے اس سال دو شخص اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور پھر آئندہ سال ان میں سے کچھ اور آدمی آئے۔ جن میں سے چھ یا آٹھ آدمی مسلمان ہوئے، نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کیا تم پیغام خداوندی کی تبلیغ میں میری مدد کرو گے؟ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ ابھی ہماری آپس کی اوس اور خزرج کی خانہ جنگی ہو رہی ہے اگر اس وقت جناب مدینہ تشریف لائے تو آپ کی بیعت پر سب کا اجتماع نہ ہو سکے گا۔ ابھی آپ ﷺ ایک سال اس ارادہ کو ملتوی فرمائیں۔ ممکن ہے کہ ہماری آپس میں صلح ہو جائے، اور پھر اوس و خزرج مل کر اسلام قبول کر لیں۔ آئندہ سال ہم پھر حاضر خدمت ہوں گے، اس وقت اس کا فیصلہ ہو سکے گا۔ یہ حضرات واپس مدینہ آئے اور مدینے میں سب سے پہلے مسجد بنو زریق میں قرآن پڑھا گیا۔

خُداوندِ عالَم کو منظور تھا کہ مدینہ میں اسلام کی اشاعت ہو۔ اسی سال بھر کے عرصے میں اوس و خزرج کے اکثر جھگڑے مٹ گئے۔ اور اگلے سال حج کے موقع پر حسب وعدہ بارہ آدمی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں دس قبیلہ خزرج کے اور دو اوس کے تھے۔ ان میں جو لوگ پہلے مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ اب مسلمان ہو گئے۔ اور سب نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت چوں کہ عقبہ کے پاس ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا نام عقبہ اولیٰ رکھا گیا۔ یہ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ آ گئے تو مدینہ میں گھر گھر میں اسلام کا چرچا تھا اور ہر مجلس میں یہی بات رہ گئی۔

مَدینہ میں پہنچ کر اوس و خزرج کے ذمہ دار لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو خط لکھا کہ یہاں بحمد اللہ اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اب کسی صاحب کو ہمارے یہاں بھیج دیجئے، جو ہمیں قرآن پڑھائے۔ اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے اور ہمیں احکام شرعیّہ کی تعلیم دیں اور نماز میں ہمارے لیے امام

بنیں۔ آپ ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تعلیم قرآن کے لیے بھیج دیا۔ اور اسلام میں سب سے پہلے مدرسے کی بنیاد مدینہ طیّبہ میں پڑ گئی۔

آئندہ سال حج کے ایام میں مدینہ طیّبہ سے ایک بڑا قافلہ مکہ معظّمہ پہنچا۔ اس میں ستّر مرد اور عورتیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا استقبال کیا، اور ان سے عقبہ کے پاس رات کو ملنے کا وعدہ فرمایا۔ حسب وعدہ نصف رات کے وقت سب لوگ جمع ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے چچا عباس بھی تشریف لائے، اگرچہ حضرت عباس اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ جب سب جمع ہوگئے تو حضرت عباس نے ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ میرا بھتیجا (نبی کریم ﷺ) ہمیشہ اپنی قوم میں عزّت وحفاظت کے ساتھ رہا ہے۔ تم جو اس کو مدینہ لے جانا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ اگر تم ان کے عہد کو پورا کرسکو۔ اور مخالفین سے ان کی حفاظت کرسکو، تو اس کا ذمہ لو۔ ورنہ ان کو اپنے قبیلے میں رہنے دو۔ مدنی قافلے کے سردار نے کہا: بے شک ہم اس کا ذمہ لیتے ہیں اور ہمارا یہی مقصد ہے کہ آپ ﷺ کی بیعت کو پورا کریں۔ یہ سن کر (عہد بیعت کو پختہ کرنے کے لیے) حضرت اسعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن زرارہ بول اٹھے: اے اہل مدینہ ذرا ٹھہرو! تم سمجھتے ہو کہ آج تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ سمجھ لو کہ یہ بیعت تمام عرب اور عجم کے مقابلے میں مخالفت کا عہد ہے۔ اگر تم اس کو نباہ سکتے ہو تو عہد کرو، ورنہ عذر کر دو‘‘ اس پر سب نے بیک زبان ہوکر کہا کہ ہم کسی حال میں اس بیعت سے ہٹنے والے نہیں پھر عرض کیا: یارسول اللہ! اگر ہم نے اس عہد کو پورا کیا تو ہمیں اس کی جزا کیا ملے گی‘‘؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کا راضی ہونا اور جنت‘‘۔ یہ سن کر سب نے کہا ہم راضی ہیں، آپ ﷺ دست مبارک دیجئے کہ ہم بیعت کریں۔ آپ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا اور سب بیعت سے مشرف ہوئے۔

خُدا جانے اس رسول امین ﷺ کی نظرِ اثر اور چند کلمات نے ان لوگوں پر کیا

اثر کیا تھا کہ ایک ہی صحبت میں تمام دنیوی علائق، اور جاہ و مال اور عزّت و آبرو اس کے حکم پر قربان کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ اور پھر یہ رنگ ان کی اولاد تک قائم رہا۔ حضرت اُم عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو شریک بیعت تھیں، ان کے صاحب زادے حضرت حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کو مسیلمہ کذّاب مدعی نبوّت نے گرفتار کر لیا اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھ کر نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ لیکن عہد کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالا۔ یہ ظالم ان سے دریافت کرتا تھا کہ محمدؐ اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو وہ فرماتے بے شک۔ پھر پوچھتا کہ اس کی گواہی بھی دیتے ہو کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں؟ تو فرماتے ہرگز نہیں۔ اس پر وہ ان کے عضو کاٹ لیتا تھا پھر اسی طرح دریافت کرتا۔ اور جب وہ اس کی نبوّت کو ماننے سے انکار کرتے تو کم بخت ایک اور عضو کاٹ ڈالتا اسی طرح ایک ایک عضو کر کے تمام بدن کے ٹکڑے کر دیئے۔ الغرض شہید ہو گئے مگر اس کو گوارا نہ کیا کہ عہد اسلام کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالیں۔

اگرچہ خرمن عمرم غم تو داد بباد بخاک پائے عزیزت کہ عہد نشکستم

اس کے بعد سب نے بیعت کی۔ اس وقت مبایعین کی تعداد ستّر مرد اور عورتیں تھیں اور اس کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بارہ آدمیوں کو تمام قافلے کا ذمہ دار بنایا۔

قریش کو جب اس بیعت کی خبر ہوئی تو ان کے غیظ کی انتہا نہ رہی۔ اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ صحابہ نے آہستہ آہستہ قریش سے خفیہ ایک ایک دو دو کر کے مکہّ معظّمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مکہّ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تھوڑے سے مستطیع لوگوں کے سوا کوئی

مسلمان باقی نہ رہا۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کہ ابھی ٹھہرو، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے بھی ہجرت کی اجازت دے دے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے انتظار میں رہے۔ اور دو اونٹنیاں اس سفر کے لیے مہیا کیں۔ ایک اپنے لیے اور دوسری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے۔

ہجرتِ مدینہ

کفّارِ قریش کو جب حالات معلوم ہوئے تو دارالندوہ میں مشورے کے لیے جمع ہوئے کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں کیا کیا جائے۔ کسی نے قید کرنے کی رائے دی اور کسی نے جلاوطن کرنے کی۔ مگر ان چالاک لوگوں نے کہا کہ یہ مناسب نہیں کیوں کہ قید کرنے کی صورت میں ان کے اعوان وانصار ہم پر چڑھ آویں گے، اور ہم سے چھڑالیں گے۔ اور جلاوطن کرنے کی صورت تو سراسر ہمارے لیے مضر ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں اطراف مکہ کے تمام عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق، شیریں کلام اور کلامِ پاک کے گرویدہ ہوجائیں گے۔ اس لیے بدبخت ابوجہل نے یہ رائے دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا جائے۔ اور قتل میں ہر قبیلے کا ایک آدمی شریک ہوتا کہ عبد مناف (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ) بدلہ لینے سے عاجز ہوجائے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا اور ہر قبیلے کے ایک ایک جوان کو اس کام کے لیے مقرّر کردیا کہ فلاں رات میں یہ کام کیا جائے۔

ادھر خداوند عالم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مشورے کی اطلاع دے دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم فرمایا۔ جس رات میں کفارقریش نے اپنے خیال خام کو پورا کرنے کا ارادہ کیا، اور مختلف قبائل کے بہت سے جوان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کرکے بیٹھ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت ہجرت کا ارادہ

فرمایا۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ارشاد کیا کہ وہ آپ ﷺ کی چارپائی پر آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر سو جائیں تاکہ کفار کو آپ ﷺ کے گھر میں نہ ہونے کا علم نہ ہو اس کے بعد آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو دروازے پر قریش کا میلہ سا لگا ہوا تھا، آپ ﷺ سورۃ یٰسین شریف پڑھتے ہوئے باہر نکلے اور جب آیت وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ پر پہنچے تو اس کو کئی مرتبہ دہرایا یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے اور آپ ﷺ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، وہ پہلے ہی سے تیار تھے ایک راستہ بتانے والے کو بھی اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے تیار کر رکھا تھا، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیے اور مکان کی پشت کی جانب سے ایک کھڑکی کے راستے دونوں باہر نکلے اور غار ثور کی طرف تشریف لے گئے، ثور مکہ کے قریب ایک پہاڑ ہے۔

غارِ ثور کا قیام

آپ ﷺ اس پہاڑ کے ایک غار میں جا کر ٹھہرے، ادھر یہ قریشی جوان صبح تک آپ ﷺ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر معلوم ہوا کہ آپ کی جگہ علی ہیں تو سخت پریشان ہوئے اور چاروں طرف اپنے قاصد آپ ﷺ کی تلاش میں بھیجے، آنحضرت ﷺ کے گرفتار کرنے پر سو اونٹ کا انعام مقرر کیا۔ بہت سے آدمی آپ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور بعض قیافہ شناس لوگ آپ ﷺ کے نشان قدم تلاش کرتے ہوئے ٹھیک اس غار کے کنارے پر پہنچ گئے کہ اگر ذرا جھک کر دیکھتے تو صاف آپ ﷺ سامنے تھے اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غمگین ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

گھبراؤ نہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، خدا کی قدرت کہ ان سب کی نظریں اس غار سے پھیر دی گئیں اور کسی نے جھک کر نہ دیکھا بلکہ ان کے سب سے بڑے چالاک امیہ بن خلف نے کہا کہ یہاں ان کا ہونا محال ہے کیوں کہ بہ حکم خداوندی اس غار کے دروازے پر رات کی رات میں مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور جنگلی کبوتر نے گھونسلا بنالیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس غار میں متواتر تین رات چھپے رہے۔ یہاں تک کہ تلاش کرنے والے مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔ ان تین دنوں میں ابوبکر صدیق کے صاحب زادے عبداللہ رات کو خفیہ آپ ﷺ کے پاس آتے تھے اور صبح سے پہلے ہی مکہ پہنچ جاتے تھے۔ دن بھر قریش کی خبریں سن کر رات کو آپ کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اور ان کی بہن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہر رات میں کھانا آپ ﷺ کے پاس پہنچاتی تھیں۔ چوں کہ عرب کے لوگ نشان قدم کو بہت پہچانتے تھے، اس لیے عبداللہ نے اپنے غلام سے کہہ رکھا تھا روزانہ بکریاں چرانے کے لیے اس غار تک لے جاتا کرے تاکہ ان کے نشاناتِ قدم مٹ جائیں۔

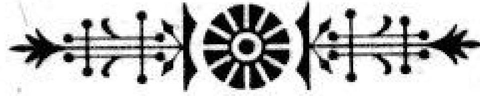
غارِ ثور کے قیام کے تیسرے دن ربیع الاوّل ۱ھ بروز پیر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں اونٹنیاں لے کر پہنچے، جو اس سفر کے لیے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مہیا کی تھیں۔ اور ان کے ساتھ عبداللہ بن اریقط بھی پہنچے، جن کو راستہ بتلانے کے لیے اجرت دے کر ساتھ لے لیا تھا۔ نبی کریم ﷺ ایک ناقہ پر سوار ہوگئے اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسری پر۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ساتھ عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی خدمت کے لیے بٹھالیا۔ اور عبداللہ بن اریقط آگے آگے راستہ دکھانے کے لیے چلے۔ آگے بڑھے تو قریش کے قاصدوں

میں سے سراقہ بن مالک، جو آپ ﷺ کی تلاش میں پھر رہا تھا، یہاں تک پہنچ گیا۔ جب آپ ﷺ کے قریب آیا تو اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر پڑا۔ مگر پھر سوار ہو کر آپ کے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی تلاوتِ قرآن کی آواز اس نے سنی۔ اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بار بار مڑ کر اس کو دیکھتے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف التفات ہی نہ کیا۔ جب زیادہ قریب آ گیا تو اس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں زمین کے خشک ہونے کے باوجود گھٹنوں تک اندر اتر گئے اور سراقہ دوبارہ زمین پر گر پڑا۔ اب ہر چند گھوڑے کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے مگر گھوڑا زمین کے باہر نہیں نکلتا۔ مجبور ہو کر رسول اللہ ﷺ سے پناہ مانگی۔ آپ ﷺ ٹھہر گئے، اور آپ ﷺ کی برکت سے گھوڑا وہاں سے نکل آیا۔ جب گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکلے تو پاؤں کی جگہ سے ایک دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر سراقہ اور بھی زیادہ ششدر رہ گیا۔ اور نہایت عاجزی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے سامنے توشہ اور موجود سامان اونٹ وغیرہ پیش کرنے لگا۔ آپ ﷺ نے اس کو قبول نہ کیا اور فرمایا: جب تک تم اسلام قبول نہیں کرتے۔ ہم بھی تمہارے اونٹ وغیرہ قبول نہیں کرتے۔ بس اتنا کافی ہے کہ تم ہمارے حال کو کسی سے بیان نہ کرنا۔ سراقہ ادھر سے واپس ہوا اور جب تک آپ ﷺ کے متعلق خطرہ ہو سکتا تھا کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

کچھ دنوں بعد سراقہ نے ابوجہل سے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد چند اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

”اے ابوحکم (ابوجہل) لات کی قسم! (لات ایک بُت ہے جس کی قریش پوجا کرتے تھے) اگر تم اس گھوڑے کے زمین میں دھنس جانے کا مشاہدہ کرتے، تو تمہیں اس بات میں شک کی گنجائش نہ رہتی کہ محمد (ﷺ) خدا کے رسول ہیں۔

میری رائے میں لازم ہے کہ تم ان کی مخالفت سے خود بھی اجتناب کرو اور لوگوں کو بھی منع کرو کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی کامیابی کے نشانات اس طرح چمک جائیں گے کہ تمام انسان اس کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم ان سے صلح کر لیتے۔ (سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر ص ۲۱۹ تا ۳۳۰ لاہور)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

گانا بجانا
اسلام کی نظر میں

احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و آثارِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

غِنا و مزامیر کے بارے میں دو قسم کی احادیث آتی ہیں، بعض احادیث اس کی کراہت اور تحریم پر دلالت کرتی ہیں اور بعض اباحت اور جواز پر۔ پہلے وہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں جن سے کراہت اور تحریم معلوم ہوتی ہے:۔

(۱) عن عبدالرحمن بن غنم قال حدثنی ابو عامر او ابومالك الاشعری رضی الله عنه انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم یقول لیکونن من امّتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر و المعازف اخرجه البخاری فی الاشربة) وفی لفظ یشربن ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها یعزف علی رُؤسهم بالمعارف والمغنیات یخسف الله بهم الارض ویجعل منهم القردة والخنازیر.

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے کہ مجھے حضرت ابو عامر یا ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ "عنقریب میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زِنا، ریشم، شراب اور

باجوں کو حلال سمجھیں گے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں: "عنقریب میری امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل دیں گے، ان کے سروں پر ناچ گانے ہوں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے لوگوں کو زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض کو خنزیر اور بندر بنا دے گا۔ [1]

(رواہ ابن ماجه وقال عن ابي مالك الاشعری رضی اللہ عنہ ولم یشك منتقی الاخبار ص ۹۶ ج ۸)

ابوداؤد نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ [2]

اور ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [3]

اس کے دیگر شواہد بھی موجود ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۸ ص ۹۷)

مَعَازف کے بارے میں علمائے لغت کا اتفاق ہے کہ اس کے معنیٰ باجے اور آلاتِ غنا ہیں۔ مذکورہ حدیث سے آلاتِ غنا کی حرمت پر استدلال نہایت واضح ہے، کیونکہ حدیث میں یَستَحِلُّون کا لفظ ارشاد فرمایا گیا جو صاف بتا رہا ہے کہ حدیث میں ذکر کردہ اشیاء جن میں باجے بھی شامل ہیں، شریعت میں حرام ہیں، جنہیں بعض لوگ حلال قرار دے لیں گے۔

نیز معازف کو زِنا، ریشم اور شراب جیسی حرام چیزوں کی صف میں رکھا گیا ہے اور نہیں حلال قرار دینے کو ایسا ہی سنگین جرم بتایا گیا ہے جیسے شراب کو حلال قرار دینا، اور

---

[1] دیکھیے صحیح بخاری کتاب الاشربۃ، باب ماجاء فیمن یستحل الخمر ویسمیہ بغیر اسمہ ج ۲ ص ۸۳۷ وابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العقوبات ص ۳۰۰۔ ابن ماجہ کی روایت کی سند بالکل صحیح ہے، چنانچہ حافظ ابنِ قیم نے صحت کی تصریح بھی کی ہے۔ (اغاثۃ اللھفان ج ۱ ص ۲۶۱)

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، باب فی الداذی ج ۲ ص ۵۱۹۔ ابوداؤد کی روایت مختصر ہے اور اس میں معازف وقینات اور خسف ومسخ کا ذکر نہیں ہے۔

[3] موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، کتاب الاشربۃ باب فی من یستحل الخمر ص ۳۳۶۔ صحیح ابن حبان اور سنن ابی داؤد کی سند ایک ہی ہے، لیکن امام ابن حبان رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث پوری نقل کی ہے، جس میں معازف وقینات اور خسف ومسخ کا ذکر ہے، جب کہ امام ابوداؤد نے غالباً اختصار سے کام لیا ہے اور حدیث کا ابتدائی حصہ جو ان کے مطلب کا تھا، نقل کر دیا ہے۔ واللہ اعلم

پھران سب کی یکساں مذمت کر کے عذابِ الٰہی کی وعید سُنائی گئی ہے۔

معازف کوحلال کرنے والے بعض لوگ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''اس سے حرمتِ معازف پر استدلال درست نہیں، کیونکہ معازف ومزامیر فی نفسہٖ حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں مگر انھیں جب کسی حرام چیز کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو یہ قابلِ مذمت اور حرام ہوجاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی باجے محض اس لیے مذموم قرار پائے کہ وہ شراب، زنا اور ریشم کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔'' وہ لوگ مزید کہتے ہیں کہ ''مذکورہ حدیث میں عذاب کی وعید چار چیزوں کے مجموعے پر سنائی گئی ہے، لہٰذا جب اِن چاروں یعنی زنا، ریشم، شراب اور معازف کا ایک ساتھ ارتکاب ہوگا، تب ہی وعید کا استحقاق ہوگا۔ اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ جب چند ترتیب وار چیزوں کی ممانعت ہوتو ان سب کی مجموعی وعید اس مجموعے کے کسی ایک فرد کی وعید کی دلیل نہیں ہوگی اور اس کی بڑی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ قول ہے:۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ اِنَّهٗ كَانَ لَایُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَ لَايَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ.

اسے پکڑ کر گلے میں طوق ڈالو، پھر اسے جہنم میں لے جاؤ، پھر ستر ۷۰ گز کے حلقے والی زنجیر میں اسے جکڑ دو۔ یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھلانے پر کسی کو اُبھارتا نہ تھا۔ (پارہ ۲۹۔ رکوع ۵)

یہاں بلاشبہ اس وعیدِ شدید کا سبب محض مسکین کو کھلانے پر نہ اُبھارنا نہیں ہے اور نہ ایسا کرنا حرام ہے۔''

لیکن ان حضرات کا یہ اعتراض اور تاویل درست نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے غلام جب دین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا چاہتے

ہیں تو اس وقت ان کی دست درازیوں سے کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی، وہ اپنے دعوے ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنت تک کو بدلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور ان میں وہ تاویلات کرتے ہیں جو تحریفِ معنوی کا بدترین نمونہ ہوتی ہیں، بلکہ بسا اوقات ان کی تاویلات عربی زبان کے مسلمہ قواعد کے خلاف ہونے کے علاوہ عقل وشعور کی بھی صریح مخالف ہوتی ہیں۔ مندرجہ بالا تاویل کی نوعیت بھی کچھ یہی ہے۔

چنانچہ پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث میں مذکورہ چار چیزوں میں معازف ہی کی تنہا کیا خصوصیت ہے کہ وہ تنہا حلال ہیں اور مجموعے کی صورت میں حرام ہیں، آخر یہی بات زِنا، شراب یا ریشم کے بارے میں بھی تو کہی جاسکتی ہے اور جس طرح انہوں نے گندگی کے اس ڈھیر میں سے معازف کو پاک صاف، حلال وطیب کر کے نکال لیا، اگر کل کوئی شخص شراب کے حلال ہونے کا دعویٰ کرے اور اس حدیث میں یہی تاویل کر کے کہے کہ شراب ایک حلال پاک چیز ہے، البتہ مجموعے کی صورت میں حرام ہے تو یہ حضرات اسے کیا جواب دیں گے؟ یا اگر یہی بات کوئی زنا کے بارے میں کہے یا ریشم کے بارے میں کہے اور اس حدیث میں یہی تاویل کرے تو ان کا کیا جواب ہوگا؟ پھر آخر مَعَازِف ہی کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بناء پر اسے مجموعے کے ساتھ مل کر حرام اور تنہا حلال کہا جا رہا ہے؟

دوسری بات یہ کہ ان کی یہ تاویل قواعدِ عربیہ کی صریح مخالف ہے اور اگر اسے مان لیا جائے تو ایک بہت گمراہی کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔
تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

حدیث میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے ہیں:۔

يستحلون الحر والحرير والخمر والمعازف

اور ان میں چار چیزوں کو حرفِ عطف " و " کے ساتھ جوڑا گیا ہے، اور یہ عربیت کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ حرف عطف " و " معطوف اور معطوف علیہ کو ایک حکم

میں جمع کرنے کے لیے آتا ہے اور شمولیتِ حکم کے لیے معطوف اور معطوف علیہ کا ایک ساتھ پایا جانا یا بالترتیب پایا جانا ضروری نہیں۔ جسے آپ ٹھیٹھ اصطلاحی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''و مطلق جمع کے لیے آتا ہے۔'' اس قاعدے کی تصریح تمام علماءِ عربیہ نے کی ہے، ہم محض صاحب الکشاف علامہ زمخشری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، جو کہ لغتِ عربیہ کے مسلم جلیل القدر امام ہیں، موصوف اپنی کتاب المفصل میں لکھتے ہیں:۔

'' فالواو للجمع المطلق من غير ان يكون المبدؤ به داخلا فی الحكم قبل الأخر ولا ان يجتمعا فی وقت واحد بل الامران جائزان وجائز عكسهما.'' (شرح المفصل ج ۸ ص ۹۰)

مطلب یہ ہے کہ ''و'' مطلق جمع کے لیے آتا ہے، اس سے قطع نظر کہ معطوف علیہ پہلے حکم میں داخل ہوا ہے یا معطوف، نیز یہ کہ دونوں ایک ہی وقت میں حکم میں ہیں یا نہیں دونوں ہی صورتیں جائز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ واؤ مطلق جمع کے لیے آتا ہے اور اس میں معطوف اور معطوف علیہ کے اکٹھے پائے جانے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا، اس لیے بالعموم یہی سمجھا جاتا ہے کہ فرداً فرداً حکم میں شامل ہیں، اور دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا محض ایک اتفاقی امر ہے جو کسی قوی قرینے سے متعین ہوتا ہے، چنانچہ جب آپ کہتے ہیں کہ جَاءَ نِیْ زَیْدٌ وَعَمْرٌو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''میرے پاس زید اور عمرو آئے''، اب اس میں دونوں ہی احتمال ہیں کہ زید اور عمرو اکیلے اکیلے آئے یا دونوں اکٹھے آئے، لیکن اکٹھے آنے کا دعویٰ کرنا اسی وقت صحیح ہے جب کہ کوئی قرینہ موجود ہو، ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ فرداً فرداً دونوں ہی آئے، یہی عربی زبان کا عام اسلوب ہے چنانچہ اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، ہم محض دو ایک مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدۃ۔۹۰)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بُت اور پانسے پلید شیطانی کام ہیں ان سے بچے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

یہاں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں اور ان چاروں کو حرفِ عطف واؤ کے ذریعے جوڑا گیا ہے جو مطلق جمع کے لیے آتا ہے اور فرداً فرداً ہر ایک حکم میں شامل ہوتا ہے۔ مجموعی صورت کا دعویٰ اسی وقت ٹھیک ہے جب کوئی انتہائی قوی قرینہ موجود ہو، ورنہ کل کوئی منچلا اٹھ کر دعوی کرسکتا ہے کہ شراب حلال پاکیزہ چیز ہے، کیونکہ ایک جہاں اسے پیتا ہے، دراصل قرآن کریم میں شراب کی جو مذمت آئی ہے، وہ دوسری حرام چیزیں ساتھ مل جانے کی وجہ سے آئی ہے، اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ جہاں کہیں شراب کی مذمت بیان کی گئی ہے وہیں جُوے کا ذکر بھی کیا گیا ہے، تو وہ شراب حرام ہے جو جُوے تک پہنچادے، ورنہ فی نفسہٖ شراب میں کوئی قباحت نہیں۔ ایسے ہی کوئی دوسرا شخص جُوے کے بارے میں بھی یہی دعوی کرسکتا ہے کہ وہ بھی صرف اجتماعی صورت میں حرام ہے، ورنہ انفرادی طور پر حلال پاکیزہ چیز ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا:۔

''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ.
(البقرہ ۱۷۳ پارہ نمبر ۲)

ترجمہ: تم پر حرام کیا گیا ہے، مُردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے لیے کیا جائے۔

اِس وقت میں بھی چار چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کو حرفِ عطف واؤ کے ذریعے جوڑا گیا لہٰذا یہاں بھی ہر ایک چیز فرداً فرداً حکم میں شامل ہوگی، یہ دعویٰ کہ اجتماعی

صورت مُراد ہے، نہایت قوی قرینے کا محتاج ہے، ورنہ کل کوئی ملحد اٹھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ سُوّر حلال پاکیزہ چیز ہے، ایک دنیا اس کا گوشت کھاتی ہے، البتہ جب وہ دوسری ناپاک چیزوں کے ساتھ مل جاتا ہے تو حرام ہو جاتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں سُوّر کی جو حرمت آئی ہے وہ دراصل مجموعے کی صورت میں ہے، یعنی وہ سُوّر حرام ہے جو مردار ہو یا غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی سُوّر کی حرمت بیان کی گئی ہے، وہیں ان دونوں اشیاء کا ذکر بھی ہے۔

دیکھا آپ نے! اگر ان کی یہ مَن گھڑت تاویل مان لی جائے، تو شاید قرآن وسنت سے کسی بھی چیز کو حرام یا حلال ثابت کرنا ممکن نہ رہے اور گمراہی کا ایسا دروازہ کھلے کہ اسلام کی اصولی تعلیمات بھی باقی نہ بچیں اور دین کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان بُری چیزوں کو کیوں ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، تو جواب یہ ہے کہ بعض کاموں کی بعض کاموں سے خاص مناسبت ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے معاون بنتے ہیں، اسی وجہ سے بسا اوقات ایک دوسرے کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

یہ اصول جس طرح طاعات میں جاری ہوتا ہے کہ بعض طاعات دُوسری کے لئے معاون ہوتی ہیں، اسی طرح معاصی میں بھی کارفرما ہے۔ چنانچہ بعض معصیتیں دوسری معصیتوں سے خاص مناسبت اور تعلق رکھتی ہیں، اسی وجہ سے اکثر ان کا ذکر ایک ساتھ کیا جاتا ہے، مثلاً شراب کو جُوئے سے خاص مناسبت ہے، چنانچہ اکثر جُوا کھیلنے والا شراب کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شراب پینے والا جُوئے کی طرف چل دیتا ہے، اسی وجہ سے ان کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے، بعینہٖ یہی معاملہ اس حدیث میں ہے کہ یہ چاروں گناہ ایک دوسرے کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے مدد ومعاون بنتے ہیں۔ چنانچہ ناچ گانوں، زنا، شراب اور لباسِ حرام کی مناسبت اس قدر بدیہی ہے کہ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ بعض انسانیت شناس لوگوں نے کہا ہے۔

"الغناء رقیة الزنا"

کہ گانا زنا کا انسواں (منتر) ہے۔

(اس مقولے پر تفصیلی بحث ہم آگے کریں گے)

❷ اپنے دعوے میں یہ دلیل پیش کرنا کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب چند ترتیب وار چیزوں کی ممانعت ہو تو ان سب کی مجموعی وعید کسی ایک فرد کی وعید کی دلیل نہیں ہوگی، آنکھوں میں دُھول جھونکنا اور صاف مغالطے میں ڈالنا ہے۔

دراصل اس دلیل میں خلطِ مبحث سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ ذرا غور کرنے کے بعد بات صاف ہو جاتی ہے، کیونکہ حدیث میں "معازف" کی حُرمت یستحلّون کے لفظ سے ثابت ہو رہی ہے نہ کہ عذاب کی وعید سے۔

مطلب یہ ہے کہ زِنا، ریشم، شراب اور باجے شریعت میں حرام ہیں۔ جب امت کے بعض لوگ انہیں حلال سمجھنے لگیں گے تو ان پر عذاب نازل ہوگا۔ یہ بحث، کہ ان میں سے کسی ایک کو حلال کریں گے تو یہ عذاب نازل ہوگا یا جب ان سب کو حلال کریں گے تو عذاب نازل ہوگا، ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ ایک حرام چیز کو حلال کرنے کی کیا سزا ہوگی؟ اور کئی حرام چیزوں کو حلال کرنے کی کیا سزا ہوگی؟ بہرحال حدیث سے اتنا صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ چار حرام چیزوں کو حلال کرنے کی جسارت کریں گے جس کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوگا۔

رہا اپنے اُصول کے لیے آیت خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ الآیۃ سے استدلال کرنا، سو وہ بھی درست نہیں، اس لیے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ عذاب دو چیزوں کے مجموعے پر موقوف تھا، اور اگر وہ صرف کفر ہی کا مرتکب ہوتا تو یہ عذاب نہ دیا جاتا؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کوئی قانون یا متعلق کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا اسلوب خطابی اور وعظ وتذکیر پر مشتمل ہے، چنانچہ وہ کسی شخص کے عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اعمال بدشمار کرتا ہے تو اس میں اس مسئلے سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ یہ عذاب ان تمام اعمالِ بد کے مجموعے پر متفرع ہے یا ان میں سے ہر بدعملی اپنی انفرادی حیثیت میں بھی اس عذاب کے لیے کافی تھی؟ چنانچہ ان اعمالِ بد میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو تنہا بھی اس عذاب کے لیے کافی ہوتے، اور بعض ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو تنہا ہونے کی صورت میں چاہے اتنے شدید عذاب کے مستوجب نہ ہوں لیکن گناہ ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں آیاتِ خُداوندی کو جُھٹلانا بلاشبہ ایسا جُرم ہے جو تنہا بھی اس عذاب کے لیے کافی ہوسکتا تھا؟ ہاں! مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا بیشک ایسا جرم ہے جس کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ گناہ ہونے کے باوجود شاید اتنے شدید عذاب کا مستوجب نہ ہوتا، لیکن اول تو اس کے بارے میں بھی کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ ''حضِ اطعام'' سے مراد آخرت کا انکار ہے، کیونکہ مسکین کو کھلا کر اس سے اجرت نہیں مانگی جاتی، بلکہ ثوابِ آخرت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تو جو شخص آخرت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسکین کو کیا کھلائے گا، یا کھلانے پر کیوں ابھارے گا، چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:۔

"وفیہ اشارۃ الی انہ کان لا یؤمن بالبعث لان الناس لایطلبون علی المساکین فیما یطعمونھم، وانما یطعمونھم لوجہ اللہ رجاء الثواب فی الأخرۃ، فاذا لم یؤمن بالبعث لم یکن مایحملہ علی اطعامھم". (فتح البیان ج۱۰ ص ۵۴)

''اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وہ شخص آخرت کا قائل نہ تھا اس لیے کہ لوگ مساکین سے کھانے کا بدلہ نہیں طلب کیا کرتے، وہ انہیں محض اللہ کی رضا اور آخرت میں ثواب کی امید پر کھلاتے ہیں تو جب وہ آخرت پر ایمان نہیں لایا تو کوئی چیز ایسی

نہیں، جو اسے کھلانے پر اُبھارے۔

نواب صاحب کی اس تفسیر کو مان لیا جائے تو سرے سے بات ہی ختم ہو جاتی ہے اور کوئی اشکال باقی نہیں رہتا، اس لیے کہ یہ عذاب اللہ کو نہ ماننے پر بھی ہو سکتا ہے اور یہی عذاب آخرت کے انکار پر بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں مجموعہ مراد لینا اور مجموعے پر عذاب ثابت کرنا ضروری نہیں رہتا۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''حضِ اطعام'' حقوق العباد سے کنایہ ہے اور حقوق العباد نہ کرنے کا سبب عدمِ ایمان ہے۔ چنانچہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو اس قدر سخت عذاب اس وجہ سے ہوگا کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ادا نہ کرتا تھا۔ حقوق اللہ تو اس طرح کہ اللہ پر ہی ایمان نہ رکھتا تھا اور حقوق العباد اس طرح کہ کسی غریب، مسکین کی مدد کرنا اور اس کو کھلانا، پلانا تو درکنار، اسے اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی تھی کہ کسی دُوسرے ہی کو مسکین کی امداد پر اُبھار دیتا۔

خلاصہ یہ کہ وہ حقوق العباد ادا نہ کرتا تھا، جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان نہ رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کے اندر مخلوق کے لیے رحم وشفقت اور ان کی اعانت وامداد کا جذبہ بھی نہ تھا۔ اس صورت میں بھی حاصل یہی نکلتا ہے کہ ترکِ حضِ اطعام سے مراد عدم ایمان باللہ ہے۔ یہی تفسیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

''یہاں اطعام اور حض سے مراد مرتبہ واجبہ ہے اور اس کے ترک سے مُراد وہ ترک جس کا سبب عدم ایمان ہو۔ حاصل یہ کہ خُدا کی عظمت اور مخلوق کی شفقت جو اصل عبادات متعلقہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں یہ دونوں کا تارک اور منکر تھا، اس

لیے مستحق عذاب ہوا۔" (بیان القرآن ج۱۲ص۳۶)

اِس تفسیر کی روشنی میں بھی مجموعہ مراد لینے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ دونوں کا مآل ایک ہی نکلتا ہے، اور اگر بالفرض یہاں "حضِ اطعام" سے مراد ایمان بالآخرۃ یا حقوق کی ادائیگی نہ ہو بلکہ اس کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تب بھی زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں یہی کہا جاسکے گا کہ یہاں جس عذاب کا ذکر ہے، وہ صرف "حضِ اطعام" کے ترک کی سزا نہیں، لیکن یہ کیسے لازم آگیا کہ جہاں کہیں دو یا دو سے زیادہ اشیاء کی حرمت کا تذکرہ ہوگا، وہاں ان میں سے کوئی چیز اپنی انفرادی حیثیت میں حرام نہ ہوگی؟ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام میں سوّر، کتّا، بلّی حرام ہے تو کیا کوئی صاحبِ عقل اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ سور اسی وقت حرام ہوگا، جب اسے کتے، بلّی کے ساتھ ملاکر کھایا جائے، اور تنہا کھایا جائے تو حرام نہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ اس قسم کے بے سروپا تاویلات سے ہر صاحبِ ایمان کو محفوظ رکھے۔

حدیث پر ایک اور اعتراض

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی "صحیح" میں یوں ذکر کیا ہے:۔

"وقال هشام بن عمار حدثنا صدقة بن خالد الخ

جس سے علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ تعالیٰ کو یہ وہم ہوگیا کہ حدیث منقطع ہے، چنانچہ انہوں نے لکھ دیا کہ۔

"اس حدیث سے حُرمتِ معازف پر استدلال درست نہیں، کیونکہ هٰذا منقطع ولم يتصل مابين البخاری وصدقة بن خالد" یعنی یہ حدیث منقطع ہے اور امام بخاری اور صدقہ بن خالد کے درمیان

اتصال نہیں ہے۔'' (المحلی، احکام البیوع، مسئلہ ۱۵۶۵ ج ۹ ص ۵۹)

لیکن اول تو ہمارا استدلال روایتِ بخاری پر موقوف نہیں، کیونکہ امام بخاری کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی یہی روایت، انہی الفاظ میں نہایت قوی سند سے ذکر کی ہے، چنانچہ بیہقی (ج ۱ ص ۲۲۱) کو دیکھا جاسکتا ہے۔

دُوسرے خاص بخاری کی اس روایت کے بارے میں بھی علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کا یہ دعویٰ درست نہیں بلکہ خلافِ حقیقت اور سراسر وہم ہے، چنانچہ محدثین نے ان کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے اور بعض نے علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کے اس دعوے کی تردید میں مستقل رسائل لکھے ہیں، ہمارے زمانے میں بھی ناصر الدین البانی نے ایک مستقل جزء (رسالہ) علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کے اس دعوے کی تردید میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ شرّاحِ بخاری نے نہایت تفصیل و تحقیق سے اس اعتراض کا جواب دیا ہے، بالخصوص حافظ ابن حجر رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کی ذکر کردہ بحث خاص طویل اور مفید ہے۔ ذیل میں ہم کچھ جوابات کا خلاصہ ذکر کرتے ہیں:۔

یہ حدیث صحیح متصل ہے، کیونکہ ہشام بن عمّار امام بخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کے مشہور اُستاذ ہیں، اور امام بخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے ان سے کئی جگہ روایات لی ہیں، البتہ اس حدیث کو امام بخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے ہشام سے مذاکرۃً یعنی باہمی گفتگو کے دوران سُنا ہے، باقاعدہ تلمذ کے لیے بیٹھ کر اور دورانِ درس نہیں سُنا۔ اسی بنا پر انھوں نے احتیاط سے کام لیا ہے اور مذاکرے کی روایت کے لیے حَدَّثَنَا یا عَنْ کے بجائے قَالَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ علامہ عینی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ کا رجحان اسی طرف ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۹۱)

❷ جس جگہ امام بخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ یہ کہتے ہیں کہ قَالَ فُلَانٌ اور اپنے

کسی شیخ کا نام ذکر کردیتے ہیں تو وہ حدیث ''صحیح'' اور ''معنعن'' ہوتی ہے، کیونکہ ان کا قال جیسا جزم کا لفظ استعمال فرمانا اور اس کے بعد اپنے کسی ایسے شخص کا ذکر کرنا جو ان کے مشہور استاذ ہیں، صحتِ حدیث کی قطعی دلیل ہے، کیوں کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون تدلیس سے بچنے والا ہے؟

(اغاثۃ اللھفان ج ۱ص ۲۶۰ و فتح الباری ج ۱ص ۴۶)

۳ چلیئے اگر یہ مان بھی لیں کہ یہ حدیث متعلق ہے اور بظاہر منقطع نظر آتی ہے تو بھی اُصولِ حدیث کا مسئلہ ہے کہ ''صحیح بخاری'' کی تعلیقات صحیح متصل حدیثیں ہوتی ہیں، جنہیں بعض مصالح کی بناء پر امام بخاری معلق ذکر کردیتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ ''صحیح بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ میں جو احادیث تعلیقاً ذکر کی گئی ہیں اور بظاہر منقطع معلوم ہوتی ہیں وہ درحقیقت منقطع نہیں ہیں، لہٰذا انہیں منقطع کہنا اور ان پر ضعف کا حکم لگانا درست نہیں، چنانچہ حافظ ابن حزم کا یہ دعویٰ کہ حدیث **لیکونن من امتی اقوام یستحلون الخ** منقطع ہے۔ ہرگز لائق اعتناء نہیں بلکہ کئی وجوہ کی بناء پر غلط ہے، کیونکہ یہ حدیث صحیح کی شرط کے مطابق معروف الاتصال ہے۔''

دراصل یہ شبہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس اُسلوبِ نگارش سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات ایک حدیث کو کسی ایسی مصلحت کے پیش نظر جس سے انقطاع کا عیب بھی پیدا نہ ہو، معلّقاً ذکر کردیتے ہیں، مثلاً یہ مصلحت کہ اسی حدیث کو انہوں نے اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہ متصل ذکر کیا ہوتا ہے۔ (علوم الحدیث ص ۶۱، ۶۲)

۴ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو اپنی کتاب صحیح بخاری

میں ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے احادیثِ صحیحہ کا التزام برتا ہے، نیز پھر اس روایت کو انہوں نے بطور دلیل پیش کیا ہے، محض استشہاداً انہیں ذکر کیا ہے، ان کا اس روایت پر اس درجہ اعتماد کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔ (تہذیب السنن لابن القیم الجوزی رحمہ اللہ تعالیٰ ج ۵ ص ۲۷۲)

❺ یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح متصل ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسے خود ہشام سے سُنا ہے، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دُوسرے حفّاظِ حدیث نے اسی حدیث کو ہشام سے موصولاً نقل کیا ہے۔

چنانچہ امام اسمٰعیلی اور طبرانی، نیز امام بیہقی نے ہشام سے تحدیث کی تصریح کی ہے، جب کہ ابونعیم اور ابن حبان نے اسے معنعن نقل کیا ہے۔

(فتح الباری وتہذیب السنن، بحوالۂ مذکورہ) (ماہنامہ البلاغ کراچی مارچ ۱۹۸۱ء)



مفتیٔ اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم تقریر کے

اِقتباسات

جو پاکستان سے دیوبند پہنچ کر دارالعلوم دیوبند کے عظیم اجتماع میں کی گئی

ہجرت پاکستان کے تیرہ سال بعد والدِ ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دیوبند کے عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر پاکستان سے دیوبند تشریف لے گئے، وہیں سے تھانہ بھون اور دہلی کا بھی سفر ہوا، اس کا سبق آموز دلچسپ سفرنامہ حضرت والدِ ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقوش وتأثرات کے نام سے قلمبند فرمایا تھا جو طبع ہو چکا ہے۔

خوبی قسمت سے احقر راقم الحروف بھی اس تاریخی سفر میں ساتھ تھا۔ حضرت والد صاحب کے دیوبند پہنچنے پر لوگوں کی خوشی کا یہ حال تھا کہ پورے قصبہ میں عید کا سماں معلوم ہوتا تھا۔

۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو بعد عشاء دارالعلوم دیوبند کے منتظمین، اساتذہ کرام اور طلبہ کے اصرار پر آپ نے دارالعلوم کے دارالحدیث میں ایک اثر انگیز خطاب فرمایا، دارالحدیث کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ متعدد اہل علم نے اس خطاب کو بروقت قلمبند فرمالیا

تھا، مگر افسوس کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ احقر نے بھی اس خطاب کا خلاصہ قلم بند کیا تھا، اب ۲۴ سال بعد کاپی میں وہ نظر آیا تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کے اہم اقتباسات، ملفوظات اور حکایات ہدیۂ ناظرین کردی جائیں۔ واللّٰہ المستعان۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۷ شعبان ۱۴۰۴ھ
۹ مئی ۱۹۸۴ء



خطبۂ مسنونہ اور مشکوٰۃ شریف کی دو حدیثیں پڑھنے کے بعد آپ نے طلبہ سے خطاب فرمایا کہ عزیزو! شاید آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ میں کسی دقیق علمی بحث کو آپ کے سامنے پیش کروں گا، اور میرے نفس کے جذبات بھی اسی طرح چل رہے ہیں۔ لیکن میں یہ علمی گناہ اسی جگہ پہلے بہت کر چکا ہوں۔ اب بحمد اللہ اس خودنمائی کے گناہ سے توبہ کر چکا ہوں۔ چند پھیکے پھیکے کلماتِ نصیحت عرض کروں گا۔

ملفوظ ۱:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ درس میں طلبہ سے فرماتے تھے کہ:۔
''جاہلین! اس فن میں دُنیا تو کبھی تھی ہی نہیں ایک دین تھا مگر وہ تم نے نہ لیا۔''

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ:

احمد غزالی اور محمد غزالی رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو ان کی بیوہ ماں نے صرف اس لئے مدرسہ نظامیہ بغداد میں داخل کیا تھا کہ ان کی پرورش ہو جائے گی، مگر بعد میں وہ ''حجۃ الاسلام'' بنے وزیر اعظم نے مدرسہ کے طلباء کا جائزہ لیا اور ہر ایک سے

پوچھا کہ علم دین حاصل کرنے سے ان کا مقصد کیا ہے؟ ہر ایک نے کہا کہ میں فلاں عہدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، دل برداشتہ ہو کر اس نے سوچا کہ مدرسہ بند کردے، ذرا آگے چلا تو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ جو اس وقت طالب علم تھے مطالعہ کرتے ہوئے نظر آئے ان سے تعلیم کا مقصد پوچھا تو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''ہم نے عقل سے پہچانا کہ ہم کو ایک پیدا کرنے والا ہے اور عقل سے ہی یہ پہچانا کہ ایسی ہستی کا احسان مند ہو کر اس کی اطاعت کرنا ہمارا فرض ہے اور اطاعت کا طریقہ معلوم کرنے کا ذریعہ رسالت اور وحی ہے لہٰذا ہمارے تحصیل علم کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی پسندیدہ اشیاء پر عمل کریں، اور ناپسندیدہ اعمال سے پرہیز کریں۔''

ملفوظ ۲:

غالباً حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰه فَاَبیٰ اَنْ یَکُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ

ترجمہ: ہم نے علم حاصل تو غیر اللہ (دُنیا) کیلئے کیا تھا، لیکن علم نے غیر اللہ کیلئے ہونے سے انکار کردیا۔ یعنی علم کی برکت سے ہماری نیّت بھی درست ہوگئی۔

ملفوظ ۳:

حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ:

''تحصیل علم میں اگر نیت صحیح بھی نہ ہو تب بھی علم کو چھوڑنا نہیں چاہیئے، کیونکہ علم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیت بھی صحیح ہوجاتی ہے۔''

امام محمدؒ کے متعلق خواب

امام محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کو (جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشہور شاگردِ رشید ہیں) ان کی وفات کے بعد خواب میں کسی نے دیکھا کہ اللہ

تعالیٰ نے اُن سے، ارشاد فرمایا کہ اے محمّد! اگر میرا تجھ پر احسان کرنے کا ارادہ نہ ہوتا تو تجھے علم نہ دیتا۔

ملفوظ ٤:

علامہ زرنوجی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی امام کا قول نقل کیا ہے کہ:

اَلْعِلْمُ لَایُعْطِیْكَ بَعْضَه حَتّٰی تُعطِیَه کُلَّكَ

یعنی علم تم کو اپنا کچھ حصہ نہیں دے گا جب تک کہ تم اس کو اپنا سب کچھ نہ دیدو۔

ایک طالب علم کا واقعہ

ہمارے بزرگ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ وحضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ جب دہلی میں پڑھتے تھے اُس وقت ان کے ایک ساتھی کا واقعہ ہے کہ مطالعہ کے لئے روشنی کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے وہ حلوائی کی دُکان کے سامنے کھڑے ہوکر مطالعہ کیا کرتے تھے۔

مولانا عبدالحیٔ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ

مولانا عبدالحیٔ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھنوی کے والد مولانا عبدالحلیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کے علمی شغف کا امتحان لیا کہ جب بیٹے نے نوکر سے پانی مانگا تو اشارہ کردیا کہ تیل کا پیالہ آگے کردو، صاحبزادے مطالعہ میں ایسے منہمک تھے کہ دیکھے بغیر ہی اسے پینے لگے تو باپ نے پیالہ اُن سے ہٹایا۔

ملفوظ ۵:

طالب علم کو ہر منافی علم کام سے پرہیز کرنا چاہیئے، اس وقت جس فن میں خامی رہ جاتی ہے وہ عموماً کبھی دُور نہیں ہوتی۔

ملفوظ ٦:

حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اسی موضوع پر اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ:

"اَدَوَاتِ علم کا ادب اسبابِ حصول علم میں سے ہے"۔

یعنی علم جن جن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے ان سب کا ادب کرنا چاہیئے۔اس سے علم میں برکت ہوتی ہے۔

ملفوظ ۷:

حصولِ علم کے اسباب میں سے ایک اہم چیز تقویٰ ہے، عمل کے لئے تو وقت کی ضرورت ہوتی ہے مگر تقویٰ کے لئے وقت کی بھی ضرورت نہیں۔

مسلکِ دیوبند کیا ہے؟

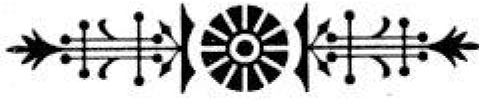
آپ حضرات کو ابھی اس نعمتِ خداوندی کی قدر نہیں ہے کہ اُس نے آپ کا تعلیمی رشتہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک کردیا، جب اس "بسم اللہ کے گنبد" سے آپ باہر نکلیں گے اور کتاب وسنّت اور فقہی مسائل ہی کی تعبیر میں آپ کو افراط وتفریط کا ایک بھیانک منظر سامنے آجائے گا اُس وقت معلوم ہوگا کہ دیوبند اور اس کا معتدل مسلک کیسی عظیم نعمت ہے۔

میں بھی طالب علمی کے زمانہ میں آپ کی طرح محض اپنے والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم سے متعلق ہوا، اور مسلکِ دیوبند بھی تقلیداً اختیار کیا، لیکن دُنیا کے نشیب وفراز اور سرد وگرم چکھنے، اور فرقہ وارانہ مباحث سے گزرنے کے بعد اپنی تحقیق سے اس مسلکِ اعتدال کی خوبیاں مستحضر ہوئیں۔ وطن کے اعتبار سے تو میں دیوبندی فطرۃً تھا، اور مسلک کے اعتبار سے تقلیداً، لیکن طویل غور وفکر،

بحث و تمحیص اور تجربہ کے بعد مسلکِ دیو بند کا محض تقلید سے نہیں، بلکہ بصیرت سے پابند ہوں۔

آخر میں ایک مختصر جملہ اس کے متعلق بھی سُن لیجئے کہ دیوبند کوئی جُداگانہ مذہب نہیں، بلکہ قرآن وسنّت کی صحیح تعبیر و تعمیل کا، اور رفض وخروج، اعتزال وظاہریت، تقلید وعدم تقلید، بزرگانِ سلف کے اتباع وانکار کے مختلف مسلکوں میں سے ایک نہایت معتدل مسلک کا نام دیوبند ہے، جس میں تقلید اور تنقید کو اپنی اپنی حد میں اختیار کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس روحِ دیوبند کو ہمیشہ دیوبند میں باقی رکھے، اور مجھے اور آپ سب کو دیوبند کے سچّے خادموں میں محشور فرمائے۔ آمین

(بحوالہ ماہنامہ البلاغ کراچی جون ۱۹۹۴ء)



افادات: از حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
مرتبہ: مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

الرشید، دار العلوم دیوبند (۱۳۳۲ہجری)

مدینہ منوّرہ میں سب سے پہلا اِسلامی مدرسہ

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شہر میں اسلامی یونیورسٹی قائم ہونے کی دل خوش کن خبریں آجکل اخباروں میں گشت کررہی ہیں۔ لہٰذا دیندار مسلمانوں کو بلدۂ طیبہ کے سب سے پہلے مدرسہ کا حال یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت میں اضافہ ہوکر اتباع کی تحریک ہوتی ہے۔ (فقیر اصغر حسین۔ محرم ۱۳۳۲ھ)

حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مختلف ذرائع سے مختلف فرقے ایک اولوالعزم پیغمبر کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ مدینہ کے مشرکین اور یہود میں جب کچھ مخالفت اور جنگ ہوجاتی تو یہود کہا کرتے تھے کہ ذرا ٹھہرو عنقریب ایک پیغمبر مبعوث ہونیوالے ہیں، ان کے ساتھ مل کر ہم اپنا بدلہ لیں گے۔

حج کے ایام میں ایک مرتبہ حضور فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل اور مختلف اقوام کو پیام الٰہی پہنچا کر بلّغ ماانزل الیك من ربك کی تعمیل فرمارہے تھے کہ اہل مدینہ کی ایک خوش قسمت جماعت سامنے آگئی۔ آپ نے حسب عادت اُصول اسلام پیش کرکے دین خداوندی میں داخل ہونے کی رغبت دلائی ان حضرات کے قلوب تو حق تعالیٰ نے نور ایمانی سے منور ہونیکے لئے مستعد بنا ہی رکھے تھے، تاہم کہنے لگے کہ یہ تو وہی نبی معلوم

ہوتے ہیں جن کا ہمارے ہم وطن یہودی ذکر کیا کرتے ہیں۔ آپ کی تصدیق دل میں جاگزیں ہوگئی اور سات معتبر و معزز آدمی اسی وقت مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

مدینہ منورہ میں پہنچ کر ان لوگوں نے دین حق کی اشاعت شروع کردی اور اپنے مقصد میں اچھی کامیابی حاصل کر کے بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔

دوسرے سال حج کے موقع پر ان بزرگوں میں سے پانچ آدمی اپنے ہمراہ دوسرے نئے سات منتخب لوگوں کو لیکر حضور نبوی ﷺ کی خدمت میں نہایت مخفی طریقہ سے حاضر ہوئے اور یہ بارہ شخص اسلام کی ضروری باتوں پر بیعت کر کے رخصت ہوئے واپسی میں آپنے حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (جو رسول خدا کی محبت میں تمام مال و دولت چھوڑ کر نہایت فقیرانہ حالت میں قرآن و اسلام سیکھ رہے تھے) ان لوگوں کے ساتھ روانہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو قرآن مجید کی تعلیم اور امور اسلام کی تلقین کریں۔

مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ میں پہنچ کر حضرت اسعد بن [1] بن زرارہ کے مہان ہوئے اور ان کے مشورے سے بنی ظفر کے ایک وسیع مکان میں سیدھے سادے مگر اسلامی دُنیا کے بہترین مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ مدینہ منورہ کے مسلمان ان کے گرد جمع ہوگئے اور احکام و مسائل کی تعلیم پانے اور ذوق و شوق سے قرآن مجید یاد کرنے لگے۔

اس مدرسہ کا افتتاح اہلِ مدینہ کے لئے کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بہت جلد تمام شہر میں اس کی خبر پھیل گئی اور جہاں دینِ حق کے شیدائیوں کی امیدوں میں اس خبر نے تازہ جان ڈالدی، وہاں مخالفان اسلام کی آتشِ بغض و عداوت کو بھڑکا دیا۔

[1] بہت بڑے انصاری صحابی ہیں بیعت عقبیٰ میں سب سے پہلے انہوں نے بیعت کی ہے۔ یہ اور ذکوان بن عبدالقیس سب سے اوّل مدینہ منورہ میں مسلمان ہوکر آئے ہیں۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلے ان کا انتقال ہوا۔ اور سب سے پہلی نماز جنازہ ان کی پڑھی گئی تھی موت کے وقت کسی قدر سونے چاندی کے زیور کی جن میں موتی جڑے ہوئے تھے انہوں نے حضور ﷺ کے لئے وصیت کی تھی آپ نے وہ زیور ان کی دونوں بیٹیوں کو پہنادیئے۔ ۱۲

بنی عبدالاشہل مدینہ منورہ کا ایک بہت پُرقوت قبیلہ تھا اس کے دو بڑے سرداروں اسید بن حضیر اور سعد بن محاذ نے یہ شہرہ سُنا تو سعد نے اسید سے کہا کہ تم جا کر اس شورش کو موقوف کرواؤ اور ان لوگوں کو روکو مجھے اپنے خالہ زاد بھائی اسعد بن زرارہ سے لحاظ آتا ہے ورنہ میں خود جا کر روکدیتا۔

جناب اسید اپنا نیزہ لیکر اُٹھے اور اسلامی مدرسہ میں پہنچ کر مصعب بن عمیر اور اسعد بن زرارہ کو مصروف تعلیم پایا۔ اُسید نے دھمکا کر مصعب سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ ہمارے بھولے بھالے لوگوں کو بہکاتے ہو۔ یہاں سے چلے جاؤ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ کیا خوب ہو اگر آپ ٹھہریں اور ہماری بات سُن لیں اگر آپ کو پسند آجائے تو قبول کرلیں، ناپسند ہو تو اپنے پاس سے ہٹادیں، اُسید نے کہا کہ ہاں یہ معقول بات ہے اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔

حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اصول واحکامِ اسلام بیان کرنے لگے اور اُسید قربان ہونے لگے اور کہا کہ یہ تو نہایت اچھا دین اور جلیل القدر مذہب ہے جب تم لوگ اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟

مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھ گئے اور فرمایا، تم غسل کرو، اور کپڑے پاک کرو، کلمہ شہادت پڑھو اور دو رکعت نماز پڑھو۔ اُسید نہایت خوشی اور جوش سے تمام افعال بجالائے اور مسلمان ہوگئے اور کہا کہ میں ایک شخص کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں، اب جا کر اسے بھیجتا ہوں۔ اگر وہ اس دین میں داخل ہوجائے تو پھر کوئی تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتا یہ کہکر اُسید اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔

سعد منتظر بیٹھے تھے دُور سے دیکھ کر کہدیا کہ ''خدا کی قسم اُسید کی وہ حالت نہیں رہی جس پر گئے تھے''۔ قریب آئے تو پوچھا کہو کیا بات دیکھی۔ اسید نے جواب دیا کہ میں نے دونوں سے خوب گفتگو کی، معلوم ہوا کہ وہ کوئی بے موقع بات نہیں

کہتے مگر میں نے افسوس کیساتھ سُنا ہے کہ بنی حارثہ اسعد بن زرارہ کے قتل پر آمادہ ہوکر جارہے ہیں۔ سعد کو یہ سُنکر بہت غصہ آیا اور جلد وہاں پہنچنے کے لئے اُٹھے اور آکر دیکھا کہ اسعد اور مصعب دونوں نہایت آزادی اور اطمینان سے اپنا کام کررہے ہیں۔

سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ سمجھ گئے کہ گو ارادہ قتل کی خبر بھی بے اصل نہ تھی لیکن اسید رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ کا مقصد صرف مجھ کو یہاں بھیجنا تھا اور اسعد بن زرارہ سے کہا کہ اگر تم کو مجھ سے قرابت کا تعلق نہ ہوتا تو تم مجھ سے اسقدر مروّت کی امید نہ رکھتے۔

حضرت مصعب رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نے ان سے بھی یہی کہا کہ یہ نہایت آسان بات ہے کہ آپ ہماری بات سُن لیں پھر اگر آپ قبول کرلیں تو بہت خوب ہے، اور اگر بُرا سمجھیں تو ہم کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے!

سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ بیٹھ گئے تو مصعب رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نے اصول اسلام سُنا کر قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ کا قلب تو خدا تعالیٰ نے نہایت ہی قابل بنا رکھا تھا سُنتے ہی فریفتہ ہوگئے اور اس مبارک مذہب میں داخل ہونے کا طریقہ پوچھا۔ مصعب رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نے کپڑوں کی پاکی اور غسل و وضو اور کلمۂ شہادت اور دو رکعت نماز کا ارشاد کیا۔ سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نے بخوبی غسل و وضو کیا، کپڑے پاک کئے اور صدقِ دل سے مسلمان ہوکر نماز پڑھی۔

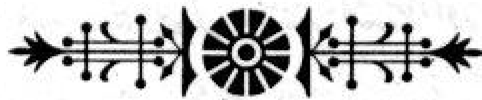
اب حضرت سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نور ایمانی سے منور ہوکر اور حضرت اُسید رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ کو ساتھ لیکر اپنی قوم کے مجمع میں تشریف لائے اور کہا کہ:

بنی عبد الاشہل کے لوگو! بتلاؤ میری نسبت کیا خیال رکھتے ہو؟ سب کہنے لگے کہ آپ ہمارے سردار ہمارے مقتدا ہم سب سے افضل ہو۔ سعد رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُ نے فرمایا کہ اب میری وہ حالت ہوگئی کہ میں تم میں سے کسی مرد وعورت سے بات کرنا بھی گوارا نہ کروں گا جب تک کہ تم خدا اور رسول صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم پر ایمان نہ لے آؤ۔

قبیلہ کے سب لوگ سمجھ گئے ایسے بڑے معتمد سردار نے بلا وجہ ایسا بڑا تغیر اختیار نہ کیا ہوگا۔ اور شام تک رفتہ رفتہ تمام مرد وعورت مشرف بہ ایمان واسلام ہو گئے۔

یہ فخر المدارس چونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی کا فخر رکھتا تھا اس لئے مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے معاونین کی تعلیم ودعوت الی الحق سے چند ہی روز میں تمام مدینہ کو اسلام سے منور کر دیا اور (سوائے چند جگہ کے) گھر گھر میں مسلمان نظر آنے لگا۔ کہیں بیٹا مسلمان ہے باپ اور تمام لوگ مشرک، کہیں ایک بھائی مسلمان ہے دوسرا اس کا دشمن کہیں شوہر مسلمان ہے زوجہ بدستور کافرہ ہے۔

ہمارے فخر المدرسین حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں اپنے کام میں مصروف رہے یہاں تک کہ معلم الاسلام والمسلمین مصداق ''علّمت علم الاوّلین والآخرین'' نے خود مدینہ منورہ میں تشریف لاکر اس تعلیم گاہ کو تمام دنیا کے لئے سرچشمۂ رحمت وہدایت بنا دیا۔ (ماہنامہ الرشید لاہور مئی ۱۹۸۱ء)



حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا سفرنامۂ شام

مکاتیب کے آئینے میں

''حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۶ء میں موتمر عالم اسلامی کی دعوت پر شام، اردن اور لبنان کا سفر کیا تھا۔ اس وقت کے چند خطوط جو آپ نے گھر والوں کو لکھے ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ۔ بندۂ عاجز بعون اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ۱۵/ذیقعدہ ۷۵ھ مطابق ۲۵ جون ۶۵ء کو بعد العشاء تقریباً ۱۰/ بجے کراچی کے شہر سے ایروڈروم پر گیا، تمہارے سب بھائی اور عزیز ہوائی اڈہ پر ساتھ تھے۔ نظریں تمہیں اس مجمع میں ڈھونڈتی تھیں۔ خصوصاً اس مرتبہ تمہاری ٹیلیفون کی گفتگو اور خطوط سے میرے اس سفر کا خاص اثر ظاہر ہو رہا تھا۔ اس لئے بھی تعلق خاطر رہا۔ بالآخر طیارہ بجائے ۱۲ بجے کے ایک بجے یہاں سے روانہ ہوا اور ۶ بجے بحرین میں اترا۔ یہاں چائے پی اور نمازِ صبح ادا کی۔ ۷ بجے پھر جہاز بیروت کے لئے روانہ ہوا۔ بحرین تک کا سفر کچھ نیا نہ تھا۔ پہلے بھی جدہ جاتے ہوئے یہ راستہ طے کیا تھا۔ مگر اس مرتبہ بحرین میں وہ گرمی محسوس نہیں ہوئی جو پچھلی دو مرتبہ میں ہوا کرتی تھی۔ بحرین کے بعد جہاز نے شمال مغرب کا راستہ اختیار کیا۔ کچھ دیر دریا پر اڑتا رہا، اس کے بعد صحرا پر سفر ہوتا رہا۔ کہیں دور دور بستی کے آثار نہ تھے۔ حدود شام میں داخل ہونے کے بعد کچھ سبزی اور بستیاں نظر آئیں۔ گیارہ بجے طیارہ بیروت اترا۔ یہاں پاکستانی الیکشن کے افسر جعفری صاحب مع اپنے عملہ کے اور کچھ لبنانی حکومت کے آفیسر اور کچھ دمشق

سے برائے استقبال آنے والے حضرات موجود تھے۔ایک گھنٹہ تقریباً یہاں کے مطار(ہوائی اڈہ) پر قیام رہا۔پھر اس کے متصل بیروت میں ایک جماعت عباد الرحمٰن کے نام سے قائم ہے۔اس کے رکن حوری صاحب کے مکان پر ایک گھنٹہ قیام رہا۔ یہاں کپڑے بدلے، ہماری گھڑی کے اعتبار سے وقت ایک بجے تھا مگر یہاں کا وقت ۳ گھنٹہ آگے ہے۔اس لئے اپنی گھڑی یہاں کے مطابق کر کے گیارہ پر کردی۔ یہاں کے ۱۱ بجے بیروت سے دمشق کے لئے موٹر پر روانہ ہوئے۔ لبنان اور سوایہی کی سرحد سے استقبال کرنے والے اور کچھ مؤتمر کے اجلاس میں جانیوالے حضرات سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ایک بجے کے قریب موٹر شہر دمشق کے قریب پہنچا۔ جہاں ایک طرف جبل قاسیون صنوبر کے درختوں سے چھپا ہوا اور جگہ جگہ چشموں اور نہروں سے بھرا ہوا اور دوسری طرف اسی طرح کا ایک دوسرا پہاڑ ہے۔اس مقام کو یہاں ربوہ کہا جاتا ہے اور مشہور یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے بربوة ذات قرار و معین وہ یہی جگہ ہے۔اس کے قریب ایک مقام غوطہ کے نام سے ہے یہ بھی باغات اور درختوں سے چھپا ہوا۔نہروں اور چشموں سے بھرا ہوا ایک پہاڑ ہے جس پر مقامات حریری میں ایک مقامہ لکھا گیا ہے۔شہر بیروت سے لے کر یہاں تک راستہ میں ایسے ہی دلکش مناظر ہیں۔تمام راستہ میں پہاڑوں کے عجیب وغریب مناظر ہیں۔عام طور پر صنوبر کے درخت ہیں جن کا پھل یہاں کے وزیر اعظم تھے اور بعض دوسرے وزراء اور علمائے کرام کی بڑی جماعت جن میں شیخ امجد زہاوی وغیر پہلے سے معروف تھے، استقبال کے لئے تشریف لائے۔اس کے ساتھ شہر دمشق میں داخل ہوئے۔سمیر ہوٹل میں منجانب مؤتمر قیام کا انتظام تھا اس میں مقیم ہوگئے۔ یہاں کے ہوٹل نہایت شاندار، بارونق اور پر فضا ہیں۔کراچی کا بڑے سے بڑا ہوٹل اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔کراچی کے زینت تکلفات مصنوعی کا نتیجہ ہیں اور یہاں کے شہر کے زینت قدرتی بھی ہے اور عمارات بھی شاندار مثل کراچی کے ہیں۔ یہاں کے

کھانے اور پھل بھی نہایت بہتر ہیں، جواب سے پہلے کہیں نہیں پائے۔ کھانوں کی قسمیں اکثر اپنے بلاد سے ملتی جلتی ہیں۔

مؤتمر کا اجلاس ۱۷ر ذی قعدہ سہ شنبہ کی صبح سے شروع ہو چکا تھا۔ ہم ظہر کے وقت پہنچے۔ کھانے پر چند حضرات نے بطورِ شکریہ تقریریں کیں جن میں یہاں کے وزیر عدل مصطفےٰ زرقا کی تقریر اہم تھی۔ انڈونیشیا کے نمائندے ڈاکٹر ناصر جو پہلے وہاں وزیر اعظم بھی رہے ہیں، انہوں نے عربی میں جوابی تقریر اپنے ایک نمائندہ سے کرائی۔ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کے لئے وقت ملا۔ مگر ہمیں دوشنبہ کا تمام دن ویزا اور ایکھینج کے چکر میں اس طرح گزرا تھا کہ ایک منٹ کی مہلت نہ ملی۔ پھر رات کے ایک بجے تک ایروڈرم پر طیارہ کے انتظار میں گزری۔ صبح سے پہلے طلباء بحرین اتر گیا۔ اس لئے رات میں بھی کچھ آرام نہ ملا تھا۔ اس وقت بدن تو تھکان سے چور چور ہو چکا تھا۔ مگر نینداس وقت بھی نہ آئی۔ ۵ بجے شام سے مؤتمر کا اجلاس ہوا۔ اس میں شریک ہوئے۔ سات بجے تک یہ اجلاس رہا۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر ۸ بجے سے دوسرا اجلاس یہاں کی یونیورسٹی میں تھا۔ اس اجلاس میں ہر ملک کے نمائندوں کے مختصر تقریروں کا سلسلہ چلا جو رات کے بارہ بجے تک رہا۔ اسوقت نیند کا یہ عالم کہ کرسی سے گرا جاتا تھا۔ مگر یہاں بیٹھنے پر مجبور تھا۔ بارہ بجے اجلاس ختم کر کے کھانے اور پھر نماز عشاء سے فارغ ہوتے ہوتے دو بج گئے۔ اس وقت سونے کا موقع ملا۔ یہ سب تعب ہوا لیکن الحمد اللہ صحت پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا۔ صبح کو ناشتہ کے بعد آٹھ بجے سے مؤتمر کا اجلاس شروع ہو کر بارہ بجے تک چلا۔ پھر کھانے پر اجتماع ہوا۔ یہاں عرب کا یہ رواج عام ہے کہ کھانا بھی ایک مستقل جلسہ ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد مختلف لوگوں کی تقریریں ہوتی ہیں۔ آج اس موقعہ پر میری بھی ایک مختصر عربی میں تقریر ہوئی۔ پھر شام کے ۵ بجے سے رات تک یہی سلسلہ اجلاس کا چلا۔ ۱۹ر ذیقعدہ ۷۵ھ جون ۵۶ء کو پھر شام کے ۵ بجے رات تک اجلاس رہا۔

میں آخر اجلاس سے اٹھ کر مدینہ طیبہ کے لئے ٹکٹ حاصل کرنے کے واسطے سید عبدالحمید الخطیب صاحب کو ساتھ لے کر خطوط سعودیہ میں چلا گیا تھا۔ ہنوز ٹکٹ کا انتظام نہ ہوا۔ پھر خطیب صاحب کے ساتھ ان کے اپنے مکان پر جو ربوہ میں نیا بنایا ہے، حاضر ہوا، مکان کے اندر سے نہر چل رہی ہے جا بجا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا جمعیۃ غزا کی طرف سے یہاں کے ایک تفریحی ہوٹل منتزہ الفردوس میں تھا۔ یہ ہوٹل ایسا ہے جیسا کراچی میں بیچ لگژری ہوٹل ہے۔ مگر اس کی قدرتی رعنائی اور دلفریب باغات میں منظر سے بیچ لگژری کو کوئی مناسبت نہیں۔ اسی ربوہ کے پہاڑ پر واقع ہے، باغات ہی باغات ہیں۔ چشمے اور نہریں ہیں اور جا بجا فوارے ہیں۔ اس دعوت میں حکومت سوریہ کے وزیر اعظم بھی شریک تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر آرام کیا، شام کے ۵ بجے سے پھر اجلاس تھا جو ساڑھے آٹھ پر ختم ہوا۔ نو بجے صدر اسمبلی کی طرف سے ادریا ہوٹل میں دعوت تھی۔ شاہی طرح کی مہمانی رہی۔ گیارہ بجے فراغت ہوئی۔ آج جمعہ کا روز ہے۔ مؤتمر میں آئے ہوئے علماء اطراف میں سے ایک متقی عالم عبدالفتاح ابوغدہ حلب کے رہنے والے ہیں۔ یہ آج صبح تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دمشق کے مشرقی جانب جو اکابر کے مزارات ہیں، ان کی زیارت کے لئے جانا ہوا ان میں سے ایک حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار ہے۔ دوسرے اوس بن ثقفی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا، ابن قیم، علامہ شامی اور صاحب درالمختار علامہ علاؤ الدین کے مزارات بھی ایک ہی جگہ ہیں، ان کی زیارت نصیب ہوئی۔ ابھی ابھی وہاں سے آکر یہ خط لکھا ہے۔ اب جلسے میں جانے کی تیاری ہے اپنا تجویز یہ ہے کہ ۳۱ / جون کو یہاں کا اجلاس ختم کر کے بیت المقدس اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ کی طرف جانا ہے۔ یہاں سے تقریباً ۳ / جولائی تک واپسی ہوگی۔ فکر یہ ہے کہ ۴ / ، ۵ / جولائی کو جہاز جانے والا ہے، خدا کرے اس میں انتظام ہوجائے۔ مکہ معظّمہ میں

عبدالرزاق معلم کو اور ان کی معرفت عزیز شفقت علی کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ بھی ۵؍جولائی تک کے لئے مدینہ کا ٹکٹ کریں۔ مگر ہنوز کوئی انتظام نہیں ہوا۔ یہ اپنی تجویز ہے آگے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو منظور ہے، میں نے اس خط میں گویا اس وقت تک کا سفر نامہ لکھ دیا ہے۔ اس کی ایک نقل فوراً کراچی بھیج دیں کیونکہ سب کو علیحدہ علیحدہ تفصیلات لکھنا مشکل ہے۔ اور رفیع سلمہ، کو تقاضہ لکھیں کہ یہ خط محفوظ رکھیں۔

والسلام ''محمد شفیع'' یوم الجمعہ ۲۰؍ذیقعدہ ۷۵ھ ۳۰ جون ۵۶ء۔

برخورداران عزیز محمد رضی وولی ورفیع وتقی ومولوی نور احمد وشریف حسین وجملہ عزیزان السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ یہاں پہنچ کر اگلے ہی روز ایک مفصل خط تمہارے نام لکھا تھا اور آج ایک مفصل سفر نامہ محمد زکی سلمہ، کے نام لاہور کے لئے لکھا ہے اس میں آج قبل الجمعہ تک کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ خط لاہور سے محمد زکی تمہارے پاس بھی بھیجیں گے۔ آج یہ معلوم ہوا کہ دمشق سے کراچی جانے والی ڈاک شنبہ، سہ شنبہ کو نکلتی ہے۔ اس لئے غالباً میرا پہلا خط بھی ابھی تک یہیں ڈاک میں پڑا ہوگا، کل کا سفر نامہ محمد زکی سلمہ، کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے پہونچے گا۔ جی چاہے تو محفوظ رکھیں۔ اخبارات میں شائع نہ کریں بجز اس مختصر خبر کے جو آخر خط میں لکھوں گا۔

آج صبح مؤتمر کا اجلاس جمعہ کی وجہ سے ۱۰ بجے بند کر دیا گیا۔ یہاں جمعہ بارہ بجے ہوتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے جامع اموی میں پہلے پہل حاضری ہوئی جس کو جامع دمشق بھی کہا جاتا ہے۔ اصل میں تعمیر اسلام سے پہلے کی ہے۔ کوئی عبادت گاہ کسی امت کی پہلے سے تھی، حضرت داؤد علیہ الصلاۃ والسلام کے بعض آثار یہاں بتلائے جاتے ہیں۔ حضرت زکریا علیہ الصلاۃ والسلام کا مزار مسجد کے اندر ہے۔ مسجد کے شمال میں شہدائے کربلا کے سر مدفون ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر زمانہ اسلام میں ولید بن عبدالملک کی طرف منسوب ہے۔ اس کو جامع کی شکل شاید اسی وقت دی گئی اور اس وقت سے

تقریباً آج تک خلفاء ملوک کا گہوارہ رہی۔اس کے عظیم الشان منبر ان لوگوں کی یاد گار ہے۔ جمعہ کا خطبہ وحید رمضان نے دیا۔نماز جمعہ کے بعد مراکش، جزائر کے لوگوں نے تقریریں کیں۔ یہاں سے فارغ ہوکر جلسہ گاہ میں پہنچے۔یہیں کھانے کا انتظام تھا۔کھانے سے فراغت کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ایک گھنٹہ کے بعد نیند کے غلبہ کی وجہ سے میں جلسہ چھوڑ کر آرام گاہ پر آ گیا۔عصر تک آرام کیا۔بعد عصر پھر جلسہ میں حاضر ہوا۔مغرب تک اجلاس رہا۔ بعد مغرب دید عبدالحمید خطیب، سابق سفیر سعودی پاکستان کے مکان پر دعوت تھی، وہاں گئے۔خطیب صاحب نے یہ نیا مکان ربوہ کے ایک ایسے پر فضا مقام پر بنایا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔نہر بردہ ان کے مکان کے نیچے سے گذرتی ہے اور اس نہر کی شاخیں گھر کے کمروں کے نیچے سے مکان کے اندر ایک آبشار کی صورت میں لائی گئی ہیں۔ پانی اتنا سرد ہے کہ عشاء کا وضو اس پانی سے کرنا دشوار ہوگیا۔سردی کی وجہ سے چادر کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔کھانے سے فراغت کے بعد خطیب صاحب نے ایک خطبہ دیا۔گیارہ بجے شب واپس آکر آرام کیا۔اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔جلسہ میں جانا ہے۔ڈاک آج پاکستان کو جارہی ہے۔اس لئے یہ خط جلدی میں پورا کر رہا ہوں، آج اجلاس مؤتمر ختم ہوجائیگا اور کل انشاء اللہ تعالیٰ دمشق سے فلسطین بیت المقدس کی طرف جائیں گے۔

تحقیق کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے مدینہ کا ٹکٹ نہیں ملتا بلکہ صرف جدہ کا ملتا ہے۔اس لئے شاید ہمیں یہ کرنا پڑے کہ ۵رتاریخ جولائی کو یہاں سے جدہ پہنچیں۔وہاں سے مدینہ آئیں۔ برخوردار شفقت کے رہتے اگر یہ خط مل جائے تو ان کو بتلادیں کہ مدینہ طیبہ جائے منزل جدہ میں حکیم معیم صاحب سے ہمارے متعلق دریافت کرلیں کہ یہاں آئے ہیں یا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم سب جدہ میں جمع ہوجائیں اور وہاں سے مدینہ کا سفر بھی ساتھ ہو۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ مدینہ طیبہ

جانے کے لئے جدہ میں وہ بھی اپنا قیام حجاج منزل میں رکھیں۔ ہم بھی اگر سید ھے جدہ پہنچے تو حجاج منزل ہی میں اتر کر مدینہ طیبہ جانے کا انتظام کریں گے۔

میں یہ تفصیلی خط آپ سب اور خصوصاً والدہ صاحبہ اور تمہاری والدہ کے اطمینان کے لئے لکھتا ہوں اور یہ کہ یہ سفر نامہ بھی محفوظ ہو جائے۔

یہاں کے پھل اور کھانے بھی اتنی اقسام واجناس کے ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ جو پھل اور کھانے ہماری طرف معروف ہیں وہ یہاں نہایت نفیس اور بہتر ہیں۔ اس کو جنۃ الارض کہا جائے تو مبالغہ نہیں۔ اس خط میں جتنا جز سفر نامہ ہے اس کو نقل کر کے محمد زکی سلمہٗ کے پاس بھی بھیج دیں تو بہتر ہے۔ والسلام بندہ محمد شفیع عفی عنہ یوم شنبہ ۳۱ / جون ۵۶ء

محمد شفیع من عمان (الأردن) صبیحتہ یوم الاثنین ۲/ جولائی ۵۶ء

عزیز محترم مولوی نور احمد صاحب ومحمد رضی، محمد رفیع، محمد ولی، محمد تقی سلمہم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔ صبح یوم السبت ۳۱/ جولائی تک کے حالات لکھ چکا ہوں۔ یوم السبت ۳۱/ جولائی کو ۱۲ بجے تک مؤتمر کا اجلاس رہا۔ اس کے بعد وزیر اعظم سوریہ کی طرف سے ایک ہوٹل میں دعوت، وہاں ۲ بجے تک دعوت کا سلسلہ رہا۔ وزیر اعظم نے شرکاءِ مؤتمر کا خاص احترام کیا۔ یہاں کے کھانوں کے تکلفات کراچی سے زیادہ نظر آئے۔ ۲ بجے واپس آ کر تھوڑے سے آرام کے بعد پھر جلسہ میں شرکت کی جو عصر تک چلا۔ عصر کے بعد صدر مملکت کی طرف سے چائے کی دعوت تھی، وہاں گئے۔ صدر مملکت نے وزیر اعظم سے بھی زیادہ اصحاب مؤتمر کا احترام کیا۔ مغرب کی نماز یہیں ادا کی۔ صدر مملکت نے ایک بہترین تقریر کی، جس میں مؤتمر کے مقاصد کی بڑی حمایت تھی اور اسلامی مقاصد پر بہت مؤثر تقریر کی، پھر سب کے ساتھ نماز مغرب ادا کی۔ جوابی تقریر ڈاکٹر ناصر انڈونیشیا نے کی۔ بعد

مغرب چائے کے نام سے ایک خاص طرح کا کھانا تھا۔ میں نے گرانیٔ طبع کی وجہ سے کھانے میں شرکت نہیں کی۔ اس دعوت سے واپسی کے بعد پھر مؤتمر کا بقیہ اجلاس تھا جو نو بجے شب تک چلا۔ اس کے بعد جامع دنگیز جو ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے مگر فرانس نے ہنگامہ میں شہید کر دی تھی، ہنوز تعمیر جاری ہے اس میں جلسۂ عام منعقد ہوا۔ میں گیارہ بجے تک اس میں شرکت کر کے مستقر پر واپس آ گیا۔ یہ جلسہ رات کے دو بجے تک چلا۔ میں آ کر سو گیا۔ صبح کی قرارداد یہ تھی کہ استاذ عبدالفتاح ابوغدہ علی کے ساتھ مفتی ابوالیسر مفتی سوریا کے مکان پر جانا تھا یہ علامہ ابن عابدین شامی کے پوتے ہیں۔ علامہ ذی علم آدمی ہیں۔ ان سے اس وقت ملاقات کا پروگرام تھا۔ مگر رات کو دیر تک جاگنے کے سبب ابوغدہ نہ آ سکے۔ ٹیلیفون پر بتلایا کہ اس کام کے لئے دوسرا وقت مقرر کریں گے۔ اب آگے پروگرام قدس کے لئے روانگی کا تھا، اصحاب مؤتمر کے اعزاز میں یہ ریل کا پورا سفر آمد و رفت اپنے مصارف پر رکھا۔ اسٹیشن پر وزیر مواصلات اور دوسرے وزراء کو پیغام بھیجا۔ ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو آدھا گھنٹہ ریل کو لیٹ کیا اور احترام کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔ دمشق سے گاڑی روانہ ہو کر چھوٹے اسٹیشنوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچی جس کو یہاں کے لوگ درعاء بولتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر حدیث میں بین اذرعات وبصریٰ کے نام سے آیا ہے۔ بصری یہاں سے فاصلہ پر ایک دوسرا مقام ہے جہاں تک رسول کریم ﷺ اپنے عم محترم ابوطالب کے ساتھ زمانہ طفولیت میں تشریف لا کر واپس ہوئے تھے۔ درعا کے مقام پر اخوان المسلمین کے لوگوں کا خاصا اجتماع تھا۔ یہ لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ فوری اطلاع ملنے پر شہر سے دوڑتے ہوئے ریل پر پہنچے۔ ملاقات ہوئی۔ یہاں سے رخصت ہو کر دوسرا بڑا اسٹیشن زرقاء آیا۔ یہ ایک بڑا شہر ہے نہر زرقاء کے اوپر واقع ہے۔ نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ حدیث و تاریخ میں الزرقاء کا جو ذکر آتا

ہے وہ غالباً یہی جگہ ہے۔ یہاں بھی اخوان کی ایک بڑی مقدار میں روزانہ نکالا جاتا ہے۔ امریکہ ہی ان چیزوں کا ٹھیکہ دار ہے وہ لے جاتا ہے۔ زرقاءٗ سے آگے ایک اسٹیشن صبیحہ کا آیا۔ اس کے بعد عمان کا اسٹیشن آ گیا۔ یہ نیا شہر بسایا گیا ہے۔ قدیم بستی مختصر تھی۔ آج کل مملکت اردن کا دارالحکومت یہی ہے۔ تقریباً ۳ بجے عمان پہنچ کر یہاں پلیس ہوٹل میں قیام کیا۔ کھانے کے بعد آرام کیا۔ رات آرام سے گزاری اس وقت ۸ بجے صبح کو رئیس مملکت اردن کے پاس جانے کے تیاری ہے۔ ان کی ملاقات کے بعد قدس کو روانگی بذریعہ موٹر ہوگی۔ ہم اپنا سامان درست کر کے رئیس مملکت کے یہاں جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ اس فرصت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آج انشاء اللہ تعالیٰ ظہر کی نماز مسجد اقصیٰ میں پڑھیں گے اور اس کے بعد قدس کے دوسرے مقامات کی زیارت کے لئے عصر کے بعد مقام خلیل الرحمن جائیں گے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مزار ہے، اس کے بعد بیت اللحم کے مولد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بحر لوط اور موسیٰ نبی مقامات کی زیارت کے فلسطین کے اس حصہ کو دیکھنے جائیں گے جہاں یہودیوں کا تغلب ہے۔ کل صبح ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہو کر نظام الاوقات کے مطابق کام ہو سکا تو انشاء اللہ دمشق کل شام تک واپس چلے جائیں گے۔ ایک روز دمشق میں قیام اور وہاں کی سیر اور بزرگوں سے ملاقات کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ مدینہ طیبہ کو روانگی ہوگی۔

میں اپنے سفر کے مختصر حالات مسلسل لکھ رہا ہوں۔ کوئی کسی کے نام اور کچھ کسی کے نام۔ مناسب یہ ہے کہ ان سب کو یک جا جمع کر لیا جائے۔ آپ بھی یہ خط پڑھ کر محمد رفیع کو حوالہ کر دیں کہ پچھلے خطوط کے ساتھ محفوظ رکھے۔

میری طبیعت بحمد اللہ اس وقت بالکل اچھی ہے اور ہر طرح راحت و آرام سے سفر ہو رہا ہے۔ والدہ صاحبہ اور اپنی والدہ کا پورا اطمینان کر دیں۔ والسلام

''محمد شفیع''

بندہ محمد شفیع از دمشق سوریہ

یوم الجمعہ ۲۶ ذیقعدہ ۷۵ھ۔ ۶/ جولائی ۵۶ء

عزیزان محترمان سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔ میں اب تک آپ لوگوں کو اپنا مکمل سفرنامہ لکھتا رہا ہوں۔ آخری خط عمان سے روانہ کیا تھا۔ اتوار کا روز شب عمان میں گذار کر دوشنبہ ۲/ جولائی کی صبح کو ہم سب قدس کے لئے ٹیکسیوں پر روانہ ہوئے۔ عمان تک تو سفر ریل کا تھا اور اس کا انتظام حکومت سوریہ نے کیا تھا۔ عمان اردن کا دارالحکومت ہے۔ ان لوگوں نے بھی اعضاء مؤتمر کا خاصا اکرام کیا۔ صبح آٹھ بجے بارہ ٹیکسیوں پر ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ اردن کا علاقہ بھی سوریہ کی طرح نہایت سرسبز وشاداب پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، ہر طرف نہریں ہیں۔ انجیر اور زیتون کے درختوں کی کثرت ہے۔ تربوز نہایت اچھا ہوتا ہے۔ خوبانیاں جن کو یہاں مشمش کہتے ہیں کراچی سے بڑی اور نہایت شیریں ہیں۔ آلوچہ بھی وہاں سے زیادہ شاداب اور شیریں ہے اور بھی مختلف قسم کے عمدہ پھل پائے جاتے ہیں۔ دمشق اور اردن میں یہ چیزیں مشترک ہیں۔ عمان سے روانہ ہوکر پہلے راستہ میں ایک قصبہ صویلحیہ آیا۔ چھوٹا سا قصبہ ہے، مگر قدیم زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک بڑا شہر جو عمان کی طرح پورے پہاڑ پر نیچے سے اوپر ایک چادر کی طرح پھیلا ہوا ہے، اس میں آیا۔ اس کا نام سلط ہے۔ یہ ترکوں کے زمانہ میں اس علاقہ کا دارالحکومت تھا۔ جنگ عظیم دوم اور ترکی خلافت کے زوال کے بعد جب ولایت شام چار حصوں میں تقسیم کرکے لبنان، سوریہ، اردن، فلسطین میں تقسیم کردیا گیا اور پھر اردن کی حکومت کو اس کی انگریز نوازی کے صلہ میں ایک چھوٹا حصہ مسجد اقصیٰ اور شہر قدس کا ایک حد دے کر حکومت اردن قرار دیا اور باقی شہر قدس اور فلسطین یہودیوں کے حوالہ کیا۔ اس وقت سے اس کا دارالحکومت عمان ہوا۔ سلط میں قیام نہیں ہوا۔ اس کے

آگے بڑھے تو ہمارے سیارات کچھ پیچھے رہ گئے تھے، ایک نہر کے کنارے سڑک پر ہوٹل تھا وہاں ٹھہر کر رفقاء کا انتظار کیا۔ مختلف پھل خریدے اور کھائے۔ شہ توت بہت شیریں تھے۔

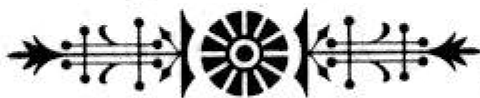
یہاں سے آگے بڑھے تو ایک ایسی وادی سے گزر ہوا، جس کا نام وادیٔ شعیب تھا۔ حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف منسوب ہے۔ یہ وادی کافی دور تک چلی۔ اس کے بعد نہر اردن آئی جس کے مشرق میں حکومت اردنی کا علاقہ ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو شرق الاردن کہتے ہیں۔ نہر اردن وہی نہر ہے جس کا قرآن کریم میں جالوت وطالوت کے قصہ میں ذکر ہے۔ ان اللہ مبتلیکم ـــــ۔ نہر پار کر کے فلسطین کے اس حصہ میں داخل ہوئے جو اب حکومت اردن کے تحت ہے۔ اس کا بڑا حصہ خشک پہاڑوں اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے شہر اریحاء آیا جو دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ تورات وانجیل میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس وقت بھی خاصا آباد ہے اس کے قریب مہاجرین فلسطین کی نو آبادی ہے۔

آج جمعہ کا دن ہے اور ہم مدینہ طیبہ کیلئے جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ تھوڑی سی فرصت میں یہاں تک لکھ سکا تھا کہ اب ہوائی اڈہ پر جانے کا مطالبہ پہنچ گیا۔ اس لئے خط کو یہیں ختم کر کے مطار پر جارہا ہوں، نو بجے ہیں۔ غالبًا ایک بجے تک ان شاء اللہ تعالیٰ مدینہ طیبہ پہنچ کر معلومات ہوں گی۔ والسلام

والدہ صاحبہ اور سب عزیزوں کو سلام ودعا۔

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(بحوالہ البلاغ مفتی اعظم نمبر جدید طباعت جولائی ۲۰۰۵ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

شمالی افریقہ میں نورِ نبوّت کی پہلی کرن

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شاہِ حبشہ کے دربار میں تعلیماتِ نبوی کا نہایت بلیغ خلاصہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب کے زبان سے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے مسودات کے فائل سے غیر مطبوعہ مضمون جو ۷۸ھ بمطابق ۵۸ء میں لکھا گیا تھا، پیش خدمت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کا چالیسواں سال اور عطائے نبوت کا چھٹا سال اللہ کا نام لینے والی مٹھی بھر اُمت مسلمہ کے لئے ایک عجیب ابتلاؤ امتحان اور انتہائی مصائب و آلام کا دور تھا۔ عرب کے سارے قبائل نے اس پر حلف اور معاہدہ کرلیا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے گنے چُنے مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کر کے اُن کو مجبور کر دیا جائے کہ یا وہ اپنے دین کو چھوڑ کر پھر ان میں شامل ہو جائیں یا بھوک پیاس سے مر جائیں۔ اور آپ کے خاندان میں سے جو لوگ آپ کی کچھ بھی حمایت کریں ان کا بھی اسی طرح مقاطعہ کر دیا جائے جس کے نتیجہ میں ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے پورے خاندان اس مکمل بائیکاٹ کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ مکہ کے بازاروں میں ان لوگوں کو ایک دانہ نہ ملتا تھا، ان کے بھوکے بچوں کے بلبلانے پر بھی کسی کو رحم نہ آتا تھا۔ جنگل کی گھاس اور پتے ان کی غذا رہ گئی تھی۔

اس وقت رحمۃ للعٰلمین نے سب مسلمانوں کو حکم دیا کہ اب اس زمین کو چھوڑ کر متفرق ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں پھر جمع فرما دیں گے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا کہاں جائیں؟ تو حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا، ان حضرات نے جن کے مردوں کی تعداد تراسی اور عورتوں کی اٹھارہ تھی اس ارشاد کے مطابق حبشہ کا قصد کیا اور متفرق طور پر خفیہ خفیہ اُس طرف چلنا شروع ہوئے یہاں تک کہ ساحلِ سمندر پر سب جمع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ غیبی مدد فرمائی کہ اس وقت دو تجارتی جہاز حبشہ کی طرف جانے والے مِل گئے اور ان سب کو آدھا دینار کرایہ لے کر سوار کر لیا۔ ان حضرات نے حبشہ کی زمین پر اُتر کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔

مگر قریشِ مکّہ کو ان کی کینہ پروری اور جوشِ غیظ وغضب نے اس پر بھی نہ رہنے دیا کہ یہ لوگ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر نکل گئے اس لئے اپنے دو سردار عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو ان کے پیچھے شاہ حبشہ کو کچھ تحفے بھیجے اور اس کے ساتھ یہ درخواست بھیجی کہ یہ لوگ ہمارے خاندان کے افراد ہیں ہمارے دین سے نکل گئے اور آپ کے دین یعنی عیسائیت میں داخل نہیں ہوئے، ان کو ہمارے حوالہ کر کے مکہ بھیج دیا جائے۔

عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید نے یہ بھی ہوشیاری کی کہ شاہ حبشہ کے لئے تو تحفے لے ہی گئے تھے ان کی سلطنت کے امراء و وزراء اور علماء سب کے لئے علیحدہ تحفے لے گئے تا کہ وہ سب ان کی حمایت کریں اور شاہ کے پاس جانے سے پہلے یہ تحفے وزراء و امراء میں تقسیم کر کے انکی ہمدردی اپنے ساتھ کر لی اور پھر شاہ حبشہ کے پاس پہنچ کر بتلایا کہ یہ لوگ ہمارے دینِ آبائی سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں داخل نہیں ہوئے بلکہ ایک نیا دین انہوں نے گھڑا ہے جو ہمارے اور تمہارے دونوں مذہبوں کے خلاف ہے اور ہم میں سے چند بے وقوف لوگوں کے سوا کسی نے اس دین کو قبول نہیں کیا۔ شاہِ حبشہ چونکہ اُس وقت عیسائی تھا، اس سے یہ بھی کہا کہ یہ

لوگ حضرت عیسی علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہا الصلاۃ والسلام کی توہین کرتے ہیں، ان کو بُرا بھلا کہتے ہیں ان کو آپ فوری طور پر اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیں اور ہمارے ساتھ بھیجدیں۔

شاہِ حبشہ نے اپنے ارکانِ دولت سے مشورہ کیا وہ پہلے ہی ہموار ہو چکے تھے، سب نے یہی مشورہ دیا کہ ہم تو ان لوگوں کے حالات سے واقف نہیں اور آنے والا وفد اور ان کی قوم ان کے حالات سے پوری طرح واقف ہے، ہمیں چاہیئے کہ بغیر کسی تفتیش اور تحقیق کے ان لوگوں کو آنے والے وفد کے حوالہ کر کے اپنے ملک سے نکال دیں۔

لیکن نجاشی شاہ حبشہ تورات وانجیل کا عالم اور مذہب کا پابند تھا۔ اس نے کہا کہ واللہ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا کہ یکطرفہ بیان سُن کر کوئی فیصلہ کروں بلکہ ان لوگوں کو بلا کر خود ان سے حالات دریافت کروں گا پھر جو کچھ صحیح معلوم ہوگا اس پر عمل کروں گا۔ اسی قرارداد کے مطابق شاہی فرمان ان مسافروں کے پاس بھیجدیا۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو سہم گئے اور آپس میں گفتگو ہونے لگی کہ شاہ حبشہ سے کس قسم کی گفتگو کی جائے۔ اور کون کرے؟ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب نے خود بڑھ کر فرمایا کہ میں گفتگو کروں گا۔ آپ سب خاموش رہیں۔ ان حضرات نے سوال کیا آپ کیا گفتگو کریں گے؟ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت بھی جو بات کہی وہ ہر مسلمان کو یاد رکھنے اور حرزِ جاں بنانے کی چیز ہے۔ فرمایا کہ۔

''میرے نزدیک یہ کوئی فکر کی چیز نہیں ہمیں جو کچھ معلوم ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے بغیر کسی جھجک یا ملمع سازی کے صاف صاف وہی بیان کریں گے انجام کچھ بھی ہو''۔

سب نے اس پر اتفاق کیا اور شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔

حق و باطل کا یہ ہنگامہ بھی قابل دید تھا کہ ایک طرف رؤساء قریش کا بھیجا ہوا وفد بڑی عزت وشان کے ساتھ شاہی دربار میں موجود ہے۔ اور اس نے پہلے سے تحفہ تحائف کے ذریعہ امراء دولت کی ہمدردیاں حاصل کرلی ہیں۔ پھر ایک خالی الذہن مختار مطلق بادشاہ کے کان اپنے حریف کی برائیوں سے بھر دیئے ہیں اور بادشاہ کو یہ بھی بتلا دیا ہے کہ یہ لوگ نہ بادشاہ کو سجدہ کریں گے نہ شاہی آداب بجالائیں گے۔ متکبر سرکش لوگ ہیں۔ اور دوسری طرف چند بیکس مسافر ہیں جن کا امراءدولت میں نہ کوئی تعارف ہے نہ سہارا۔

مگر یہ حق کے پرستار قرآنی آیات سے سرشار ہی دربار میں اجازت لے کر داخل ہوتے ہیں۔ تو خالص اسلامی طرز کی رسمِ سلام ادا کرکے بیٹھ جاتے، نہ درباری سلام، نہ رکوع نہ سجدہ۔

شاہ حبشہ نے سوال کیا کہ آپ لوگ شاہی آداب کیوں بجانہیں لائے نہ سجدہ کیا اور نہ درباری رسم کے مطابق سلامی دی؟؟

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے، نجاشی حبشہ نے سوال کیا کہ تم نے اپنے آباؤاجداد کا دین چھوڑا اور ہمارے دین یعنی عیسائیت میں بھی داخل نہیں ہوئے تو وہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے؟

اس وقت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو دینِ اسلام کی ترجمانی کی ہے وہ آبِ زر سے لکھنے اور ہمیشہ یادرکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے اس کو انہیں کے متبرک الفاظ میں مع ترجمہ کے لکھتا ہوں:۔

ایھا الملك كنا قوما اهل جاهلية نعبدا لاصنام ونا كل الميتة وناتی الفواحش ونقطع الارحام ونسیئی الجوار ویاکل القوی الضعیف فكنا علىٰ ذلك حتی بعث الله لنا رسولاً كما بعث الرسل الیٰ من قبلنا و ذلك الرسول منانعلم نسبه و صدقه

وامانته وعفافه فدعا الیٰ اللّٰه تعالیٰ لنوحده و نعبده ونخلع ما کان یعبد آباؤنا من دونه من الحجارة والاوثان وامنا ان نعبداللّٰه تعالیٰ وحده وامرنا بالصلوة والزکوٰة والصیام وامرنا بصدق الحدیث واداء الامانة وصلة الارحام وحسن الجوار والکف عن المَحَارِمِ والدماءِ ونهاناعن الفواحش وقول الزور واکل مال الیتیم وقذف المحصنات فصد قناه وآمنابه.

(سیرتِ حلبیہ ص۳۴۱ ج۱)

ترجمہ: اے بادشاہ! ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے کہ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے اور مردار جانور کھاتے اور بے حیائی کے سارے کام کرتے تھے۔ عزیزوں سے قطع تعلّق، ہمسایون کے ساتھ بدسلوکی ہمارا شیوہ تھا، ہمارا قوی ہمارے ضعیف کو کھا جاتا تھا، ہم اس تاریکی اور گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ، نے ہم میں اپنا ایک رسول بھیجا جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ دستور رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کی عبادت ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں اُن سب کو چھوڑ دیں، اور ہمیں نماز، صدقہ اور روزہ کا حکم دیا اور سچ بولنے اور امانت ادا کرنے اور عزیزوں کے حقوق ادا کرنے کا پابند کیا، پڑوسیوں سے اچھا سلوک سکھایا اور حرام چیزوں، خونریزی سے بچنے کی ہدایت فرمائی اور بے حیائی کے کاموں سے منع فرمایا، جھوٹ بولنے اور یتیموں کا مال کھانے اور عفیف پاکدامن عورت پر تہمت لگانے سے سختی کے ساتھ روکا، ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اصول اسلام اور تعلیماتِ رسول ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ہم نے اللہ کے رسول پر ایمان اور ان کی پیروی

اختیار کر لی تو ہماری قوم قریش نے ہم پر ظلم وتعدی شروع کر دی تا کہ وہ پھر ہمیں بت پرستی اور گندی چیزوں میں مبتلا کر دیں۔ جب ان کا ظلم و جور حد سے گزر گیا اور زندگی ہم پر تلخ ہوگئی تو ہم نے آپ کے ملک کا رُخ کیا اور دوسرے ملکوں سے اس کو اس لئے ترجیح دی کہ ہمارا گمان آپ کے متعلق یہ تھا کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا، ہم پر ظلم نہ ہوگا۔

نجاشی ملک حبشہ اور اس کے امراء ووزراء، حضرات جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان اور اسلامی تعلیمات کی خوبی وہمہ گیری سے متاثر ہو چکے تھے، نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ جو کتاب آپ کے رسول پر نازل ہوئی ہے اس کا کچھ حصّہ تمہارے پاس ہے؟ جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ صرف پاس نہیں بلکہ سینوں میں محفوظ ہے نجاشی نے اس کے سننے کی درخواست کی تو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورہ مریم کی چند آیات پڑھ کر سُنائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یکے بعد دیگرے ان کی درخواست پر سب سُنائی ہوں۔

آیات قرآنی سُننے کا یہ اثر سب لوگوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ شاہِ حبشہ نجاشی اور اس کے امراء ووزراء سب پر گریہ طاری تھا، آنسو بہہ رہے تھے.........!

نجاشی چونکہ تورات وانجیل کا عالم تھا، اور کچھ عرصہ عرب میں رہ کر عربی زبان سے بھی کافی واقفیت حاصل کئے ہوئے تھا۔ یہ آیات سُن کر بول اُٹھا۔

"ان ھذاوالذی جاء بہ موسیٰ لیخرج من مشکوٰۃ واحدۃ (سیرت حلبیہ)

یعنی! یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام یا بعض روایات میں عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں۔ ایک ہی مرکز نور سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

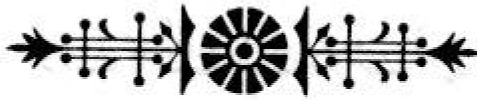
اس وقت شاہِ حبشہ اور اس کا پورا دربار کلام ربانی کے اثرات سے لبریز اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان سے متاثر تھا۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اب ذرا ان لوگوں سے بھی تو پوچھئے کہ انہوں نے ہمارا تعاقب کیوں کیا؟ اور کیوں

ہمیں اپنی حراست میں مکّہ لے جانا چاہتے ہیں، ان سے دریافت کیجئے کہ ہم آزاد ہیں یا ان کے غلام ہیں اور بھاگ کر آگئے ہیں۔ اگر ہم ان کے بھاگے ہوئے غلام ہیں تو بیشک ان کو مطالبہ کا حق حاصل ہے اور آپکو چاہیئے کہ ہمیں ان کے حوالہ کر دیں۔ نجاشی نے ان سے سوال کیا تو عمرو بن عاص کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ صحیح بات کا اقرار کریں کہ یہ لوگ غلام نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ اس کے بعد حضرت جعفرؓ نے فرمایا کہ شاہ! ان سے دریافت کیجئے کہ ہم نے کوئی خون کیا ہے یا ان کے کسی آدمی کو قتل کیا ہے جو یہ ہم سے قصاص لینے کے لئے یا ہم نے ان کا کچھ مال لیا ہے جس کو وصول کرنے کے لئے انہوں نے ہمارا پیچھا کیا ہے؟ عمرو بن عاص نے ان دونوں سوالوں کے جواب میں بھی اس کا اقرار کیا کہ انہوں نے کسی کو قتل کیا نہ کسی کا مال لیا۔ اب نجاشی نے خود ایک سوال کیا کہ کیا پھر ان لوگوں کے ذمّہ آپ کا کچھ قرض ہے؟ عمرو بن عاص نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔

اب تو نجاشی شاہ حبشہ پر حقیقت حال پوری طرح روشن ہوگئی تو فرمایا خدا کی قسم اگر تم لوگ ایک پہاڑ سونے کا مجھے دے دو تب بھی میں ان کو تمہارے حوالہ ہرگز نہ کروں گا اور حکم دیا کہ یہ لوگ جو ہدیہ تحفہ لے کر آئے ہیں وہ واپس کردیا جائے اور ان کو یہاں سے واپس بھیج دیا جائے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حبشہ میں کسی تبلیغ و دعوت کی نیت سے نہیں بلکہ صرف اپنی حفاظت اور امن کی خاطر داخل ہوئے تھے۔ مگر دشمنوں کے تعاقب نے ان کو اور ان کے دین حق کو حبشہ کے سرکاری حلقوں اور عوام میں اس طرح روشناس کرادیا کہ سب کے سب اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوگئے اور ان میں سے بہت سے مسلمان بھی ہوگئے، خود نجاشی شاہ حبشہ نے بھی بالآخر اسلام قبول کیا۔

یہ ہے اشاعتِ اسلام اور اس کے عالمگیر اثرات کا نمونہ کہ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و معاملات خود ایک جادو کی تاثیر رکھتے تھے۔ جس جگہ پہنچ گئے

ملکوں اور قوموں کی کایا پلٹ دی۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو بیان میں نے ان کے عربی الفاظ میں نقل کیا ہے یہ تعلیمات اسلام کا ایک بہترین اجمال ہے۔ جس سے اس کا بھی انداز کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم انسانیت پر کتنا بڑا احسان فرمایا کہ کفر و شرک، ظلم و جور، گندگی و ناپاکی اور ناحق شناسی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا کو ایک بقعۂ نور میں لے آئے، انسان جو چوپایوں سے اور وحشی درندوں کی صف میں بلکہ اس سے بھی نیچے گر چکا تھا اس کو اس قعر مذلت سے نکالا اور ایک صحیح مقام پر پہنچا دیا۔ (ماہنامہ الاشرف کراچی۔ جون ۱۹۸۷ء)



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اسلامی خلافت

ملوکیت ہے _ یا _ جمہوریت

اسلام جس توسط واعتدال کو اپنے ساتھ لایا ہے اس کے آثار تمام اسلامی احکام، اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات، سیاسیات ومعاشریات میں نمایاں طور پر مشاہد ہیں اور یہی اعتدال اس امت کی طرۂ امتیاز ہے۔

و كذالك جعلنا كم امة وسطالتكونوا شهداء على الناس. (بقره. ۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط امت بنائی ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

مکہ معظمہ کی زاہدانہ زندگی کے بعد جب اسلام تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے اپنی سیاست اور تدبیر مما لک میں بھی اسی اعتدال اور توسط سے کام لیا۔ اور ملوکیت وجمہوریت کے افراط وتفریط کو اٹھا کر سلطنت وسیاست کا ایک ایسا محکم قانون تیار کیا جو تمام مفاسد سے پاک اور تدبیر مما لک کی تمام ضروریات کے لئے صحیح معنوں میں کفیل ہے۔

ملوکیت اور شخصیت کے مفاسد

تو محتاج بیان نہیں کیونکہ مروّجہ ملوکیت کا خلاصہ یہ ہے کہ

1. تمام مما لک ایک شخص کا غلام بلکہ غلاموں سے زیادہ پابند ہو۔
2. یہ شخص ظلم کرے یا انصاف کسی کو اس کے خلاف لب کھولنے کا حق نہ ہو۔

۳ عہد سلطنت اس کی نسل میں متوارث ہو باپ کے مرنے کے بعد سارا ملک بیٹے کے قبضے میں آجائے خواہ یہ کیسا ہی جاہل بدخلق اور نااہل، نالائق ہو۔

۴ تمام ملک کے جان و مال اس کی ایک جنبش لب سے زیروزبر ہوسکتے ہیں۔

الغرض شخصیت کا قانون محض بادشاہ کی زبان ہے اور تمام خلق اللہ کی موت و حیات محض اس کے رحم پر موقوف ہے۔ ساری مخلوق اس کی ذاتی خواہشات کی تختۂ مشق ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت سے نظام سلطنت کیا قائم رہ سکتا ہے اور لوگوں کے حقوق کیا ادا ہوسکتے ہیں۔

جمہوریت کے مفاسد

آج کل کی مصطلحہ اور مروجہ جمہوریت میں اگرچہ وہ مفاسد نہیں جو ملوکیت میں بیان کئے گئے لیکن اس میں بعض دوسرے ایسے مفاسد موجود ہیں جو نظام عالم کے قطعاً خلاف ہیں۔

۱ پہلی بات تو یہی ہے کہ جمہوریت میں امیر و بادشاہ کی حقیقت ایک شطرنج کے بادشاہ سے زائد نہیں صرف اتنی عنایت اس کے حال پر کیجاتی ہے کہ اس کی رائے کو دو رائے کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور بس حالانکہ عالم کا فطری نظام اول سے آخر تک اسی کا مقتضی ہے کہ نظام سلطنت کا ذمہ دار کوئی بااختیار شخص ہونا چاہیئے جس کو حقیقی طور پر امیر و حاکم کہا جاسکے اور جو امور سلطنت کے حل و عقد کا مالک ہو اور جس کی اطاعت تمام رعایا پر فرض ہو۔

۲ دوسرے ممبران جمہوریت کے باہمی اختلاف رائے کے وقت جمہوریت کا فیصلہ کثرت رائے کے تابع ہوتا ہے کثرت رائے کے مقابلہ میں نہ امیر کی کوئی ہستی ہے اور نہ دوسرے اہل رائے اور تجربہ کار لوگوں کی۔

اور یہ ایک ایسی اصولی غلطی ہے جو سینکڑوں غلطیاں اپنے دامن میں رکھتی ہے۔

آج ہمارے یہاں کونسلوں اور بورڈ کے الیکشن میں جو طوفان بے تمیزی کے منظر سامنے آتے ہیں اور کثرت رائے کے فیصلوں کے جو ناگوار نتائج ہیں روز مرّہ بھگتنے پڑتے ہیں ان کے مفاسد سے شاید کوئی انسان آنکھ نہ چرا سکے۔ آٹھ آٹھ آنہ میں رائے بکتی ہے ہر فریق کثرت رائے حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھیار کام میں لاتا ہے۔

تعلقات کے دباؤ زور وزر کی نمائشوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں اور بالآخر نتیجہ اس شخص کے ہاتھ ہوتا ہے جس کی کرہ میں روپیہ زیادہ ہو اور جو فضولیات میں بے دریغ خرچ کرنے کا عادی ہو۔ یا جس کے تعلقات سے یا زور سے لوگ مرعوب ہوں، یہ ایک ایسی بداہت ہے کہ جس کا ہر شخص سالانہ مشاہدہ کرتا ہے۔

اور پھر یہ طوفان بے تمیزی اپنی برکات جو ملک میں چھوڑ جاتا ہے وہ سب سے زیادہ قابل غور ہیں الیکشن کا فتنہ تو چند روز میں ختم ہو جاتا ہے لیکن باہمی خانہ جنگیاں، عداوتیں اور بغض وعناد جو اس وقت قلوب میں قائم ہو جاتی ہے وہ اکثر ایسا صدقہ جاریہ ہوتا ہے جو قبروں میں ساتھ جاتا ہے۔

ایک مرتبہ کونسل کے الیکشن کے زمانہ میں ایک مقتدر باپ نے بیٹے کے شرمناک عیوب اخبارات واشتہارات میں شائع کرنے سے دریغ نہ کیا تھا۔ ہونہار فرزند کو بھی ہم اس میدان کارزار میں باپ سے کسی طرح کم نہ پاتے تھے بلکہ ہر گالی کا جواب اس سے زیادہ وزن کی گالی سے دیا جاتا تھا۔

خیر یہ تو حریت کا نتیجہ تھا جو یورپین تمدن کا لازمی اثر ہے اور جس کا خلاصہ نہ فقط مذہب سے آزادی بلکہ انسانیت کی ہر پابندی سے آزادی ہے۔

الغرض یہ سب اس جمہوریت اور کثرت رائے کے فیصلوں کی برکتیں ہیں جس کو آج سیاست کا اساسی قانون بنالیا گیا ہے۔

موجودہ اور مروّجہ جمہوریت کے فیصلوں پر اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو جمہوری حکومت کا خودسرا امیر یا روپیہ نکالتا ہے اور یا جبر واستبداد اور مکر وفریب کیونکہ جب کثرت رائے کا پردہ فاش ہوتا ہے تو اس کے پس پردہ یہی چیزیں کارفرما نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ الیکشن کے تمام انتخابات میں عموماً وہ خودغرض ہواپرست، نااہل لوگ، خلق اللہ کی جان ومال کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ جن کی نیّت اور ہمت ابتداء ہی سے اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ہمیں حکومت کی کرسی مل جائے۔ پھر مخلوق آرام سے رہے یا تباہ ہو۔ چنانچہ ان کی رائے زنی کا حاصل بھی اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ جس طرف زیادہ ہاتھ اٹھتے نظر آئے انہوں نے بھی اپنی جھنڈی اسی طرف کے لئے اٹھا دی۔ اکثر انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ کس معاملے کے متعلق ہم سے رائے لی گئی ہے۔

اور ان تمام فتنوں کے طوفان کی ذمہ داری صرف کثرت رائے کے فیصلوں پر ہے اگر اختلاف رائے کے وقت فیصلہ امیر مجلس کے سپرد ہو تو ان میں سے اکثر مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

الغرض جس طرح شخصیت محض بادشاہ پرستی کا نام ہے اور نظام عام کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ اسی طرح آجکل کی مصطلحہ جمہوریت اس کے بالکل خلاف ایک غوغاء ناس کا نام ہے جس کے مفاسد بھی شخصیت سے کم نہیں۔

اسلام جو نظام عالم کا حقیقی ذمہ دار ہے اس کا فرض تھا کہ اس افراط وتفریط کے درمیان ایسا راستہ اختیار کرے جو ہر قسم کے مفاسد اور خطرات سے پاک ہو۔

چنانچہ اسلامی حکومت کی بنیاد ایک ایسے قانون پر رکھی گئی جو بعض اعتبارات سے شخصیت سے ملتا ہے اور بعض وجوہ سے جمہوریت کا ہمرنگ ہے۔ یعنی

خذ ما صفا ودع ما كدر

جو بات اچھی ہو اس کو اختیار کرلو اور جو بری ہو چھوڑ دو۔

کے قانون پر عمل کرتے ہوئے شخصیت و جمہوریت دونوں کی وہ دفعات جو

مفاسد پر مشتمل ہیں اسلام نے ان سب کو نظر انداز کر دیا اور جن دفعات کے ماتحت نظام عالم درست ہو سکے۔ ان کو اختیار کر لیا۔ جس کی اجمالی صورت یہ ہے۔

❶ اسلامی خلافت میں وراثت نہیں چلتی۔ یہ ضروری نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا یا اسی کی نسل کا کوئی اور آدمی خلافت و امارت کا جاگیردار ہو۔ بلکہ بیعت عامہ یا مشورہ سے انتخاب ہو جائے اور یا سابق خلیفہ کسی شخص کو اپنی رائے سے مقرر کر دے (وہی اس عہدہ پر فائز ہوگا) (ازالۃ الخفاء)

لا خلافة الاعن مشورة (کنز العمال ج ۳ ص ۱۳۹)

کوئی خلافت بغیر مشورہ کے نہیں ہو سکتی۔

❷ مہم معاملات میں تنہا خلیفہ بغیر مشورہ کے طے نہیں کر سکتا۔ آیت کریمہ۔

وشاورهم في الأمر (آل عمران۔۱۵۹)

اور معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیجئے۔

میں خود حضرت اقدس ﷺ کو مشورہ کا حکم فرما کر امت کے لئے اسوہ بنا دیا گیا ہے۔

❸ اگر خلیفہ کوئی خلاف شرع فعل اختیار کرے تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو حق ہے کہ امر بالمعروف کے قواعد و آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ناصحانہ طور پر کلمہ حق اس کے سامنے پیش کر دے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ازلۃ الخفاء میں اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

”واز اعظم انواع جہاد است امر کردن خلیفہ بمعروف و نہی او از منکر بغیر خروج بسیف و می باید کہ بلطف باشند دون الغف و در خلوت باشد دون الجلوۃ تا فتنہ برنخیزد۔“

❹ خلفاء راشدین اور صحابہ کے بہت سے واقعات اس کے شاہد عدل ہیں۔

خلیفۂ وقت اگر کسی کو صریح خلاف شرع کام کرنے کا حکم دے تو اس کام میں خلیفہ کا اتباع واجب نہیں۔ حدیث میں اسی دفعہ کے متعلق ارشاد ہے۔

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

۵ بادشاہ اگر اسلام کو ترک کر کے مرتد ہو جائے تو وہ امارت سے معزول ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں پر اس سے جہاد کرنا فرض ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی امیر عام طور پر بے دریغ قتل و غارت اور عورتوں کی عفت دری اور غصب مال کرنے لگے اور شریعت کے قانون کا کوئی لحاظ نہ رکھے تب بھی جائز ہے کہ مسلمان اس کے خلاف جمع ہو کر اسے معزول کر دیں۔ کیونکہ اس کا حکم ڈاکوؤں کا سا حکم ہے (ازالۃ الخفاء ص ۷) لیکن جب تک یہ نوبت نہ آئے بلکہ شخصی طور پر کسی کسی پر ظلم کرے اس وقت تک اس کی بغاوت ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ اس کی اطاعت پر صبر کرنا فرض ہے جس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

یہ چند اصول دفعات ہیں جو جمہوریت سے ملتی جلتی ہیں شخصی سلطنت میں یہ صورتیں موجود نہیں ہوتیں۔ اور دفعات ذیل شخصیت کی ہمرنگ ہیں۔

۶ مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرت رائے کے سپرد نہیں۔ بلکہ امیر کے رائے پر ہے اور اس کو اختیار ہے کہ اقلیت کو اکثریت پر ترجیح دیدے۔ قرآن عزیز میں آنحضرت ﷺ کو مشورہ کا حکم فرمانے کے بعد **فاذا عزمت فتوكل على الله** (پھر جب آپ عزم کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کریں) بصیغہ واحد حاضر فرما کر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد کسی جانب کو ترجیح دے کر اس کا عزم کرنا یہ فقط آپ کی رائے پر ہوگا، آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین اور دوسرے خلفاء کے بہت سے معاملات اس کے شاہد ہیں جن کو انشاءاللہ تعالیٰ بتفصیل عرض کیا جائے گا۔

۷ امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے ذمہ سرّاً وعلانیۃً فرض ہے جب تک کہ وہ کسی صریح حرام کا حکم نہ کرے۔ قرآن عزیز میں اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (النسآ۔۵۹)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو۔

❽ امیر اگر کوئی ظالمانہ حکم نافذ کرے تب بھی رعایا کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ ان کو اس وقت صرف اتنا حق ہے کہ امر بالمعروف کے ذریعہ حق بات اس کے سامنے پیش کردیں اور بس۔ لیکن اگر امر بالمعروف کے بعد بھی امیر اپنے اس حکم پر قائم رہے تو رعایا کا فرض ہے کہ صبر کے ساتھ اس کی اطاعت کرے۔ اس کی سرکشی اور بغاوت کے لئے آمادہ ہونا اس وقت بھی جائز نہیں۔ حدیث میں اس دفعہ کے متعلق بکثرت تصریحات موجود ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ چند گاؤں والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض صدقات [1]، زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ظلم کرتے ہیں (یعنی مقدار واجب سے زیادہ ہم سے وصول کرتے ہیں) آپ نے ارشاد فرمایا۔

ارضوا مصدّقیکم (ابوداؤد)

اپنے عاملِ صدقہ کو راضی کرو۔

انہوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ ہم پر ظلم کریں تب بھی ہم ان کو راضی کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ارضوا مصدقیکم و ان ظُلمتم رواہ ابوداؤد (از مشکوٰۃ)

اپنے عاملین صدقہ کو راضی کرو اگرچہ تم پر ظلم کیا جائے۔

[1] اموال ظاہرہ یعنی مال تجارت اور جانوروں کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے خلیفۂ وقت کیطرف سے کچھ لوگ ملازم ہوتے تھے جو تمام صدقات وصول کر کے خلیفہ کے پاس جمع کرتے تھے اور پھر خلیفہ ان کو مصرف زکوٰۃ میں اپنے انتظام سے خرچ کرتا تھا ان لوگوں کو عامل صدقاء کہا جاتا تھا جو امیر وقت کے نائب ہو کر صاحب نصاب لوگوں کے پاس جاتے تھے۔

یہ عاملین صدقہ چونکہ خلیفہ اور امیر وقت کے نائب ہو کر ان لوگوں کے پاس جاتے تھے اس لئے ان کو مجبور کیا گیا ہے کہ ہر حال میں ان کی اطاعت کریں۔ وہ ظلم کریں تب بھی ان کے ذمہ ان کی اطاعت ضروری ہے۔

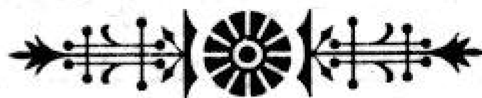
اسی کے متعلق ایک دوسری حدیث میں حضرت جابر ابن عتیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سیاتیکم رکیب مبغوضون فاذا جاؤکم فرجوا بھم وخلّوا بینھم وبین مایبتغون فان عدلوا فلانفسھم وان ظلموا فعلیھم وارضوھم فان تمام زکوتکم رضاھم ولیدعوالکم۔

(رواہ ابوداؤد) (ازمشکوۃ)

قریب ہے کہ تمہارے پاس چند مبغوض لوگ آئیں گے پس جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ فراخدلی سے پیش آؤ اور جو کچھ وہ طلب کریں ان کو دیدو۔ اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور اگر انہوں نے ظلم کیا تو اس کا ضرر بھی بھگتیں گے تم ان کو راضی کرو اس لئے تمہاری زکوٰۃ کا اتمام ان کی رضا پر موقوف ہے (اور تم ان کے ساتھ اس طرح پیش آؤ) کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔

ان احادیث سے بصراحت معلوم ہوا کہ امیر وقت اگر ظلم بھی کرے تب بھی رعیت کے لئے اطاعت کے سوا کسی حربہ کا استعمال جائز نہیں۔ جب تک کہ اس کا ظلم وجور اور بددیانتی عام خلق اللہ کو محیط ہو کر اس درجہ کو نہ پہنچ جائے کہ اس کو ڈاکوؤں کی فہرست میں داخل سمجھا جائے۔



اخلاقِ نبوی ﷺ کے چند نمونے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

حضور نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ حلیم، بردبار اور سب سے زیادہ شجاع تھے۔ سب سے زیادہ انصاف کرنے والے اور سب سے زیادہ معافی دینے والے تھے، آپ ﷺ سب سے زیادہ عفیف تھے، ساری عمر آپ ﷺ کا متبرک ہاتھ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، جب تک کہ آپ ﷺ اس کے مالک نہ ہوئے ہوں یا اس سے نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپ کی محرم نہ ہو۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے، کبھی کوئی درہم و دینار آپ ﷺ کے پاس ایک رات نہ گزارتا تھا۔ تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ بچ جاتا اور اس وقت کوئی محتاج نہ ملتا تو رات آتے ہی تلاش کر کے کسی محتاج کو دے کر بے فکر ہو جاتے تھے، جو کچھ مال آپ ﷺ کے پاس آتا تھا آپ ﷺ اس میں صرف سال بھر کے خرچ کی مقدار اپنے لئے رکھتے اور باقی کو تقسیم فرمادیتے تھے اور وہ بھی محض معمولی ادنیٰ درجہ کی چیزوں میں سے جیسے کھجوریں اور جو وغیرہ اور پھر اس میں بھی آپ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو کبھی رد نہ فرماتے تھے اور اس سال بھر کے خرچ میں سے بھی ایثار فرما کر لوگوں کو دیتے تھے۔ اسی وجہ سے سال تمام ہونے سے پہلے ہی آپ ﷺ کا سامان ختم ہو جاتا تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ اپنا جوتہ خود گانٹ لیتے اور کپڑے میں پیوند لگا لیتے تھے اور اپنے اہل و عیال کے کاروبار اور خدمت کرے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر گوشت کاٹتے تھے۔

حضور نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ حیادار تھے۔ کسی کے چہرے پر (بوجہ شدۃ حیا) آپ ﷺ کی نظر مبارک نہ جمتی تھی۔ آزاد اور غلام سب کی دعوت قبول فرمالیتے تھے اور ہدیہ کو قبول فرماتے، اگرچہ وہ دودھ کا ایک گھونٹ یا خرگوش کی ایک ران ہو۔ اور پھر ہدیہ کا بدلہ دیتے تھے اور ہدیہ کی چیز کو تناول فرماتے اور صدقہ کا مال نہ کھاتے تھے۔ معمولی کنیز اور مسکین آدمیوں کی دعوت سے انکار نہ فرماتے تھے۔ خدا کے لئے یعنی حدود اللہ اور شریعت کے خلاف کرنے پر ناراض ہوتے اور اپنے نفس کے لئے غصہ نہ فرماتے تھے، حق ہو لتے تھے، اگرچہ اس کا نقصان آپ ﷺ ہی کی ذات اقدس پر عائد ہوتا تھا۔

آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ مشرکین کے مقابلہ میں دوسرے مشرکین سے مدد لیجئے تو انکار فرمادیا اور ارشاد فرمایا کہ ہم مشرکین سے مدد نہیں لیتے، حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ آپ ﷺ کے ساتھی بہت کم تھے۔

آپ ﷺ کے صحابۂ کرام میں ایک نہایت بزرگ صحابی کی لاش یہود کے محلّہ سے برآمد ہوئی۔ مگر آپ ﷺ نے ان سے کوئی زیادتی نہیں فرمائی۔ بلکہ قاعدہ شرعیہ کے موافق صرف سو اونٹ سے ان کی دیت دلوادی اور بس۔ حالانکہ اس وقت صحابۂ کرام کو ایک ایک اونٹ کی شدید ضرورت تھی اور یہودی مالدار تھے۔ ان سے جس قدر بھی حکم کیا جاتا خوشی سے برداشت کر لیتے۔

بعض اوقات حضور نبی کریم ﷺ بھوک کی وجہ سے آپنے شکم مبارک پر پتھر باندھ لیتے تھے اور جب کچھ ملتا تو جو کچھ مل جاتا خوشی سے کھالیتے اور کسی حلال کھانے سے احتراز نہ فرماتے تھے۔ اگر فقط چھوہرے مل جاتے تو انہیں پر اکتفا فرماتے اور اگر گوشت بھنا ہوا مل جاتا یا روٹی گیہوں یا جو کی مل جاتی یا کوئی شیریں یا شہد مل جاتا تو تناول فرماتے۔ اور اگر کبھی روٹی نہ ہوتی اور صرف دودھ مل جاتا تو اسی پر اکتفا فرماتے اور اگر خربوزہ یا کھجوریں مل جاتیں تو وہی تناول فرمالیتے تھے۔

حضور نبی کریم ﷺ تکیہ لگا کر یا میز یا چوکی وغیرہ پر کھانا رکھ کر کبھی نہ کھاتے تھے۔ آپ ﷺ کا رومال (ہاتھ پونچھنے کے لئے) یا پاؤں کا تلوہ تھا۔ (یعنی بوجہ بے تکلفی کے اس کا اہتمام نہ تھا کہ کوئی تولیہ یا رومال ہی رکھا جائے بلکہ ہاتھ دھونے کے بعد ہاتھوں یا پاؤں سے مل کر خشک فرمالیا جاتا)

آپ ﷺ نے گیہوں کی روٹی تین دن متواتر پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھائی اور آپ ﷺ کا یہ طرز عمل فقر واحتیاج یا بخل کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اپنے اوپر دوسرے فقراء ومساکین کو ترجیح دیتے اور ایثار کرتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ ولیمہ کی دعوت قبول فرماتے اور مریضوں کی مزاج پرسی کرتے اور جانبازوں میں شریک ہوتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے جتھہ میں تنہا بلا کسی پاسبان (ساتھی) کے چلتے پھرتے تھے۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ تواضع اور عاجزی کرنے والے اور سب سے زیادہ خاموش رہنے والے تھے۔ مگر یہ خاموشی تکبر کی وجہ سے نہیں تھی۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے۔ مگر کلام زیادہ طویل نہ فرماتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

آپ ﷺ ظاہری شکل وصورت میں بھی سب سے زیادہ حسین و خوبصورت تھے۔ دنیا کی کسی خوفناک چیز سے نہ ڈرتے تھے۔

(مسند احمد عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

جو کچھ مل جاتا پہن لیتے۔ کبھی سادہ چادر اور کبھی یمن کی منقش چادر اور کبھی ادنی جبہ غرض حلال مال سے جو کچھ مل جاتا زیب تن فرمالیا جاتا تھا۔

(بخاری عن سہل بن سعد رحمہ اللہ تعالیٰ)

آپ ﷺ کی انگشتری چاندی کی تھی جس کو اکثر اپنے داہنے ہاتھ کی اور کبھی بائیں ہاتھ کی کس انگلی میں پہنتے تھے۔ (مسلم بروایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

آپ ﷺ اپنے ساتھ کبھی اپنے غلام کو اور کبھی کسی دوسرے کو سواری پر ردیف بنا کر سوار فرمالیتے تھے اور امراء وسلاطین کی طرح اس سے عار نہ تھا۔ (بخاری ومسلم)

سواری کے متعلق کوئی تکلف نہ تھا۔ کبھی گھوڑے پر، کبھی اونٹ پر، کبھی خچر پر اور کبھی حمار پر۔ جیسا موقع ہوتا سوار ہو جاتے تھے اور بعض اوقات پیادہ ننگے پاؤں بغیر عمامہ اور ٹوپی کے چلتے پھرتے تھے اور مدینہ کے دور محلوں میں جا کر مریضوں کی عیادت یعنی مزاج پرسی فرماتے تھے۔

(بخاری و مسلم بروایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ و جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو پسند فرماتے تھے اور بدبو سے نفرت رکھتے تھے۔

(نسائی بروایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

فقراء و مساکین کے ساتھ مجالس (ہم نشینی) کی عادت تھی۔ مساکین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔ اہل فضل و کمال کا احترام و اکرام ان کے اخلاق کی وجہ سے فرماتے تھے اور ہر قوم کے شریف لوگوں کو احسان و اکرام کے ساتھ مانوس کیا جاتا تھا۔ (شمائل ترمذی)

اپنے عزیز و اقربا کے حقوق صلہ ادا فرماتے۔ مگر جو لوگ ان سے افضل ہوں ان پر اقرباء کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (حاکم فی مستدرک عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کسی کے ساتھ بدمزاجی اور درشتی کا معاملہ نہ فرماتے۔

حدودِ شرعیہ کے خلاف کرنے کی صورت میں کسی پر غصہ کرنا یا سزا دینا بدمزاجی میں داخل نہیں بلکہ درستیٔ اخلاق کا سب سے اہم ذریعہ ہے، جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معذرت پیش کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا عذر قبول فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح (ہنسی خوش طبعی) کی باتیں بھی کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی خلاف واقعہ بات زبان مبارک سے نہ نکلتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے تھے مگر قہقہہ نہ لگاتے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا محض تبسم ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مباح (جائز) کھیل کو دیکھتے تو منع نہ فرماتے تھے۔ (بخاری و مسلم عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

مباح کھیل وہ ہیں جو بدن کی چستی و مضبوطی کے لئے یا جہاد کی تیاری کے

لئے یا طبیعت کی تھکان دور کرنے کے لئے کھیلے جائیں اور ان میں کوئی ناجائز چیز مثل قمار (ہار جیت) یا مشابہت کفار یا سر کھلنا وغیرہ نہ ہوں۔ حدیث میں نشانہ سیکھنے اور تیرنے، کشتی لڑنے اور گتگا وغیرہ کھیلنے کو پسند کیا گیا ہے اور فقہاء نے گیند وغیرہ کے کھیل کو بھی اس میں داخل قرار دیا ہے۔ (شامی عالمگیری) مگر شرط یہ ہے کہ گتگا کا کھیل تعزیہ داری میں اور کشتی کا کھیل گھٹنے کھول کر اور گیند کا کھیل کفار و فساق کے مخصوص طریقہ پر نہ ہو۔ ورنہ ان چیزوں کی شمولیت سے یہ کھیل بھی ممنوع ہو جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لوگوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر فرماتے تھے۔ (بخاری عن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کمال اخلاق تھا کہ اس پر صبر فرمایا۔ مگر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لئے ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ اسی لئے اس کی ممانعت قرآن کریم میں نازل ہوئی: "یا ایها الذین آمنوا لاتقد موا بین یدی الله ورسوله"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چند اونٹنیاں اور بکریاں تھیں جن کے دودھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کا گزارہ تھا۔

(طبقات ابن سعد عن ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند غلام اور باندیاں تھیں جن کو کھانے پہننے میں اپنے سے کم نہ رکھتے تھے۔ (بلکہ ہر چیز میں ان کو برابر رکھا جاتا تھا۔) بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور حدیث میں ہے کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ لیکن یہ سب تواضع اور حسن اخلاق کی تعلیم بدرجہ مستحب ہے اور ایسا کرنا واجب نہیں۔ بشرطیکہ ان کو کھانے، پہننے کی تکلیف نہ ہو۔

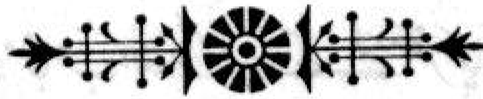
کیونکہ ضرورت کے موافق کھانا کپڑا وغیرہ دینا ان کو واجب ہے اور اس کے خلاف کرنے والا گنہگار ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ معاملہ ان غلاموں کے ساتھ ہے جو آپ ﷺ کی مِلک تھے اور جب پر ہر طرح آپ ﷺ کو اختیار حاصل تھا۔ افسوس ہے کہ آج کل مسلمان اپنے ملازم اور نوکروں کے ساتھ بھی وہ معاملہ نہیں کرتے۔ باورچی سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کرائے جاتے ہیں۔ لیکن اس بے چارے کا حصہ اس میں بجز آگ اور دھویں کے کچھ نہیں ہوتا۔ تیار ہونے کے بعد اس کی خوشبو بھی اس کے پاس نہیں جاتی۔ اخلاق کی بات یہ ہے کہ تھوڑا بہت ہر کھانے میں سے اس کو بھی دیا جائے جو کام کسی نوکر کے سپرد کیا جائے اس میں اس کی راحت و طاقت کا خیال رکھ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا کوئی وقت بے کاری میں نہ گزرتا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے اور دین کے کام میں یا اپنی دنیوی ضرورتوں میں۔ (شمائل ترمذی عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

کبھی کبھی آپ ﷺ اپنے اصحاب کے باغات میں تشریف لے جاتے تھے۔ آپ ﷺ نہ کسی مسکین یا اپاہج کو اس کے فقر و محتاجی کی وجہ سے حقیر سمجھتے تھے اور نہ بادشاہ و امیر سے اس کی دولت و سلطنت کے سبب مرعوب ہوتے تھے۔ بلکہ دونوں کو یکساں طریق پر حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے تھے۔ حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ میں اخلاق فاضلہ اور سیاست کاملہ جامع فرما دی تھی۔ حالانکہ آپ ﷺ امی (ان پڑھ) تھے اور لکھنا بھی نہ جانتے تھے۔ آپ ﷺ اسی شہر میں پیدا ہوئے جہاں کوئی علم کی جگہ (مدرسہ و یونیورسٹی) نہ تھی۔ بلکہ جہالت عام تھی۔ پھر آپ ﷺ کا نشو و نما فقر و فاقہ اور بکریاں چرانے میں ہوا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ آپ ﷺ بے ماں اور بے باپ کے یتیم بچے تھے۔ مگر حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو محاسن اخلاق اور خصائل حمیدہ کی تعلیم دی اور اولین و آخرین کے علوم عطا فرمائے اور ان چیزوں کی تعلیم دی جن سے آخرت میں نجات اور

فلاح نصیب ہو اور دنیا میں پریشانیوں سے خلاصی اور لوگوں کے لئے غبطہ (رشک) کا سبب ہو اور آپ ﷺ کو مفید وضروری کاموں میں مشغولی اور بے فائدہ فضول کاموں سے اجتناب عطا فرمایا۔

حق تعالیٰ ہم سب کو آپ ﷺ کی اطاعت اور آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے اخلاق وعادات کی اتباع نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!



مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ

فضائل بیت اللہ مع تاریخ تعمیر

ساری دنیا کے مکانات یہاں تک کہ تمام مساجد کے مقابلہ میں بیت اللہ یعنی کعبہ کا شرف اور افضلیت کا بیان ہے اور یہ شرف وفضیلت کئی وجہ سے ہے۔ اول اس لئے کہ وہ دنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ برکت والا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ پورے جہان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے۔ اس کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ دنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہو۔ اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو، نہ دولت خانہ۔ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ان کی شان سے کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مجاہد، قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ، سدی رحمہ اللہ تعالیٰ، وغیرہ صحابہ وتابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں۔ مگر عبادت کے لئے یہ پہلا گھر بنا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی منقول ہے:

بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین کے ذریعہ ان کو یہ حکم

بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں۔ ان حضرات نے حکم کی تعمیل کر لی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں اور ان سے کہا گیا کہ آپ اول الناس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں۔ اور یہ اول بیت وضع للناس ہے۔ یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا۔ (ابن کثیر)

بعض روایت میں ہے کہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی۔ طوفان نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام میں منہدم ہوئی اور اس کے نشانات مٹ گئے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ پھر ایک مرتبہ کسی حادثہ میں اس کی تعمیر منہدم ہوئی تو قبیلۂ جرہم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی۔ پھر ایک مرتبہ منہدم ہوئی تو عمالقہ نے تعمیر کی اور پھر منہدم ہوئی تو قریش نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں تعمیر کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا۔ لیکن قریش نے اس تعمیر میں بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی کہ ایک حصہ بیت اللہ کا بیت اللہ سے الگ کر دیا جس کو حطیم کہا جاتا ہے اور خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بناء میں کعبہ کے دو دروازے تھے۔ ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا پشت کی جانب سے باہر نکلنے کے لئے۔ قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا۔ تیسرا تغیر یہ کیا کہ دروازہ بیت اللہ کا سطح زمین سے کافی بلند کر دیا۔ تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جا سکے۔ بلکہ جس وہ اجازت دیں وہی جا سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اس کو بالکل بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دوں۔ قریش نے جو تصرفات بناء ابراہیمی کے خلاف کئے ہیں ان کی اصلاح کئے ہیں ان کی اصلاح کر دوں۔ لیکن جو مسلم ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ اسی لئے سر دست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں۔ اس ارشاد کے بعد اس دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات زندہ نہیں رہی۔

لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنے ہوئے تھے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد جس وقت مکہ مکرمہ پر ان کی حکومت ہوئی تو انہوں نے بیت اللہ کو منہدم کر کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دیا۔ مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت مکہ معظّمہ پر چندروزہ تھی۔ ظالم الامۃ حجاج بن یوسف نے جمکہ پر فوج کشی کر کے ان کو شہید کیا اور حکومت پر قبضہ کر کے اس کو گوارا نہ کیا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل غلط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جس حالت پر چھوڑا تھا ہمیں اسی حالت پر اس کو رکھنا چاہئے۔ اس بہانے سے بیت اللہ کو پھر منہدم کر کے اسی طرح کی تعمیر بنادی جو زمانہ جاہلیت میں قریش نے بنائی تھی۔ حجاج بن یوسف کے بعد آنے والے بعض مسلم بادشاہوں نے پھر حدیث مذکور کی بناء پر یہ ارادہ کیا کہ بیت اللہ کو از سر نو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بنا دیں۔ لیکن اس زمانہ کے امام حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب بار بار بیت اللہ کو منہدم کرنا اور بنانا آگے آنے والے بادشاہوں کے لئے بیت اللہ کو ایک کھلونا بنادے گا۔ ہر آنے والا بادشاہ اپنی نام آوری کے لئے یہی کا کرے گا۔ اس لئے اب جس حالت میں بھی ہے اس حالت میں چھوڑ دینا مناسب ہے۔ تمام امّت نے اس کو قبول کیا۔ اسی وجہ سے آج تک وہی حجاج بن یوسف ہی کی تعمیر باقی ہے۔ البتہ شکست وریخت اور مرمت کا سلسلہ جاری رہا۔

بیت اللہ کا بابرکت ہونا ظاہری طور پر بھی ہے، معنوی طور پر بھی۔ اس کے ظاہری برکات میں یہ مشاہدہ ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس ایک خشک ریگستان اور بنجر زمین ہونے کے باوجود اس میں ہمیشہ ہر موسم میں ہر طرح کے پھل اور ترکاریاں اور تمام ضروریات مہیا رہتی ہیں کہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں۔ بلکہ اطراف عالم سے آنے والوں کے لئے بھی کافی ہوجاتی ہیں اور آنے والوں کا حال دنیا کو معلوم

ہے کہ خالص موسم حج میں تو لاکھوں انسان اطراف عالم سے جمع ہوتے ہیں جن کی مردم شماری اہل مکہ سے چوگنی یا پانچ گنی ہوتی ہے۔ یہ ہجوم عظیم وہاں صرف دو چار روز نہیں، بلکہ مہینوں رہتا ہے۔ موسم حج کے علاوہ بھی کوئی وقت ایسا نہیں آتا جس میں باہر سے ہزاروں انسانوں کی آمد و رفت نہ رہتی ہو۔ پھر خالص موسم حج میں جبکہ وہاں لاکھوں انسانوں کا زائد مجمع ہوتا ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ بازار میں کسی وقت بھی ضروریات ختم ہوگئیں، ملتی نہیں، یہاں تک کہ قربانی کے بکرے جو وہاں پہنچ کر ایک ایک انسان سو سو بھی کرتا ہے اور اوسط فی کس ایک کا تو یقینی ہے۔ یہ لاکھوں بکرے وہاں ہمیشہ ملتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دوسرے ملک سے منگانے کا اہتمام کیا جاتا ہو۔

یہ تو ظاہری برکات کا حال ہے جو مقصود کی حیثیت نہیں رکھتیں اور معنوی و باطنی برکات تو اتنی ہیں کہ اس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ بعض اہم اہم عبادات تو بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان میں جو اجرِ عظیم اور برکات روحانی ہیں ان سب کا مدار بیت اللہ پر ہے۔ مثلاً حج و عمرہ اور بعض دوسری عبادات کا بھی مسجد حرام میں ثواب بدر جہا بڑھ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی انسان گھر میں نماز پڑھے اس کو ایک نماز کا ثواب ملے گا اور اگر اپنے محلّہ کی مسجد میں ادا کرے اس کو پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا اور جو جامع مسجد میں ادا کرے تو پانچ سو نمازوں کا ثواب پائے گا اور اگر مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرے تو ایک ہزار نمازوں کا اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا (یہ روایت ابن ماجہ وطحاوی وغیرہ نے نقل کی ہے) حج کے فضائل میں یہ حدیث عام مسلمان جانتے ہیں کہ حج کو صحیح طور پر ادا کرنے والا مسلمان پچھلے گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پاک وصاف پیدا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب بیت اللہ کی معنوی اور روحانی برکات ہیں۔ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ منجملہ ان کے مقام ابراہیم ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہوجائے

وہ امن والا اور محفوظ ہو جاتا ہے۔کوئی اس کو قتل نہیں کرسکتا۔تیسرے یہ کہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر اس بیت اللہ کا حج فرض ہے۔بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت اور قدرت رکھتا ہو۔

مقام ابراہیم

ان نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی مقام ابرہیم ہے۔اسی لئے قرآن کریم نے اس کو مستقل طور پر علیحدہ بیان فرمایا ہے۔مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام بیت اللہ کی تعمیر فرماتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہو جاتا تھا اور نیچے اترنے کے وقت نیچا ہو جاتا تھا۔اس پتھر کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے قدم مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے۔ظاہر ہے کہ ایک بے حس و بے شعور پتھر میں یہ ادراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہو جائے اور یہ تأثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قدمین کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے۔یہ سب آیات قدرت ہیں جو بیت اللہ کی اعلیٰ فضیلت ہی سے متعلق ہیں۔یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا۔جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو:"واتخذوا من مقام ابراهيم مصلےٰ"اسوقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر مطاف سے باہر بیر زمزم کے قریب رکھ دیا گیا اور آج کل اس کو اسی جگہ ایک محفوظ مکان میں مقفل کیا ہوا ہے۔طواف کے بعد کی دو رکعتیں اسی مکان کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں۔حال میں یہ ترمیم ہوئی کہ وہ مکان تو ہٹا دیا گیا اور مقام ابراہیم کو ایک بلوری خول کے اندار محفوظ کر دیا گیا۔مقام ابراہیم اصل میں اس خاص پتھر کا نام ہے اور طواف کے بعد کی رکعتیں اس کے اوپر یا اس کے پاس پڑھنا افضل ہے۔لیکن مقام ابراہیم کے لفظی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ تمام مسجد حرام کو حاوی ہے۔اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس

جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے، واجب ادا ہو جائے گا۔

داخلِ بیت اللہ کا مامون ہونا

بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے گا وہ امن والا یعنی مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا ایک تو تشریعی اعتبار سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ حکم ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے اس کو نہ ستاؤ، نہ قتل کرو۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے اس کو بھی اس جگہ سزا نہ دی جائے۔ بلکہ اس کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکلے۔ حرم سے باہر آنے پر سزا دی جائے گی۔ اس طرح حرم میں داخل ہونے والا شرعی طور پر مامون و محفوظ ہو گیا۔

دوسرے حرم میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا یوں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر ہر قوم و ملت کے دلوں میں بیت اللہ کی تعظیم و تکریم ڈال دی ہے اور وہ سب عموماً ہزاروں اختلافات کے باوجود اس عقیدے پر متفق ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا اگر نہ مجرم یا ہمارا دشمن ہی ہو تو حرم کا احترام اس کا مقتضی ہے کہ وہاں اس کو کچھ نہ کہیں۔ حرم کو عام لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رکھا جائے۔ زمانہ جاہلیت کے عرب اور ان کی جنگ جوئی اور تند خوئی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن حرم کے احترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اپنی آنکھیں نیچی کر کے گزر جاتا تھا۔ اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

فتح مکہ میں صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے دین کی اہم مصلحت اور بیت اللہ کی تطہیر کی خاطر صرف چند گھنٹوں کے لئے حرم میں قتال کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور فتح کے بعد آپ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ اس کا

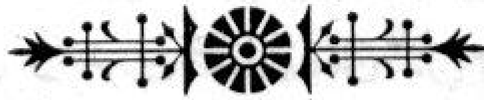
اعلان واظہار فرمایا کہ یہ اجازت صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے تطہیر بیت اللہ کی غرض سے تھی اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے تھی۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے پھر اس کی وہی مرتبہ ثبت ہے جو پہلے سے تھے اور فرمایا کہ حرم کے اندر قتل وقتال نہ مجھ سے پہلے تھا نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے اور میرے لئے بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے حلال ہوا تھا پھر حرام کر دیا گیا۔

رہا یہ معاملہ کہ رسول ﷺ کے بعد حجاج بن یوسف نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف مکہ میں فوج کشی کی اور قتل وغارت کیا۔ یہ اس امن عام کے تشریعی طور پر اس لئے خلاف نہیں کہ باجماع امت اس کا یہ فعل حرام اور سخت گناہ تھا۔ تمام امت نے اس پر نفرین کی اور تکوینی طور پر بھی اس کو احترام بیت اللہ کے منافی اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ حجاج خود بھی اپنے اس عمل کے حلال ہونے کا معتقد نہ تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک سنگین جرم کر رہا ہوں۔ لیکن سیاست وحکومت کی مصالح نے اس کو اندھا کیا ہوا تھا۔

حج بیت اللہ کا فرض ہونا

آیت میں بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم وواجب قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت واستطاعت رکھتے ہوں۔ اس مقدرت واستطاعت کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پاس ضروریات اصلیہ سے فاضل اتنا مال ہو جس سے وہ بیت اللہ تک آنے جانے اور وہاں کے قیام کا خرچ برداشت کر سکے اور اپنی واپسی تک ان اہل وعیال کا بھی انتظام کر سکے جن کا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے۔ نیز ہاتھ پاؤں اور آنکھون سے معذور نہ ہو۔ کیونکہ ایسے معذور کو تو اپنے وطن میں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے۔ وہاں جانے اور ارکان حج ادا کرنے پر کیسے قدرت ہوگی؟ اسی طرح عورت کے لئے چونکہ بغیر محرم کے سفر

کرنا شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے وہ حج پر قادر اس وقت سمجھی جائے گی جبکہ اس کے ساتھ کوئی محرم حج کرنے والا ہو۔ خواہ محرم اپنے خرچ سے حج کر رہا ہو یا یہ عورت اس کا خرچ بھی برداشت کرے۔ اسی طرح وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ کا مامون ہونا بھی استطاعت کا ایک جز ہے۔ اگر راستہ میں بدامنی ہو، جان مال کا قوی خطرہ ہو تو حج کی استطاعت نہیں سمجھی جائے گی۔



شبِ قدر

حضرت کی آخری نشری تقریر

''حضرت'' کی وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل ریڈیو پاکستان سے فرمائش کی گئی کہ شب قدر کے بارے میں ایک تقریر ریڈیو سے نشر فرمائیں۔ احقر نے ریڈیو کے حضرات سے عذر کیا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ علیل ہیں اور تقریر میں بار ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے براہ راست اصرار کیا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور خود اپنے دستِ مبارک سے بستر علالت پر ہی یہ تقریر لکھی اور بستر ہی سے ریکارڈ کرائی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی نہ صرف آخری نشری تقریر ہے، بلکہ اس کے بعد کوئی مضمون آپ کے قلم سے نہیں نکلا۔ اس تقریر کے ریڈیو سے نشر ہونے کے کل تیرہ دن بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ (محمد تقی عثمانی)

اللہ جل جلالہٗ نے حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آخری امت کو بڑی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ دوسری ساری امتوں کے مقابلہ میں اس امت کو کچھ خصوصی امتیازات عطا فرمائے ہیں۔

انہیں امتیازی فضائل میں سے شب قدر بھی ہے جو سال بھر میں ایک مرتبہ آتی ہے اور صرف اس رات کو عبادات میں مشغول کر دینے والوں کو ایک ہزار مہینے کی خالص عبادت سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے لیلۃ القدر خیر من الف شھر (یعنی ایک شب قدر بہتر ہے ایک ہزار مہینے سے) قرآن کریم

نے اس رات کی عبادت کو ایک ہزار مہینے کی عبادت کے برابر نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بہتر فرمایا ہے اور اس میں زیادت کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کتنا زیادہ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ وہ اسکو ایک ہزار سال کے برابر بنا دیں۔

امت مرحومہ پر اس خاص امتیازی انعام کی ایک وجہ حدیث شریف میں آئی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو پچھلی امتوں کی کچھ طویل طویل عمریں بطور وحی دکھلائی گئیں (جو تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال کی ہوتی تھیں) اس کے بالمقابل یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کی امت کی عمریں ان کے مقابل بہت کم ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔ اس واقعہ نے آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک پر یہ اثر کیا کہ اس حساب سے تو میری امت اعمال صالح اور عبادات میں سب سے کم رہ جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک سے اس غم کو دور کرنے کے لئے **لیلۃ القدر** کی آیت نازل فرما کر بتلا دیا کہ آپ فکر نہ کریں۔ اس امت کے عمل کی قیمت بہت بڑھا دی گئی ہے کہ صرف ایک رات میں ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے زیادہ ثواب حاصل کر سکتے ہیں، تاکہ دوسری امتوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ حدیث موطا میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اور ترغیب ترہیب میں حافظ منذری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے۔

شب قدر کو شب قدر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی عمریں اور رزق اور بھلے بُرے مختلف قسم کے حالات جو روز اول سے لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس رات میں اس سال کا پورا بجٹ اور سب کی مقداریں فرشتوں کے حوالہ کر دی جاتی ہیں کہ کس کی کتنی عمر ہوگی، کتنا رزق ملے گا، وہ کیسے کیسے حالات سے گذرے گا۔ سورۂ دخان کی آیت میں حق تعالیٰ نے اس رات کو لیلہ مبارکہ کے نام سے ارشاد فرمایا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے **فیھا یفرق کل امر حکیم امر امن**

عندنا یعنی اس رات میں طے کر دیا جائیگا ہر کام حکمت والا ہماری طرف سے۔اس رات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نزول قرآن اس رات میں ہوا اور در منثور کی ایک روایت میں ہے کہ اسی رات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا۔ سنن بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ شب قدر میں جبریل امین فرشتوں کے ایک گروہ کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں۔اور جس شخص کو ذکر و عبادات میں مشغول دیکھتے ہیں اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **من قام لیلة القدر ایمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه** (یعنی جس شخص نے قیام کیا شب قدر میں ایمان کے ساتھ، خالص ثواب کی نیت سے کہ کوئی دنیوی غرض نہیں۔اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔) قیام کرنے سے مراد کسی عبادت میں لگنا ہے، جس میں نماز پڑھنا بھی داخل ہے اور ذکر و تلاوت وغیرہ بھی۔

گناہوں کی معافی کے متعلق شریعت کا اصلی ضابطہ یہ ہے کہ صغیرہ گناہ تو نفلی عبادات اور دوسری نیکیوں کے ذریعہ بھی خود بخود معاف ہو جاتے ہیں مگر کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صغیرہ کی معافی کی قید نہیں لگائی بلکہ عام رکھا ہے۔اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اول تو مؤمن سے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونا بہت بعید ہے اور اگر ہو بھی گیا تو مومن کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک توبہ نہ کرلے اور فرض کرو کہ پہلے غفلت ہی ہوتی رہی اب جبکہ شب قدر میں وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے اپنی مغفرت کی دعا اور دوسری مرادیں مانگ رہا ہے تو یقیناً اس کو اپنے پچھلے گناہوں پر ندامت و شرمندگی بھی ہوگی اور آئندہ ان سے بچتے رہنے کا پختہ ارادہ بھی کرے گا۔اسی کا نام توبہ ہے۔اس سے

معلوم ہوا کہ شب قدر کی عبادت کے لئے پچھلے گناہوں سے توبہ لازم وملزوم ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ آج شب قدر ہے تو میں کیا دعا مانگوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دعا کرو اللھم انك عفو تحب العفو فاعف عني۔ یعنی اے میرے معبود آپ بہت معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ میرے بھی گناہوں کو معاف فرما۔ اس حدیث میں شب قدر کی سب سے بڑی عبادت توبہ ہی کو قرار دیا ہے اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس مبارک رات میں اپنے سب پچھلے گناہوں سے توبہ کرے اور معافی مانگنے کا اہتمام کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شب قدر اس امت کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے امتیازی انعام ہے کہ ایک رات کی عبادت کا ثواب ایک ہزار مہینے کے برابر نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیا ہے۔ ایک ہزار مہینے کے تراسی برس چار ماہ ہوتے ہیں۔ پھر اس میں رحمت کے فرشتوں کا نزول اور عبادت گزار کے لئے رحمت کی دم بدم دعائیں بھی ہیں اور تمام گناہوں سے مغفرت کا وعدہ بھی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ منادی بھی ہوتی ہیں کہ ہم سے جو دعا مانگی جائے گی قبول کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر کی برکات سے محروم رہا وہ ہر بھلائی سے محروم رہا اور اس بھلائی سے صرف وہی شخص محروم ہوگا جو بڑا ہی بدنصیب ہو۔ یہ روایت ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ گیا کہ مبارک رات کون سی رات ہے۔ اس کے متعلق اتنی بات تو خود قرآن کریم نے متعین کر دی ہے کہ یہ رات ماہ رمضان کی کوئی رات ہوگی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس کی مزید توضیح تعیین بذریعہ وحی الٰہی اس طرح فرمائی ہے کہ مشکوٰۃ میں بحوالہ بخاری شریف حضرت صدیقہ

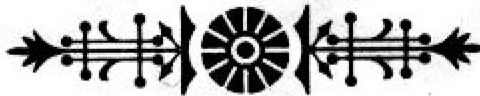
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ یعنی اکیس، تیئس، پچیس، ستائیس، انتیس ان راتوں میں سے کوئی رات شب قدر ہوگی۔ اور بعض راویات میں ستائیسویں شب کے متعلق مزید رجحان ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی احکام میں اکیسویں شب وہ کہلائے گی جو ۲۱ رتاریخ سے پہلے آئے۔ اسی طرح ۲۳، ۲۵ وغیرہ کو سمجھئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی حکمتوں کو پورا کون دریافت کرسکتا ہے۔ یہاں بالتصریح کسی ایک رات کو متعین کر کے نہ بتلانے اور عشرہ اخیرہ رمضان کی پانچ طاق راتوں میں دائر کردینے میں ایک حکمت یہ بھی کہ ہے انسان کے شوق عبادت اور فکر آخرت کی آزمائش ہو کہ شب قدر کی برکات حاصل کرنے کے لئے ان پانچوں راتوں میں بیدار رہ کر عبادت کی کوشش کرے۔ غور کیجئے کہ سرکاری اور نجی ملازمتوں میں کتنی ملازمتیں ایسی ہیں کہ ان میں ملازم کو پوری رات بیدار رہنا پڑتا ہے۔ ہوائی جہازوں کے پائلٹ، ریلوں کے چلانے والے، رات کی شفٹوں میں کام کرنے والے، ملوں اور کارخانوں کے مزدور فانی فوائد اور چند ٹکوں کی خاطر کتنی راتیں جاگ کر گزارتے ہیں۔ اگر اللہ کے نیک بندے سال بھر میں صرف پانچ راتیں اتنی بڑی نعمت کے لئے جاگیں کہ تراسی سال چار ماہ کی عبادت کا ثواب ملے گا، فرشتوں کی دعائیں ملیں گی، سب پچھلے گناہوں کی مغفرت حاصل ہوگی، دین و دنیا کی سب مرادیں حاصل ہوں گی تو کیا مشکل کام ہے۔ اور قربان جائیں حق تعالیٰ کے فضل و انعام کے کہ ان راتوں میں بھی تمام رات جاگنا شرط نہیں، کچھ سو بھی رہے تو اس مقصد میں خلل نہیں آتا۔

اور حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت تو یہ ہے کہ جو شخص اسی رات میں عشاء کی نماز جماعت سے پڑھے پھر صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لے وہ بھی لیلۃ القدر کی برکات سے محروم نہیں رہتا۔ پھر یہ رات غروب آفتاب کے بعد

سے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ بیمار یا بہت کمزور یا کم ہمت ہوں اور مغرب کے بعد سے ہی عبادت میں لگ جائیں۔ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھیں تو وہ بھی شب قدر کی خیر و برکت سے محروم نہیں ہوں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان راتوں میں جاگنے اور عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔

یہ بات سب مسلمانوں کو یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی خاص راتوں میں اپنے متعلقین کے لئے دعا تو سبھی کریں گے۔ ضرورت اس کی ہے کہ پورے ملک پاکستان بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کے لئے دعا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو تمام ظاہری اور باطنی فتنوں اور سب پریشانیوں سے محفوظ رکھیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین. (محمد شفیع ۶/رمضان ۱۳۹۶ھ)

(بحوالہ البلاغ مفتی اعظم طبع جدید ایڈیشن، ماہ جولائی ۲۰۰۵ء)



قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. متفق عليه

هداية الساري
إلى
دراسة البخاري

مقدمة شرح صحيح البخاري

الجزء الأول والثاني

للعلامة المحقق المحدث مولانا امداد الحق
السلهتي. البنغلاديشي

مَعارفِ شیخ الحدیث

شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قلم فیض سے علمی، اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی اور تاریخی مضامین و مقالات اور علوم و معارف اور ملفوظات و ارشادات نیز حالات و واقعات کا نادر و نایاب نہایت مفید و نافع مجموعہ۔

مُرتّبہ

حافظ قاری مُحمّد اکبر شاہ بخاری

زمزم پبلشرز

راویانِ حدیث کا تذکرہ

اور

اُن پر محدثین کا تبصرہ

اَھلِ مدارس سے درخواست

اس رسالہ کو حدیث کے شروع کروانے سے پہلے ضرور پڑھائیں جس سے اسماءِ رجال اور جرح وتعدیل سے مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

مولانا مفتی خالد حسین صاحب
استاذ حدیث مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ

تالیف

محمد حسین صدیقی
استاذ حدیث جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی

زمزم پبلشرز

خطبات الأحكام لجمعات العام

للشيخ العلامة قدوة الأنام المحدث الفقيه

أشرف علي التهانوي رحمه الله تعالى

١٢٨٠ هـ — ١٣٦٢ هـ

حققه وعلق عليه

محمد عثمان البستوي

أمين المكتبة بدار العلوم زكريا. أفريقية الجنوبية

أشرف على تحقيقه وساعده

رضاء الحق حفظه الله ورعاه

خادم الحديث النبوي ودار الإفتاء بدار العلوم زكريا

ناشر

زمزم پبلشرز

للطباعة والنشر والتوزيع

مَعارِفِ مُفتیِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرتِ اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے
علمی، فقہی، تبلیغی اور اصلاحی مواعظ و مقالات اور نادر ملفوظات وارشادات پر مشتمل
افادات کا حسین مجموعہ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کا نایاب و انمول خزانہ

افادات

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

مُرتّب

سید محمد اکبر شاہ بخاری

ناشِر

زمزم پبلشرز

نزد مُقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی